سفر نامہ

اجنبی اپنے دیس میں

سید شوکت علی شاہ



اجنبی اپنے دیس میں

سفرنامہ



سید شوکت علی شاہ

احمد ندیم قاسمی

دیباچہ

برسوں پہلے میں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "یہاں سفرنامے کیوں نہیں لکھے جاتے؟" پھر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اردو میں سفرناموں کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ اور سفرنامے بھی بیشتر اس معیار کے کہ کوئی بھی زبان ان پر رشک کر سکتی ہے۔ البتہ میرا یہ سوال برقرار رہا کہ ہم خود اپنے ملکی سفرنامے لکھنے سے کیوں ہچکچاتے ہیں' جبکہ محمد خالد اختر نے "سواتی مہم" اور "کاغانی مہم" کی صورت میں ملکی سفرناموں کا ایک خوبصورت معیار بھی معین کر رکھا ہے۔ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ خود ہمارے اہل ملک اپنے ملک کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں جبکہ اس ملک کے ننانوے فیصد اہل قلم آئے دن ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے رہتے ہیں۔ دور افتادہ مقامات پر جا نکلتے ہیں اور ایسے علاقوں میں سے گزرتے ہیں جن سے ہمارا پڑھا لکھا طبقہ کچھ زیادہ متعارف نہیں ہے۔ پھر وہ اپنے سفر کے تاثرات کو قلمبند کیوں نہیں کرتے؟ اور ہمارے ہاں یہ ذہنیت کیوں پرورش پا رہی ہے کہ صرف بیرونی ممالک کے سفر کی روئیداد ہی سفرنامہ کہلا سکتی ہے۔ یقیناً امریکی اور یورپی ممالک (اور اکا دکا ایشیائی ممالک) سے متعلق لکھے گئے سفرناموں کی بھی ایک اپنی اہمیت' افادیت اور رعنائی ہے اور انہی سفرناموں کی اہمیت واضح کرتا ہوں تو غیر ملکی سفرناموں کی نفی نہیں کرتا۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے اہل قلم ملکی سفروں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیں اور ایسے سفرنامے لکھیں جیسے امریکہ' جرمنی' انگلستان' چین اور جاپان وغیرہ کے بارے میں لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے مجھے معروف ناول نویس رحیم گل کے ایک نئے ناول "جنت کی تلاش" کا مسودہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو مجھے دوگنا مسرت ہوئی کہ یہ نہ صرف ناول کے فن کے لحاظ سے ایک عمدہ ناول تھا بلکہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے دور دراز گوشوں کے سفر کی روئیداد کو بھی اس ناول میں خوبصورتی سے سمویا اور سمیٹا گیا تھا اور اب محمد خالد اختر اور رحیم گل کے بعد مجھے سید شوکت علی شاہ کے سفرنامے "اجنبی اپنے دیس میں" کا مسودہ پڑھنے کو ملا ہے۔ تو مجھے اپنی انا کی صحیح یا غلط تسکین کا حق ملنا چاہیے کہ میں نے ملکی سفرنامے لکھنے کی جو اپیل برسوں پہلے کی تھی وہ صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔

سید شوکت علی شاہ ایک سرکاری افسر ہیں' وہ اپنی مرضی سے بلوچستان نہیں گئے تھے بلکہ انہیں وہاں بھیجا گیا تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر ان

کے اندر کا فن کار بیدار ہو گیا اور دور افتادگی کے کرب میں مبتلا رہنے اور واپس پنجاب آنے کے خواب دیکھتے رہنے کی بجائے انہوں نے اپنے قیام بلوچستان سے بھرپور تخلیقی فائدہ اٹھایا اور وہاں کے مناظر و ماحول سے بھی زیادہ وہاں کے باشندوں سے محبت کی اور ان کے دلوں اور دماغوں میں اتر کر ان کی سوچوں اور امنگوں' امیدوں اور ارادوں کا ایک چمن زار سمیٹ لائے۔ یوں انہوں نے بلوچستان کا سفر نامہ (یار پورتاژ) لکھ کر نہ صرف ہماری معلومات کا ایک خلا پر کیا بلکہ بلوچستان کی نہایت حساس صورت حال کی ایک ایسی مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی جس کی موجودگی میں ہم اپنی غلطیوں کو دہراتے چلے جانے کی روایت کی بھی تنسیخ کر سکیں گے اور بلوچستان میں رہنے والے اہل وطن کی نفسیات کو پوری طرح سمجھنے کے بعد انہیں اپنے اور بھی قریب محسوس کرنے لگیں گے۔

اس سفر نامے کے مطالعے کے آغاز میں مجھے خدشہ تھا کہ کہیں سید شوکت علی شاہ کا زاویہ نظر حاکمانہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو میں پورا مسودہ شاید ہی پڑھتا۔ خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے ایک افسر کی بجائے ایک سچے مسلمان اور سچے پاکستانی کی حیثیت سے بلوچستان کا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں بڑی سچائی اور خود اعتمادی ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے اپنے بعض تعصبات کا بھی اظہار کیا ہے' مگر زندگی کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر اختیار کرنے کے لیے بعض تعصبات ضروری بھی ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کے تعصبات نے عصبیت کی کیفیت کہیں بھی اختیار نہیں کی۔ مجھے ذاتی طور پر ان کے تعصبات سے اختلاف ہے مگر میں انہیں داد کا مستحق قرار دیتا ہوں' کہ انہوں نے اپنے تعصباب کا اظہار برملا کیا ہے اور یوں اس منافقت کا شکار نہیں ہوئے جو آج کل ہماری سیاست اور ہماری انتظامیہ بلکہ ہمارے ادب تک کا سکہ رائج الوقت ہے۔

سید شوکت علی شاہ کا انداز بیاں بہت شیریں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سفر سے لطف اٹھا رہے ہیں اور قارئین کو بھی بڑی فراخدلی سے اس لطف اندوزی میں شریک کر رہے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کی عبارت بیسویں صدی کے ربع اول کے ان صاحب اسلوب نثر نگاروں سے متاثر نظر آتی ہے' جو اپنے زمانے میں تو یقیناً نثر کے بادشاہ تھے مگر اب اس طرز تحریر کا رواج نہیں رہا۔ شکوت علی شاہ ایک سرکاری افسر ہیں۔ قدرت نے انہیں ذوق سلیم اور جرات اظہار سے نوازا ہے۔ چنانچہ انہوں نے قدرت کی اس دین کو ضائع نہیں ہونے دیا اور اسے ''اجنبی اپنے دیس میں'' کی صورت میں ایک مثبت کام میں لائے ہیں۔ پھر وہ پرانے انداز کی عبارت آرائی صرف اس وقت کرتے ہیں جب ان پر احساسات کے ایک ہجوم کی یلغار ہو بصورت دیگر جب وہ سفر نگاری کر رہے ہوتے ہیں تو ان کی روانی اور سلاست دلاویز ہوتی ہے اور ان کی سادگی پر تو باقاعدہ پیار آنے لگتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سید شوکت علی شاہ کی یہ تصنیف ''اجنبی اپنے دیس میں'' نہ صرف سفر نامہ نگاری کی دنیا میں ایک منفرد اضافہ ہے بلکہ

''پاکستانیات'' میں بھی اسے بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔ ساتھ ہی ہماری سیاسی اور تہذیبی دنیا کے لیے یہ ایک ایسی دستاویز ہے' جسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا ان اصحاب کے لیے ناممکن ہوگا جو ہماری سیاست اور تہذیب میں صداقت و دیانت کا بول بالا دیکھنا چاہتے ہیں۔



سوئے جہان سنگ وخشت

میں اس وقت راولپنڈی میں تھا اور امیر علی کی ''سپرٹ آف اسلام'' پڑھ رہا تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ میرا تقرر مکران میں ہو گیا ہے۔ یہ اطلاع ایک دوست نے فون پر دی اور ساتھ ہی یہ نصیحت بھی فرمائی۔ دیکھو! یہ تمہارا پہلا تقرر ہے۔ گھبرانا نہیں، رخت سفر باندھو اور مردانہ وار عازم مکران ہو جاؤ۔ اپنی مردانگی پر تو خیر مجھے کبھی شک نہ ہوا تھا اور ''سپرٹ آف اسلام'' ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھی' لیکن دل جانے کیوں انجانے اندیشوں سے دھڑکے جا رہا تھا۔ پسینے کے قطرے ماتھے پر سے خود سر پہاڑی چشموں کی طرح پھوٹ رہے تھے اور میرا ذہن تاریخ کے پردوں کو چیرتا ہوا تیرہ سو سال پیچھے چلا گیا۔ گرمی کا مہینہ ہے' تمازت آفتاب سے ہر چیز تانبا بنی ہوئی ہے' مدینے کی گلیاں سونی سونی نظر آتی ہیں۔ ہو کا عالم ہے۔ اتنے میں غربی جانب سے گرد کے بادل اٹھتے ہیں۔ گھوڑے کے سموں کی ٹاپ سنائی دیتی ہے' ایک سوار مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گھوڑے سے اتر کر مسجد نبوی میں داخل ہوتا ہے۔ قدموں کی آہٹ سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سر اوپر اٹھاتے ہیں۔ کہو کیا خبر لائے۔ جواب ملتا ہے۔

''مائھا وتش ثمرھا وقل ولصھا بطل ان قل الجیش فیھا ضاعوا وان کثروا جاعوا''

(پانی بہت کم ہے' پھل بہت کڑوا ہے اور چور بہت بے باک ہیں' لشکر کم ہوا تو ضائع ہو جائے گا اور زیادہ ہوا تو بھوک سے مر جائے گا)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔

حکم! اتم شاعری کرنے لگے۔

مکران کے متعلق یہ پہلی رپورٹ تھی جو حکم بن جبلہ العدی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دی جس خلیفہ سوم نے فتح سے قبل مکران کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

قلت خوراک کا مسئلہ تو خیر بہت پرانا ہے اور فقیہان شہر اس سلسلے میں اپنا فتویٰ بھی صادر فرما چکے ہیں اس لیے یہ کوئی خاص اچنبھے والی بات نہ تھی۔ پھلوں کی کڑواہٹ بھلا اس شخص پر کیا اثر دکھائے گی جو زندگی کے زہر سے پہلے ہی تلخ کام ہو چکا ہو۔ چوری کا کھٹکا ایک عرصہ ہوا دل زار سے نکل چکا' اس لیے راہزنان تمکین و ہوش ہوں یا دزدان ناؤ نوش' دعا ہی کے سزاوار ٹھہریں گے لیکن' فقدان راحت کا رونا تو غالب نے بھی رویا تھا۔ آخر وہ کیا بات تھی جس نے سنان ابن سلمیٰ جیسے کڑیل جرنیل کو لرزہ براندام کر دیا تھا؟ اس کے

دل کی دھڑکنوں کی بازگشت آج بھی تاریخ کے مدفن سے سنائی دیتی ہے۔ احساس آگہی بارہا دیوانگی کا موجب بنتا ہے۔ یہ کس کی سپاہ ہے جو پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ موت کی وادی میں بھٹک رہی ہے؟ یہ کون سی خاک ہے جو سکندر اعظم کی عظمت کے در پے ہے؟ کیا یہ شکستہ حال شخص جو اپنی تمام فوج گنوا کر ریت کے ٹیلے پر رنج و الم کی تصویر بنا بیٹھا ہے' مایہ ناز شہنشاہ سائرس اعظم تو نہیں؟

اس تاریخی پس منظر میں ذہن کا ماؤف ہونا کچھ قدرتی بات تھی لیکن جب ہاتھ میں جلتی ہوئی سگریٹ نے پوروں کو لودینی شروع کی اور چھاؤنی کے درویش منش گھڑیال نے گھگھیا کر اپنی عمر رفتہ کو آواز دی تو میں زمان و مکان کے چکر سے نکل کر عالم محسوسات میں آیا اور اٹھ کر سجدہ شکر بجالایا۔

اب مسئلہ درپیش تھا کہ گھر والوں کو اس سانحے کی خبر کس طرح سنائی جائے فوری انکشاف کسی حادثے کا پیش خیمہ بن سکتا تھا' لہٰذا اس ایجنٹ کی طرح جس نے ایک شخص کو لاٹری نکلنے کی خوشخبری بتدریج سنائی تھی' میں نے شام کے کھانے پر' جب سب گھر والے جمع ہوئے تو پہلے اسلامی تاریخ اور مسلمان مجاہدین کے کارناموں پر ایک لیکچر دیا' پھر ان صوفیائے کرام کا تذکرہ چھیڑا جنہوں نے حق کی راہ میں اپنی تمام عمر عزیز پردیس میں گزادی تھی اور جب آخر میں حرف مدعا زبان پر لایا تو خیال تھا کہ تمام گھر والے کھانا کھانا چھوڑ دیں گے' والدہ کی آنکھوں میں حسب دستور آنسوؤں کی ندی امڈ آئے گی' والد صاحب اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے بار بار شہادت کی انگلی سے سر کھجلائیں گے اور چھوٹے بھائی اگر کسی اور خیال سے ہیں تو یہ سوچ کر ضرور ملول ہوں گے کہ ان کا جیب خرچ آدھا رہ جائے گا... لیکن ایسا کچھ بھی تو نہ ہوا۔ آزمائش کام و دہن جاری رہی۔ کسی اضطراری کیفیت کا اظہار نہ ہو۔ والد صاحب کہنے لگے۔ یہ تو اور بھی اچھا ہوا اگر آدمی شروع ہی سے دور دراز علاقے میں نوکری کرے تو جفاکش اور سخت کوش ہو جاتا ہے اور پھر ساری عمر تکلیف نہیں ہوتی۔

وہ رات مجھے اپنے مقدر کی طرح تاریک نظر آرہی تھی جب میں نے رخت سفر باندھا... سوگوار چاند' ناگوار چاندنی' اشکبار آنکھیں' دل فگار خامشی۔

ہم ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ گاڑی کے ڈبے میں کچھ زیادہ رش نہ تھا لیکن پھر بھی بیٹھنے کو جگہ نہ ملی۔ عصر حاضر کے اصحاب کہف' تمام سیٹوں پر پاؤں پسارے لیٹے تھے۔ بظاہر دنیا و مافیہا سے بے نیاز' لیکن بباطن' اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ نے بدقسمتی سے کسی سیٹ پر بیٹھنے کی جسارت کر لی تو قیامت صغریٰ کا نظارہ آپ نے جیتے جی کر لیا۔ کسی زخمی درندے کی طرح دھاڑیں گے' فیل بے زنجیر کی طرح چنگھاڑیں گے' قہر آلود نظروں کے تیر برسنا شروع ہو جائیں گے۔ زہر آلود کف کے بادل گرجنا شروع ہو جائیں

گے۔ سارے کمپارٹمنٹ میں ایک بھونچال سا آ جایے گا۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ بھی ان دیدہ دلیر کی دندناہٹ کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے گی.... اخلاص' مروت' احساس اور قانون' یہ وہ فرسودہ اصطلاحیں ہیں جن کا اس اقلیم سے گزر شاید بند ہے۔ نشست لینے کے لیے یہاں ٹکٹ کی جگہ بازو کی مچھلیاں دکھانی پڑتی ہیں۔ کلیسی کی بجائے صرف عصا پر انحصار کیا جاتا ہے۔ اس اکھاڑے میں وہی پہلوان اتر سکتا ہے جو اگر رستم زماں نہ ہو تو رستم جواں ہونے کا دعویدار ضرور ہو۔ خنجر بکف' سینہ سپر' جذبہ جہاد سے سرشار اور اپنے کسی فعل شنیع پر کبھی شرمسار نہ ہونے والا.... ہر چند کہ زندگی میں کچھ اتنا زیادہ صراط مستقیم پر تو ہم بھی نہ چلے تھے اور عدم تشدد کے پرچارکوں سے ہمیشہ ہمارا اصولی اختلاف رہا تھا' لیکن کچھ تو سفر کی طوالت کے پیش نظر' کچھ حالیہ نفسیاتی علالت کے مدنظر خوئے شمشیر کو جوئے تدبیر میں ڈال دیا اور فرش پر بستر اوندھا کر کے سلیم اور میں بیٹھ گئے۔

گاڑی چلی تو میں نے پنڈی شہر کو کچھ اس حسرت سے دیکھا جیسے میں مکران نہیں' انڈیا جا رہا ہوں۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ شہر کی بتیاں ایک ایک کر کے غائب ہو رہی تھیں۔

دور مشرق سے چاند نے بادلوں کی اوٹ سے سر نکالا۔ گاڑی پوٹھوہار کی پہاڑیوں میں داخل ہو چکی تھی۔ سلیم نے حسرت بھری نظروں سے نشستوں کو دیکھا اور کہنے لگا۔ ''آخر قانون کا احترام بھی کوئی چیز ہے! ہم نے بھی تو ٹکٹ خریدا ہے۔ ہر مسافر چار چار نشستوں پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ کیا بنے گا اس ملک کا؟''

یہ تم نے ملک اور قانون کے متعلق کب سے سوچنا شروع کر دیا ہے؟ میں نے ہنس کر کہا ''قانون کا احترام ضروری ہے' لیکن بدقسمتی سے ہم یہ باتیں اس وقت سوچتے ہیں جب ہم خود کسی مشکل صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔

سلیم کہنے لگا۔ جس طرح نیکی کا خیال کسی وقت بھی آ جائے' اچھا ہے۔ قانون کے متعلق بھی یہی دلیل دی جا سکتی ہے۔

تم نے جس منطق کا سہارا لیا ہے وہ اب خاصی گھس پٹ گئی ہے۔ ویسے بھی ان سہاروں نے ہماری انفرادی اور اجتماعی سوچ کو اپاہج بنا ڈالا ہے۔

یار تم سے تو بات کر کے آدمی پچھتاتا ہے۔ سلیم چہرے پر مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے بولا اور پھر بیگ کے سے ایک فلمی رسالہ نکال کر پڑھنے لگا۔ تمام دن سفر کی تیاری کرتے کرتے میں تھک چکا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے اپنے اعصاب پر غنودگی سی طاری ہوتی محسوس ہوئی۔ کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے' یہ تو پھر نرم اور گداز بستر بند تھا۔

جس وقت سورج کی پہلی کرن نے تاریکی کی دبیز تہوں کو چیر کر اندر جھانکا تو گاڑی لاہور ریلوے سٹیشن پر جا کر رکی اور جیسے ہی

ایک برتھ کے مسافر نے اپنا سامان اتارا... میں نے اچک کر اپنا بستر سیٹ پر پھینک دیا۔ بستر بچھا کر میں نے سلیم سے کہا سو جاؤں۔ سلیم کہنے لگا۔نہیں' تم سو جاؤ' برا لگتا ہے کہ میں سو جاؤں اور تم جاگتے رہو۔ میں نے کہا'' تکلف نہ کرو' اگر اب کے تم نے انکار کیا تو میں ضرور سو جاؤں گا۔ سلیم کھسیانی ہنسی ہنسا۔ یار! بڑے سخت گیر ہو' اور ایک جست میں اوپر برتھ پر چڑھ گیا۔ مجھے بھی بیٹھنے کے لیے ایک سیٹ مل گئی۔ سلیم سو چکا تھا۔ میں نے اخبار خریدا اور خبریں پڑھنا شروع کر دیں۔ خبریں پڑھتے پڑھتے مجھے جانے کس وقت اونگھ آ گئی۔

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

جب میری آنکھ کھلی تو گاڑی ملتان ریلوے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ سلیم نے مجھے جھنجھوڑا'' غضب خدا کا! ہر وقت سوئے رہتے ہو۔ باہر دیکھو کیا بہار ہے!'' میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ باہر بہار تو نظر نہ آئی' البتہ اثبات بہار ہر رنگ اور ہر روپ میں نظر آئے۔ ٹولیوں میں بٹے ہوئے گل و نسترن صرف بات بات پر چٹک رہے تھے' بلکہ قدم بہ قدم بھٹک بھی رہے تھے۔ کہیں سادگی' پرکاری سے بغلگیر ہو رہی تھی تو کہیں ہشیاری بے خودی کی دست گیر ہو رہی تھی۔ حسن اگر تغافل میں جرات آزمائی پر مجبور تھا تو عشق بھی تفاخر میں لب کشائی پر مامور تھا۔ آہ اور واہ کے اس سمندر میں مجھے کشتی وجود ڈولتی ہوئی نظر آئی تو میں نے جھٹ سے صندوق کھول کر حکم حاکم نکالا کہ کم از کم قافیے کی حد تک مکران اور ملتان کی سرحدیں ملتی تھیں اور پڑھنے میں یا لکھنے میں غلطی کا امکان ہو سکتا تھا۔ یہ محض میرا خیال خام تھا' کیونکہ ارباب بست و کشاد اتنے سادہ لوح نہ تھے کہ شک کا فائدہ پہنچنے کی نوبت آتی۔ انہوں نے سکہ بند کام کیا تھا میرے حساب میں ...اور مکران کو لکھ دیا تھا بلوچستان کے باب میں۔

جب گاڑی سندھ کے ریگزاروں میں داخل ہوئی تو میں نے اٹھ کر ڈبے کی تمام کھڑکیاں بند کر دیں۔ سلیم نے پوچھا' کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا' سندھ کا ریگستان شروع ہو چکا ہے' اگر کھڑکیاں بند نہ کیں تو تمام ریت نتھنوں' آنکھوں اور منہ کے ذریعے پھیپھڑوں تک پہنچ جائے گی۔ سلیم کہنے لگا' تمہاری ہر کوشش رائیگاں جائے گی' کیونکہ جس طرح ایک مکان کے بند دروازے موت کا راستہ نہیں روک سکتے' اسی طرح انسانی کاوش سندھ کی ریت کو بھی اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ تم لاکھ دروازے بند کرو' کھڑکیوں کے پٹ چڑھا دو لیکن یہ ریت کہیں نہ کہیں سے آ ہی ٹپکے گی۔ برخوردار! تجربہ کار معلوم ہوتے ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس تجربے کا تمہیں پتہ اس وقت چلے گا جب تم روہڑی پہنچو گے۔ اور واقعی جب گاڑی روہڑی ریلوے سٹیشن پر پہنچی تو آئینے میں میں اپنی شکل نہ پہچان سکا۔ گرد کی ایک دبیز تہہ میرے سارے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھے اور پھر پسینے میں شیر و شکر ہو کر سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔

روہڑی اور سکھر' دریائے سندھ کے دہانے پر آمنے سامنے کھڑے ہیں... درمیان میں لینسڈ اؤن پل ہے جو قینچی پل کے نام سے مشہور ہے اور جس کے نیچے کوئی ستون نہیں ہے۔ اس پل کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں جن میں مقبول ترین یہ ہے۔ کہتے ہیں یہ پل ایک مسلمان انجینئر کی فنی مہارت کا جیتا جاگتا شاہکار ہے پل کا سارا توازن ایک خاص جگہ پر مرکوز کر کے اس کو تالا لگا دیا گیا ہے۔ تالے کی چابی جب انگریزوں نے مانگی تو اس انجینئر نے اس کو دریا برد کر دیا۔ اس پر انگریز بہت برہم ہوئے اور اس کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ اس قصے میں حقیقت کہاں تک ہے اس کا معلوم کرنا تو خیر مشکل ہے لیکن اس کا ایک اثر یہ ضرور رہا ہے کہ اس علاقے کے بچے بچے کے دل میں برطانوی سامراج کے خلاف نفرت اور حقارت کا ایک سمندر موجزن ہو گیا۔ پل کی جنوبی سمت ایک میل کے فاصلے پر دریا کے اندر ایک پیر کا مزار ہے۔ جہاں سندھ کے روایتی پیر پرست لوگ جوق در جوق آ کر ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ قینچی پل پر کھڑے ہو کر اگر بائیں جانب دیکھا جائے تو سکھر بیراج نظر آتا ہے جس کو یار لوگوں نے بزعم خود دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دے رکھا ہے۔ اس کے چونسٹھ دروازے ہیں اور لمبائی قریباً ڈیڑھ میل ہے۔ اس سے چھ نہریں نکال کر سندھ کے خشک ریگستان کو سیراب کیا گیا ہے اور ان دو پلوں کے مابین' دریا کے کنارے مچھیروں کی کشتیوں کا آرمیڈا کھڑا رہتا ہے۔ ساتھ ہی ماہی گیروں کے جھونپڑے ہیں۔ چاندنی رات کو جنوب سے اٹھتی ہوئی پرنم ہوائیں چلتی ہیں تو مچھیروں کی بانسریوں سے نکلی ہوئی افسردہ تانیں فضا میں ایک یاس انگیز کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔

سکھر شہر دو حصوں میں تقسیم ہے' ایک حصہ پہاڑی ہے اور دوسرا حصہ نشیبی' جو دریا تک چلا گیا ہے' خاصا گنجان آباد شہر ہے اور اپنے سابقہ ڈویژنل ہیڈکوارٹر خیر پور سے ہر لحاظ سے بڑا ہے۔ پتہ نہیں ارباب بست و کشاد کو سکھر کی بجائے خیر پور کو ہیڈکوارٹر بنانے میں کیا مصلحت نظر آئی تھی۔

سبی وڈھا ڈر ساختی

اب جو گاڑی چلی تو سبی جنکشن پر جا کر آنکھ کھلی۔ سبی کا علاقہ بلوچستان اور سندھ میں حد فاضل ہے۔ یہ شہر پاکستان کے گرم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شعر

سبی وڈھا ڈر ساختی
دوزخ چرا پرداختی

اکثر سنتے آئے تھے۔ اس کے معنی اس وقت معلوم ہوئے۔ رات کے پچھلے پہر سٹیشن پر پنکھے چل رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہیں

نزدیک ہی کوئی تنور جل رہا ہے اور اس کے گرم شعلے اپنا کام کر رہے ہیں۔ بات سبی کی چل نکلی ہے تو ایک لطیفہ بھی سن لیں۔ کہتے ہیں کہ روز محشر کچھ لوگ اپنے اعمال کی سزا بھگتنے دوزخ میں ڈال دیئے گئے۔ نار جہنم سے فولاد پانی ہو رہا تھا اور گنہگار انسان انگاروں کی طرح دہک رہے تھے لیکن انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ وہاں بھی کمبل اوڑھے سردی سے کپکپا رہے ہیں۔ استفسار پر پتہ چلا کہ یہ پاکستان کے علاقہ سبی سے نئے نئے آئے ہیں۔

سبی سے میدانی سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور بلوچستان کے پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس جانفشانی' انتھک محنت' مہارت اور ہمت سے انگریزوں نے زاہدان تک ریلوے لائن بچھائی' اس کا اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر آدمی اس علاقے میں سفر کرے۔ کس طرح دشوار گزار پہاڑوں کا سینہ چیر کر' سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر اور شوریدہ سر نالوں کو پاٹ کر فرنگیوں نے مواصلاتی نظام کو جدید خطوط پر چلایا۔ تمام علاقے میں سرنگوں اور پلوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے جو کام ہوا اور جو پل بنائے گئے ابھی تک ان کی استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ آج سے چند سال قبل جو پل بنائے گئے' وہ طوفانی ندیوں کا ایک ریلا بھی برداشت نہ کر سکے اور خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا' بلوچستان کے ساتھ قدرت نے اس لحاظ سے ضرور ناانصافی کی ہے کہ یہاں کے تمام پہاڑوں کو بے آب و گیاہ اور خشک رکھا ہے۔ تمازت آفتاب سے تمام زمین سوختنی ہے اور چٹیل پہاڑوں اور میدانوں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔

اگلا قابل ذکر مقام مچھ ہے۔ یہ کوئٹہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر سطح سمندر سے ۳۲۴۶ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں سے گاڑی کو پرانے زمانے میں دو انجن لگتے تھے اور نسبتاً عمودی چڑھائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مچھ میں واحد قابل ذکر جگہ سنٹرل جیل ہے جہاں تمام ملک سے سرکش اور بے مہار قیدی لائے جاتے ہیں۔ کیسا ہی اکھڑ' سرکش اور تند خو قیدی کیوں نہ ہو' جیل کے آہنی ضابطوں کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ مچھ جیل کی دریاں خاص طور پر مشہور ہیں اور قیدی اپنے کام میں خاصے مشاق ہیں۔ سارے شہر کی آبادی اور جیل کی آبادی قریب قریب یکساں ہے۔ یہاں کوئلے کی چھوٹی چھوٹی بے شمار کانیں ہیں۔ کوئلوں کے ذرات سے اٹھتا ہوا سرمئی گرد و غبار سرشام ہی تمام فضا کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی تمام شہر پر سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ لوگوں کی واحد تفریح مسافر گاڑیوں کی آمد و رفت ہے جن کا طواف کرنے کے لیے منچلے سرشام ہی سٹیشن پہنچ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں انگریزوں کے دور میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی چونکہ اس مقام سے گاڑی کو دو انجن لگتے تھے اس لیے یہاں بہت بڑا یارڈ تھا' نیز نہایت بارونق کلب بھی تھا جس میں اینگلو انڈین اور انگریز ڈرائیور سرشام آ جاتے اور پھر جام ارغوانی کے ساتھ جو راگ رنگ اور رقص و سرود کی محفل جمتی تو پو

پھٹنے تک کائنات ہی بدل جاتی اور صبح کوئی کالا چوکیدار کسی میم صاحب کوان کا بلاؤز لوٹانے جاتا اور وہ ہنس کر "تھینک یو" کہتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ساتویں جنت کی کنجی اچانک اس کی جیب میں آ گری ہو۔ مچھ سٹیشن پر مسافر ناشتہ کرتے ہیں اور اس "میک اپ" کو اتارتے ہیں جو صحرائے سندھ کی مٹی سے جسم کے ہر حصے پر چڑھ جاتا ہے۔

مچھ سے گاڑی رینگنا شروع ہوتی ہے تو پر پیچ موڑوں سے گزرتی سر بفلک پہاڑوں کے سینوں پر لہراتی' مہیب گھاٹیوں سے کتراتی اور شوریدہ سرندیوں کو پاٹتی کوئٹہ جا پہنچتی ہے۔

کوئٹہ......شہر تضادات

جب انگور کی بیلیں کسی مست ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آئیں' جب خوبانیوں کے سفید پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آپ کے دل و دماغ کو معطر کرنے لگے اور جب شفتالوؤں کے گلبار پیڑ آپ کی تھکی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانا شروع کر دیں تو سمجھیں کہ آپ کوئٹہ کے مضافات میں پہنچ گئے ہیں۔

کوئٹہ سٹیشن پر میرے ماموں' جو وہاں ٹھیکیداری کرتے تھے' موجود تھے۔ انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کہنے لگے "برخوردار! دانے پانی کی بات ہے مقدر کا لکھا ٹل نہیں سکتا کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ابھی تمہیں اتنا سفر اور کرنا پڑے گا جتنا پنڈی سے یہاں تک کر آئے ہو۔ میں نے کہا آپ نے درست فرمایا' انسان مجبور محض ہے جو وقت کے بیکراں سمندر میں اپنے مقدر کی شکستہ کشتی پر سوار ہے۔ حالات کی بے رحم موجیں اسے جس طرف چاہیں لے جاتی ہیں اور دور دور تک امید کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا۔ ماموں جان قدرے گھبراہٹ سے مسکرائے۔ نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں' یہاں جو شخص بھی آ جاتا ہے' پھر واپس جانے کا نام نہیں لیتا۔ آؤ! تمہیں آج کوئٹہ کی سیر کرائیں۔

کوئٹہ پیالہ نما وادی ہے۔ سارے شہر کی سیر آدمی باآسانی چند گھنٹوں میں کر سکتا ہے۔ عجیب تضادات کا شہر ہے۔ قندھاری بازار میں نکل جایئے تو افغانستان کی کوئی چیز نہ ملے گی۔ سارا جناح روڈ گھوم جایئے قائداعظم کی تصویر شاید ہی کسی دکان میں لٹکی نظر آئے۔ حنہ جھیل کی سیر کیجئے' پانی کی ایک بوند کو آپ ترس جائیں گے۔ اس کے باوجود کوئٹہ شہر میں ایک حسن ہے' ایک رعنائی ہے۔ چھوٹا سا صاف ستھرا شہر جو ۱۹۳۵ء کے زلزلے میں تباہ ہو گیا تھا' اب نہایت نفاست کے ساتھ پھر ابھر آیا ہے۔ فوجی چھاؤنی ہے اور اردگرد سیب کے باغات کے سلسلے ہیں۔ شام کو ریذیڈنسی روڈ پر نکل جایئے تو طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ چنار اور سرو کے دو رویہ درختوں نے تمام سڑک پر ایک چھتری سی تان رکھی ہے۔ شام کو جب تھک گئے تو لال کبابیے کی دکان سے کباب اور جائنٹ کھایا۔ لال کبابیے

کا جائنٹ کھانا ایک نووارد کے لیے اچھا خاصا مشکل کام ہے اور کھا بھی لے تو اس کو ہضم کرنا کارے دارد۔ اس کے بعد قہوہ پیا اور جب واپس آ کر سویا تو جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ ماموں جان کا مکان سٹیشن کے قریب تھا۔ آتے ہی کپڑے بدلے اور سو گیا۔ آدھی رات کے وقت ایک دھماکا ہوا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور ماموں جان کو جگاتے ہوئے بولا "اٹھئے زلزلہ آ گیا ہے۔ انہوں نے استعجاب سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ سو جاؤ! گاڑی کا انجن شنٹنگ کر رہا ہے۔ چنانچہ اس انکشاف کے بعد میں گھوڑے بیچ کر ایسا سویا کہ جب جاگا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

اب مکران کے سفر کا مرحلہ درپیش تھا۔ پتہ چلا کہ پہلی بس نکل چکی ہے اور اگلی بس جانے میں مزید ایک ہفتہ باقی ہے۔ سوچا' چلو بس ہی دیکھ لیتے ہیں۔ ماموں جان سے کہا" وہ اڈہ دکھلائیں جہاں سے ہمیں ایک نئے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ وہ پہلے تو ٹال گئے لیکن جب میرا اصرار' تکرار کی حد تک بڑھا تو انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔ تاہم جب ان کو ساتھ لے کر اڈے پر پہنچا تو کوئی بس نظر نہ آئی۔

بس کب آئے گی؟ میں نے پوچھا۔

کیا ابھی سے آنکھیں جواب دے گئی ہیں؟ سامنے بس ہی تو کھڑی ہے! دیکھتے نہیں؟

سامنے کہاں؟ میں بدستور دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا۔

وہ! انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

وہ تو سگریٹوں کا کھوکھا ہے۔ مذاق نہ کریں۔ میں ماموں جان کی حس مزاح کا پہلے ہی سے قائل تھا۔

برخوردار مذاق کے موڈ میں تو تم ہو ورنہ ایسی بے تکی باتیں نہ کرتے۔

ایں!

میں نے خوف اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بس کو دیکھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے' اتنی چھوٹی اور تڑی مڑی بس میں نے کہیں نہ دیکھی تھی۔ جو سنگلاخ چٹانوں اور لق و دق صحراؤں سے گزرتے گزرتے اپنا سب رنگ روپ کھو بیٹھی تھی۔ کھڑکیوں کے تمام شیشے قریب قریب ٹوٹے ہوئے تھے اور پچھلا حصہ کچھ اس طرح زمین پر جھکا ہوا تھا جیسے خارش زدہ کتا گرم دوپہر میں دم نیہوڑائے بیٹھا ہو۔ فرنٹ سیٹ کے سوا باقی تمام سیٹیں ندارد۔ پتہ چلا کہ یہ انتظام غریب عوام کی سہولت کے لیے کیا گیا ہے' کیونکہ اس طرح زیادہ سے زیادہ سواریوں کے بیٹھنے کی جگہ نکل آتی ہے۔ میں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا... میں تو ایسی بس میں سفر نہیں کر سکتا! میں نے اپنا دو

ٹوک فیصلہ دے دیا... تو کیا تمہارے لیے ہیلی کاپٹر منگوایا جائے؟ ماموں جان نے گھورتے ہوئے فرمایا۔

بس جانے میں ابھی چند روز باقی تھے اور میرے لیے سفر کرنے کا خیال ہی سوہان روح بنتا جارہا تھا۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ ٹرک پر سفر کیا جائے' کیونکہ ٹرک' بس کی نسبت بہرحال زیادہ آرام دہ ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک دن شام کو منڈی سے واپسی پر جب ماموں جان نے مل گیا' مل گیا کا نعرہ لگایا تو بے اختیار میرے ہاتھ بستر بند کی طرف اٹھ گئے۔ ٹرک کو رات کے وقت روانہ ہونا تھا اور ممانی' رات کے سفر کے خلاف تھیں۔ کہنے لگیں ''اتنی دور سے لڑکا آیا ہے' اس جنگل بیابان میں کیا اسے اس طرح جھونک دو گے؟'' ماموں جان کے ماتھے پر چند شکنیں نمودار ہوئیں' چہرے سے اضطرابی کیفیت مترشح ہوئی اور پھر بے اختیار ان کے ہاتھ جیب میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد تسبیح لے کر وہ استخارہ دیکھنے لگے جس نے انہیں ملہ گنگ سے کوئٹہ کی ہوا کھلائی تھی۔ درست نکلا ہے۔ ماموں جان خوش ہو کر بولے اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ سفر واقعی خطرناک ہے۔

شام کے سات بجے کے قریب جان محمد پنجگوری اپنا نیا ٹرک لے کر گھر آ گیا۔ میں نے اپنی تمام کائنات ایک سوٹ کیس اور ایک بستر بند ٹرک پر رکھا اور جب ماموں جان سے اجازت چاہی تو کہنے لگے کہ قلات تک تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن وہ کیوں؟ استخارہ یہی کہتا ہے۔ میں استخارے پر ان کے ایمان سے واقف تھا' چنانچہ تکرار نہ کی۔ ٹرک چلا تو سید ھا سریاب کسٹم پوسٹ پر جا کر رکا۔ کسٹم کے ایک باریش حوالدار نے جو شکل و صورت سے امام مسجد لگتا تھا' ڈرائیور کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ اب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہ کیا ہے؟

جناب' یہ ٹرک ہے۔

وہ تو مجھے نظر آ رہا ہے۔ حوالدار نے خشونت سے ڈرائیور کو دیکھا۔

ٹرک کے اندر کیا ہے؟

ٹرک کے اندر بوریاں ہیں۔

اور بوریوں کے اندر کیا ہے؟

گندم

گندم کے بیچ میں؟

کچھ نہیں۔

کچھ نہیں؟ یہ تو بوریاں اتروانے سے پتہ چلے گا۔

لیکن جناب' بوریاں اتارے گا کون؟

گھبراؤ نہیں یہ تمام بندوبست صبح ہو جائے گا۔

جناب! صبح تک تو کانوائی نکل چکی ہوگی۔

پھر اس کے بعد جو باتیں ہوئیں' وہ تمام بین الاقوامی زبان میں تھیں۔ ایسی زبان جس میں بولا کچھ نہیں جاتا صرف مطلب سمجھا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ جیب کے اندر گیا' پھر دوسرا ہاتھ اس ہاتھ پر دھپ سے پڑا... خدا حافظ!... خدا حافظ! ڈرائیور نے گیئر بدلا۔ زیر لب ایک غلیظ سی گالی دی' تھوک کا وزنی گولہ تصور میں حوالدر صاحب کے منہ میں پھینکا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ صاحب! اگر حکومت کو اسمگلنگ روکنی ہے تو اس محکمے کو توڑ دے۔ ڈرائیور کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

جب گاڑی لک پاس کے عمودی پہاڑ پر رینگنا شروع ہوئی تو ماموں جان نے بتایا کہ قلات ڈویژن شروع ہو گیا ہے۔ لک پاس سے اتر کر وادی مستونگ شروع ہوتی ہے۔ ایک سڑک دائیں طرف مڑ جاتی ہے جو نوشکی' زاہدان سے ہوتی ہوئی ایران جاتی ہے' اس کو مقامی لوگ لندن روڈ بولتے ہیں اور دوسری سڑک مستونگ کو جاتی ہے جو کوئٹہ سے قریباً تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ مستونگ' قلات کے خوبصورت شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے جس کی آبادی مشکل سے دس ہزار ہوگی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ بادام' پستے' خوبانی' آلوچے اور شفتالوؤں کے باغات تمام شہر کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ آبپاشی کاریزوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ کاریز کا کھودنا اور پھر شہر تک پانی لے آنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بعض اوقات غریب بلوچ سالہا سال تک کاریز بناتے رہتے ہیں تب جا کر انہیں محنت شاقہ کا ثمر ملتا ہے۔

کاریز کے ذریعے آبپاشی کا نظام اتنا اچھوتا ہے کہ قاری یقیناً اس کے متعلق تفصیلاً جاننا چاہے گا۔ ایک بلوچی کہاوت ہے کہ اس مسجد کو ڈھا دو جو کاریز کا راستہ روکے۔ عام خیال یہ ہے کہ کاریز کی کدھائی پہلے پہل عربوں نے کی' لیکن مکران میں خسروی اور کاؤسی کاریزوں کا وجود اور نام اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ آبپاشی کا یہ طریقہ کار عربوں کی آمد سے پہلے بھی موجود تھا۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی اونچی جگہ پانی کا چشمہ تلاش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد مناسب فاصلے پر گڑھے کھود کر انہیں سرنگ کے ذریعے ملا دیا جاتا ہے اور اس طرح پانی آہستہ آہستہ بہتا ہوا زمین کی سطح تک آ پہنچتا ہے۔ آر ڈی اولڈھم (R.D.Oldhem) جو محکمہ جیولوجیکل سروے

آف انڈیا سے منسلک تھا' اس نظریے سے اختلاف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ بات کسی حد تک تو درست ہو سکتی ہے' لیکن کاریز میں پانی اس طرح نہیں آتا۔ اس کی تحقیق صرف کتابوں تک محدود نہ تھی' بلکہ اس نے اس نظام کا تفصیلی جائزہ لیا اور کاریزوں کے اندر میلوں چل کر ان کی ساخت پرداخت کا مشاہدہ کیا۔ اس کے خیال میں یہ پانی کسی ایک ذریعے سے نہیں آتا بلکہ اس میں بارشوں کا وہ سارا پانی بھی شامل ہوتا ہے جو چٹانوں کی شکست و ریخت کی وجہ سے دراڑوں میں گھس کر زیر زمین جذب ہو جاتا ہے اور جب کنویں کھودے جاتے ہیں تو رس رس کر باہر نکلتا ہے اور پھر اکٹھا ہو کر نہر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

جس محنت' مشقت' جانفشانی اور عزم سے یہ لوگ کاریز کھودتے ہیں' وہ حیران کن ہے۔ کاریز کی لمبائی بعض اوقات میلوں تک جا پہنچتی ہے اور کئی کئی سال اس کو کھودنے میں لگ جاتے ہیں۔ بعض کنوؤں کی گہرائی ایک سو پچاس فٹ تک ہوتی ہے اس کی لاگت اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی فرد واحد اس کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا چنانچہ اہل دیہہ یا قبیلے کے افراد مل کر یہ بوجھ اٹھاتے ہیں پھر پانی کی تقسیم بھی سرمایہ کاری کے تناسب سے ہوتی ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاریز کی ابتدا ایک نسل کرتی ہے اور تکمیل ان کی اولاد کرتی ہے' اس لیے نئی کاریز کھودنے سے اکثر گریز کیا جاتا ہے۔ صرف پرانی کاریزوں کی صفائی اور مرمت ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی کاریز کھودنا عام آدمی کے بس کا روگ نہیں' اس کے لیے خاص مہارت اور تجربہ درکار ہوتا ہے۔ پیشہ ور کاریز کھودنے والے (کاشت) بھی عموماً دستیاب نہیں ہوتے۔ چونکہ کاریز کھودنے کا عمل اجتماعی کاوش کا مرہون منت ہے اس لیے اکثر وہی لوگ شریک ہوتے ہیں جن کی زمینوں سے کاریز گزرتی ہے یا جنہیں اس سے استفادہ کرنا ہوتا ہے۔ اگر منہدم کاریز کسی فرد واحد کی ملکیت ہو تو اس کی مرمت سے پہلے حصے داری کی دعوت دی جاتی ہے۔ انکار کرنے پر مقامی رسم و رواج کے مطابق یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حق سے دستبردار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد نہ وہ معاوضہ طلب کر سکتا ہے اور نہ کام میں رکاوٹ کھڑی کر سکتا ہے۔

ہر کاریز کو انتظامی سہولت کے لیے بارہ اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' جن کو "ہنگام" کہتے ہیں۔ ہر حصے دار اپنے حصے کی نسبت سے مزدور "نفر" مہیا کرتا ہے۔

مکران میں ہر ہنگام کے لیے کم سے کم دو مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام کی نگرانی کے لیے ایک منیجر مقرر کیا جاتا ہے جس کو بلوچی زبان میں سرشتہ کہتے ہیں۔ اسے اس کام کی نگرانی کا باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ہر فصل پر گندم' جو غیرہ کی ایک خاص مقدار بھی دی جاتی ہے۔ یہ عہدہ موروثی ہوتا ہے۔ اگر کوئی حصے دار اپنے حصے کے مزدور بھیجنے میں تساہل سے کام لے تو سرشتہ اسے جرمانہ کر سکتا ہے اور اس طرح وصول شدہ رقم مزدوروں میں بانٹ دی جاتی ہے۔ جرمانے کی اس رقم کو اشکنہ کہتے ہیں۔ کوئی شخص

منہدم کاریز کے راستے میں مکان یا دکان نہیں بنا سکتا۔ بالفرض ایسا ہو جائے تو کاریز کا رخ موڑنے کے تمام اخراجات اس کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس زمین کو جو کاریز سے سیراب ہوتی ہے' بلوچی میں 'رتیت' کہتے ہیں۔ اور یہ حصے داروں میں قرعہ اندازی کے ذریعے تقسیم کر دی جاتی ہے۔ حکومت ہر کاریز سے دو ہنگام پانی اور اسی نسبت سے زمین لینے کی مجاز ہوتی ہے۔

مستونگ' قلات کا سب ڈویژن ہے۔ قلات ضلع میں دو سب ڈویژن ہیں۔ جھلوان اور سراوان۔ سراوان کا ہیڈ کوارٹر مستونگ ہے جہاں اسسٹنٹ کمشنر رہتا ہے۔ اب مزید انتظامی تقسیم ہو چکی ہے۔ یہاں پر ایک وول سنٹر ہے جہاں کمبل اور گرم چادریں بنتی ہیں۔ شکار کے لیے مستونگ بہت موزوں جگہ ہے۔ چلتن پہاڑ میں ہرن' مارخور اور چکور بکثرت ملتے ہیں۔ جوہان ندی تو ایک وقت میں چکوروں کا مسکن بن جاتی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں خواجہ ناظم الدین مرحوم اور سکندر مرزا شکار کھیلنے کے لیے آتے تھے اور پھر ندی کنارے ایسی آزمائش کام و دہن ہوتی جس کے تذکرے آج بھی پرانے شکاری کرتے ہیں۔ خصوصاً خواجہ صاحب کی شکاریات پر تو ایک چھوٹا موٹا کتابچہ لکھا جا سکتا ہے۔ محترم' بالفرض باوصف شکاری نہ تھے تو فی الارض دلچسپ شکاری ضرور تھے۔ اگر شکار مار نہ سکتے تھے تو اسے خوار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دروغ برگردن راوی' ایک دفعہ جب آپ شکار کرنے آئے تو ماتحت عملے نے بطور حفظ ماتقدم ہرن کی ٹانگ میں رسی ڈال کر اس کو ایک خاص مقام پر باندھ دیا مبادا نشانہ چوک جائے' اور مناسب فاصلہ پر خواجہ صاحب کو لے جا کر فائر کروایا۔ چونکہ وہ آنجناب کی کیوپڈ صفت نشانے بازی سے واقف تھے' اس لیے احتیاطاً انہوں نے ایک منجھے ہوئے شکاری کو بھی نچلی گھاٹی میں چھپا کر بٹھا دیا۔ ایک فائر ہوا جو یقیناً خواجہ صاحب نے کیا تھا اور اس بات کے کئی چشم دید گواہ بھی ہیں۔ غالباً دوسرا فائر بھی ہوا تھا جو ہو سکتا ہے پہلے فائر کی (صدائے) بازگشت ہو۔ کم از کم متحیر خواجہ صاحب کو تو یہی باور کرایا گیا تھا.... اب رہا سوال یہ کہ ہرن کس کی گولی سے مرا تھا تو اس کے متعلق کئی آراء ہیں اور محققین میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن قانون شہادت کی رو سے خواجہ صاحب کا حق فائق تھا کیونکہ فائر کے فوراً بعد جو تصویر لی گئی تھی اس میں ہرن کے جسم حقیر کے ساتھ موصوف ہی کا تن کبیر نظر آ رہا تھا۔

ایک روایت کے مطابق کمانڈر انچیف ایوب خاں کی بڑی خواہش تھی کہ جوہان میں آ کر شکار کھیلیں' لیکن چونکہ مقامی کمشنر راجہ اللہ داد خاں سے ان کی ان بن تھی اس لیے یہ خواہش تشنہ تکمیل ہی رہی۔ بعد میں جب مسند اقتدار پر قدم رکھا تو سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ راجہ اللہ داد خاں کو رخصتی کا پروانہ بھجوا دیا۔

مستونگ سے قلات اٹھاون میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قلات دراصل ڈویژن بھی ہے' ضلع اور تحصیل بھی۔ قلات ڈویژن کا

ہیڈ کوارٹر خضدار ہے جو قلات ڈویژن سے سو میل آگے ہے۔ اس طرح قلات ضلع کا ہیڈ کوارٹر بھی خضدار ہے۔ قلات شہر بذات خود سراوان سب ڈویژن کی ایک تحصیل ہے۔ یہاں خان آف قلات کا محل ہے۔ ایک پہاڑی پرانے شہر کے کھنڈرات اور نئی آبادی میں حد فاصل ہے۔ تمام شہر بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے جن پر سے اکثر اوقات مفرور اندھا دھند فائرنگ کر کے اہل شہر کو ہراساں کرتے رہتے ہیں۔ شہر میں ہندو کثرت سے آباد ہیں۔ موسم کے لحاظ سے سردیوں میں درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے کہیں نیچے چلا جاتا ہے۔ شہر کے اردگرد سیب' اخروٹ اور بادام کے باغات ہیں۔ شاہی باغ میں ایک بڑا خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے جو خان قلات نے افسروں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

قلات کی ایک رات

جب ہم قلات پہنچے تو رات کے دو بج چکے تھے۔ ہر چند کہ قلات' کوئٹہ سے اسی میل کے فاصلہ پر ہے' لیکن ٹرکوں نے یہ فاصلے چھ گھنٹوں میں طے کیا۔ دراصل لدا ہوا ٹرک' جتے ہوئے کولہو کے بیل کی طرح سسکتا ہوا چلتا ہے۔ ذرا سی چڑھائی پر بھی اس کی رگیں تن جاتی ہیں اور سانس اکھڑنے لگتی ہے۔ جگہ جگہ ڈرائیور رکتے ہیں۔ کبھی اونگھ مارنے کے لیے "گڑل" چائے پیتے ہیں تو کبھی مت مارنے کے لیے سگریٹ میں چرس ڈل کر دم لگاتے ہیں۔ کسی پیر فقیر کا تصوراتی مزار مزید تاخیر کا موجب بنتا ہے۔ وہاں بغیر بریک مارے یا چڑھاوا چڑھائے گزرنا سفر کے لیے مہلک گردانا جاتا ہے۔ ڈرائیور' شہادت کی انگلی سے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر مادری زبان میں لپٹی ہوئی عربی دعائیں مانگتے اور وقتی طور پر تائب ہوتے ہیں۔ اور اسی خشوع وخضوع کے عالم میں چرس میں رچی ہوئی سانسوں کو "چھو" کے انداز میں مزار کی طرف پھینکتے ہیں۔

گاڑی آگے نہیں جاسکتی! جان محمد نے بریک پر اپنی وزنی چپل رکھتے ہوئے کہا۔

کیا کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہے؟ میں نے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔

شہر کا گیٹ بند ہو گیا ہے۔ جان محمد ایک بے ہنگم انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

تو آؤ منت دربان کر دیکھتے ہیں۔ میرا لہجہ خوابناک تھا۔

برخوردار! کس دنیا میں ہو؟ پاسبان کے قدم صرف مشرقی شاعری میں لیے جاتے ہیں۔ یہاں جب پھاٹک ایک دفعہ بند ہو جائے تو پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے نہیں کھلتا۔ ماموں جان بزرگانہ سرزنش کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ نکلنے دیتے۔

گاڑیاں پہاڑی کے پہلو میں کھڑی کر دی گئیں جو شہر کے دائیں جانب تھی۔ ڈرائیوروں اور کلینروں نے اپنے بستر ٹرکوں پر سے

اتارے اور انہیں کھول کر زمین پر دراز ہو گئے۔ میں نے ایک نظر اپنے بستر بند کو دیکھا لیکن دوسرے لمحے اسے زمین پر بچھانے کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایک تو بستر بند میں بستر کم تھا اور کتابیں زیادہ۔ اور دوسری وجہ وہ تھی جو اکثر شریف آدمی محسوس کرتے ہیں لیکن بیان کرنے میں ہچکچاتے ہیں' اب خدا لگتی کہیے کہ اگرچہ زندگی میں ہم نے مساوات پر بہت سے لیکچر سنے تھے اور اکثر خود بھی اپنے محدود خطبات میں اسی روش کی تلقین کی تھی' لیکن اکثر و بیشتر باتیں صرف زور خطابت میں کہی جاتی ہیں' ان پر خود عمل کرنا مقصود نہیں ہوتا' لہٰذا جان محمد کی زمین پر سونے کی دعوت کو ہم نے درخور اعتنا نہ سمجھا اور ٹرک ہی میں ڈٹ گئے۔

کچھ عرصے تک تو ماموں جان سے باتیں ہوتی رہیں اور وہ خوانین قلات کے متعلق اپنی معلومات سے مجھے سرشار کرتے رہے لیکن تا کجے؟ بھلا اس قسم کے سہاروں سے نیند کی یلغار روکی جا سکتی ہے؟ ماموں جان کا زور خطابت دم توڑنے لگا اور جب وہ ہر منٹ کے بعد سر کو پانچ مرتبہ جھٹکنے لگے تو ہم فرنٹ سیٹ ہی پر مخالف سمتوں میں لیٹ گئے۔ سیٹ چھوٹی تھی' اس لیے میری ٹانگیں بار بار ان کے پاؤں سے ٹکراتیں۔ کچھ دیر تو یہ سلسلہ چلتا رہا' آخر میں نے جی کڑا کیا اور گرم چادر لپیٹ کر ٹرک سے باہر نکل آیا۔ سرد ہوا کا ایک نکیلا جھونکا شپ سے میرے جسم سے ٹکرایا تو چادر پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ دراصل ٹرک کے اندر بیٹھے ہوئے باہر کے درجہ حرارت کا پورا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ صرف سرد ہوا ہی جان لیوا نہ تھی' گھپ اندھیرا بھی روح میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ لیلائے شب نے کچھ اس انداز سے زلفیں کھولی تھیں کہ شب ہجر کی تاریکی اور طوالت محض ایک شاعرانہ مبالغہ لگنے لگی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا۔ ہر سو ہو کا عالم تھا۔ سخت سردی کی وجہ سے جھینگر تک اپنے ٹھکانوں میں دب گئے تھے۔ اس یخ بستہ خاموشی کے سمندر میں کچھ عرصے تک تو میں بھی غرق رہا' لیکن جب آہستہ آہستہ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں تو "میرامن" کے پہلے درویش کی طرح میں نے شہر کی فصیل کا چکر لگانا شروع کیا۔ قلات شہر کے اردگرد باقاعدہ کوئی دیوار تو نہ تھی' اس کی کسر پہاڑیوں' باغات اور جنگلات نے پوری کر دی ... دائیں جانب جو پہاڑی ہے' اس پر میر محمود خان کا محل تھا جو اب کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ زلزلے نے جہاں غریبوں کے جھونپڑوں کو تاکا تھا' وہاں وہ پرشکوہ عمارت بھی اس کی دستبرد سے نہ بچ سکی۔ ایک روایت کے مطابق میر محمود خان نے پہاڑی کی چوٹی پر بڑا خوبصورت محل تعمیر کیا تھا جسے خوبصورت فرنیچر اور اطلس و کمخواب کے پردوں سے مزین کیا گیا تھا۔ میر محمود خان کی نجی زندگی کے متعلق بھی بڑے حیران کن قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے محل میں تین سو کے لگ بھگ لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان تمام کا رنگ سیاہ تھا کیونکہ خان موصوف کو آبنوسی رنگ سے ایک خاص انس تھا' نیز وہ تخلئے میں زنانہ لباس پہنتا۔ ایک دفعہ جس پاپوش یا لباس کو پہن لیتا' پھر استعمال نہ کرتا... اس پہاڑی کے بالمقابل سڑک کے دوسری طرف قلات کا پرانا شہر تھا جس کے کھنڈرات اب بھی موجود

ہیں۔ یہ شہر بھی ۱۹۳۵ء کے زلزلے میں مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ ماموں جان نے میر محمود خان کے الف لیلوی قصے کچھ اس انداز میں سنائے تھے کہ میں اس بلند پہاڑی کی چوٹی کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا۔ اندھیرا' خاردار جھاڑیاں' نکیلے پتھر' عمودی چڑھائی' کچھ بھی تو میرے راہ شوق میں مزاحم نہ ہوسکا۔ نصف گھنٹے کی جدوجہد کے بعد میں چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ تمام کھنڈرات پر پر ہول سناٹا طاری تھا۔ چونکہ چڑھائی کی وجہ سے میری سانس پھول گئی تھی' اس لیے ایک شکستہ دیوار پر بیٹھ کر میں اپنی سانس ہموار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تو مجھے روشنی کا احساس ہوا۔ ناگہاں میری نگاہ کھنڈر پر پڑی تو مجھے دو چراغ جلتے ہوئے نظر آئے۔ ان کھنڈروں میں اس سمے یہ چراغ کس نے جلائے ہیں؟ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ لیکن آہستہ آہستہ جب وہ دیئے ابھرتے ہوئے دکھائی دیئے تو سوچ پر خوف غالب آ گیا... یہ کسی کشتہ ستم کنیز کی بھٹکتی ہوئی روح تھی' طاغوتی شرار تھا یا کوئی خونخوار جانور گھات لگائے بیٹھا تھا۔ میرا ذہن ابھی اس گورکھ دھندے میں الجھا ہوا ہی تھا کہ دفعتاً وہ روشنیاں مجھے اپنی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میرے وجود میں خطرے کی تمام گھنٹیاں بیک وقت بجنا شروع ہوگئیں۔ خوف کی ایک سرد لہر مجھے ریڈھ کی ہڈی میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بھاگنے کے تمام راستے مسدود تھے۔ اس عمودی ڈھلان پر دوڑنا ملک الموت سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے مترادف تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے ماموں جان کے متعلق سوچا جو نیچے ٹرک میں آرام سے سو رہے تھے' لیکن یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ بالکل اس ہرن کی طرح جو راہ فرار نہ پا کر شکاری کی طرف لپکتا ہے' بے اختیار میرے ہاتھ جیب کی طرف گئے اور میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ شکاری چاقو نکالا۔ جب کمانی دار چاقو کڑکڑایا تو وہ روشنیاں یکدم فضا میں بلند ہوئیں۔ کوئی چیز دھپ سے زمین پر آ گری اور پھر نہایت تیزی سے میرے قریب سے گزرتی ہوئی نیچے لڑھک گئی... یہ ایک گیدڑ تھا جو چاقو کی آواز سن کر دوڑ پڑا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے امڈ آئے۔ میں نے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور کھڑا ہوگیا۔ قلات کا نیا شہر میرے سامنے تھا۔ تمام شہر نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ روشنی کی کوئی کوئی کپکپاتی کرن مکانوں کے اندر سے جھانک رہی تھی۔ چاروں طرف سربفلک پہاڑ تھے۔ میں نے بائیں طرف گھوم کر پرانے شہر پر نظر ڈالی جہاں زندگی کی ہر رمق مٹ چکی تھی۔ میرا خوف آہستہ آہستہ زائل ہوتا جا رہا تھا اور اس کی جگہ تاسف اور تاریخ لے رہے تھے۔ آج میرے پاؤں جن کھنڈرات پر پڑ رہے تھے' کسی زمانے میں وہاں عام آدمی کے خیال تک کی رسائی ممکن نہ تھی۔ محل چھوڑ لوگوں کی سوچ پر بھی پہرے بٹھائے جاتے۔ اب جب میر محمود خان کی روح ان ویرانوں کا طواف کرتی ہوگی تو انہیں حشرات الارض کی آماجگاہ دیکھ کر ضرور لرزتی ہوگی۔ خان موصوف کو جس سیاہی سے انس تھا' صرف اس کے نشان رہ گئے تھے' باقی کچھ نہ بچا تھا۔

میرے لیے اب وہاں مزید ٹھہرنا بیکار تھا۔ میں نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ ٹرک سے ماموں جان کے خراٹے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈرائیور بھی نہایت سکون کے ساتھ خواب استراحت کے مزے لے رہے تھے۔ میں نے ان کے آرام میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور شاہی باغ کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ میر احمد یار خان کا قلات میں بہت بڑا باغ ہے جو قریباً ایک میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا ایک حصہ شہر کے اندر ہے اور دوسرا سرا باہر تک چلا گیا ہے۔ باغ کے اردگرد مٹی کی دیوار بنی ہوئی ہے جو کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ چلتے چلتے خوبانیوں کی اشتہا انگیز خوشبو نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ سنہری خوبانیوں کی چمک سے تمام پیڑ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اس اثنا میں پچھلی رات کا چاند بھی نکل آیا۔ مجھے خوبانیوں کا پیڑ دیکھ کر بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ہم چھٹی جماعت میں تھے۔ ایک رات پڑھتے پڑھتے یہ پروگرام بنا کہ امرود کھائے جائیں' چنانچہ ہم چھ سات لڑکے کمبل اوڑھے قریبی باغ کی پچھلی باڑ پھلانگ کر اندر گھس گئے۔ ابھی امرود توڑنے شروع ہی کئے تھے کہ ملک صاحب کا کتا ہمارے استقبال کو پہنچ گیا۔ ہم نے دوڑ کر دیوار پھلانگی ہی تھی کہ اس نے ہمیں آ لیا۔ اب مزید دوڑنا بیکار تھا۔ پیشتر اس کے کہ کتا ہماری مزاج پرسی کرتا ایک لڑکے نے جھٹ سے اپنا کمبل اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور پھر اپنے والد کے وزنی فوجی بوٹ سے اس کے پیٹ میں جو ایک زوردار ٹھوکر لگائی تو اس پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بے چارے کی وفاداری نے وہیں دم توڑ دیا اور پھر جو دم دبا کر بھاگا تو ہمارے امرود توڑنے تک کہیں نظر نہ آیا۔ اب وہ شوق باقی رہا نہ شرارتیں اور نہ بچپنا۔ صرف کتوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے لہٰذا یہ سوچتے ہوئے کہ پھل توڑنے سے پیشتر ہی کوئی کتا نہ جھپٹ پڑے' الٹے قدموں پلٹ آیا۔

ماحول پر ہنوز نیند کی حکمرانی تھی۔ پتہ نہیں وقت کی رفتار تھم گئی تھی یا رات شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہو گئی جو کاٹے نہ کٹتی تھی۔ شب فراق ہوتی تو طوالت کا کوئی جواز بھی تھا لیکن جہاں ہر جذبہ غم روزگار کی نذر ہو گیا ہو وہاں لیلائے شب کی یہ اٹکھیلیاں طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔

اب صرف پرانے شہر کے کھنڈرات اور قبرستان باقی رہ گئے تھے اس لیے سوچا کہ باقی وقت خفتگان خاک کی معیت میں گزارنا چاہیے۔ پرانے شہر کے کھنڈرات نئی سڑک سے کچھ زیادہ دور نہ تھے۔ میں چند منٹوں میں وہاں پہنچ گیا۔ یہاں بھی وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مریل چاند کی زرد روشنی میں تمام فضا بوجھل بوجھل سی لگتی تھی۔ بھونچال کی صرف ایک ہی لہر نے تمام بستی کو ابدی نیند سلا دیا تھا۔ لہلہاتے کھیت' جگمگاتی روشنیاں' دندناتی جوانیاں کچھ بھی تو باقی نہ بچا تھا۔ ہر چیز پیوند خاک ہو گئی۔ گو زندگی کے ساتھ اتنا سنگین مذاق پہلی دفعہ تو نہ ہوا تھا' لیکن اس مرگ انبوہ میں نہ تو کوئی جشن منانے والا باقی رہ گیا تھا اور نہ کوئی مرثیہ گو ہی نظر آتا تھا۔ کھنڈرات

میں شکستہ دیواریں اب بھی کسی ایسے ضعیف باپ کی کمر کی طرح جھکی ہوئی تھیں جس کا جوان بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ گیا ہو۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر چند چمگادڑیں جو دیواروں کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں' پھڑ پھڑا کر اڑ گئیں اور فضا میں ڈولنے لگیں۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر خفتگان خاک کے لیے دعا مانگی اور ایک بوسیدہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا... بچپن میں سنا تھا کہ روحیں اس جگہ کا طواف ضرور کرتی ہیں جہاں ان کا جسد خاکی سے سلسلہ منقطع ہوتا ہے۔ میرے تصور کی آنکھ نے بے شمار مضطرب ہیولے دیکھے جو اپنے پیاروں کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ بظاہر میری آنکھیں بند تھیں لیکن ذہن کا ہر دریچہ کھلا ہوا تھا۔ مفکروں نے زندگی کی ہزار تاویلیں کی ہیں' مفسروں نے موت کی لاکھ تعبیریں ڈھونڈی ہیں' لیکن درد کے رشتوں سے بہت کم لوگوں نے ناتا جوڑا ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے اندر جھانکا۔ یہ نگر بھی کئی بار لٹ چکا تھا۔ کتنی مشابہت تھی ان بستیوں میں۔ وہی سسکتی ہوئی ویرانی' وہی بے سروسامانی' وہی زمین بوس عمارات کا ملبہ' وہی کچلے ہوئے جذبات کا غلبہ...

میں غالباً سو گیا تھا یا جاگ رہا تھا یا پھر بیک وقت سونے اور جاگنے کی کربناک کیفیت سے گزر رہا تھا۔ تمام رات میری آنکھوں کے سامنے رقص ابلیس ہوتا رہا۔ موت کے خوں آشام چمگادڑ زندگی کی رگوں سے خون چوستے رہے۔ ہزاروں من ملبے کے نیچے دبی ہوئی سسکیاں' آہیں اور چیخیں دل پر ہتھوڑے برساتی رہیں۔

جب سورج کی کرنوں نے مسلسل میرے جسم کو گدگدایا اور ڈرائیوروں کی کھٹ پٹ شور و غوغا میں تبدیل ہو گئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں کھنڈروں میں لیٹا ہوا ہوں۔ میں نے اٹھ کر چادر کی گرد جھاڑی اور ٹرکوں کی طرف چل پڑا۔ ماموں جان بھی بیدار ہو چکے تھے اور ان کی تجسس بھری نظریں میری تلاش میں سرگرداں تھیں۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟

کہاں نہیں گیا! میں نے جواب کو مختصر کرنا چاہا۔

میرے خیال میں تو تم ہفت اقلیم کا سفر کر آئے ہو۔ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

ہفت اقلیم تو پہلی منزل بھی نہیں بنتی۔

چھوڑو ان باتوں کو۔ ماموں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ اس کمبخت جان محمد نے رات کو بھی کھانا نہیں کھانے دیا۔ چلو چل کر شہر میں ناشتہ کرتے ہیں۔ میں اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھا کہ ایک رات کی بھوک کا سفر زندگی کے تمام سفر پر بھاری ہوتا ہے اس لیے چپ چاپ ان کے پیچھے چل پڑا۔

پھاٹک کی زنجیر کھل چکی تھی۔ ہم نے پیدل ہی چلنا شروع کر دیا۔ پھاٹک عبور کر کے جب ہم پختہ سڑک پر پہنچے تو ہمارے

دائیں طرف محمود خان کے محل کے کھنڈر تھے جن کے ہر ذرے پر سطوت گم گشتہ کی ایک داستان رقم تھی اور بائیں طرف میر احمد یار خان کا شاہی باغ تھا جس کے کسی پھل پر بھی کسی حواری' درباری یا مصاحب شاہ کا نام نہ لکھا تھا۔ ہر طرف باغ ہی باغ نظر آرہے تھے۔ اخروٹ' سیب' اسٹرابیری' خوبانیوں اور ناشپاتیوں کے درخت سڑک کے دورویہ ایستادہ تھے۔ بازار ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ بازار پہنچے تو اکثر دکانوں پر ہندو بیٹھے ہوئے نظر آئے جو ہر آنے جانے والے کو ہاتھ اٹھا کر نمسکار کرتے.... ماموں جان کا چونکہ کاروبار کے سلسلے میں یہاں آنا جانا رہتا تھا اس لیے مجھے قلات سے متعارف کرانے کا سہرا بھی انہوں نے اپنے ماتھے پر سجا لیا... کہنے لگے۔ ایسا لگتا ہے کہ رات تم اچھی طرح سو نہیں سکے' اس لیے مناسب ہوگا کہ ناشتے سے پہلے گرم حمام سے غسل کر لیا جائے اور شیو بھی ہو جائے۔ یہاں اپنے پنجاب کا ایک بڑا اچھا باربر ہے جس نے پیرس ہیر کٹنگ سیلون کھول رکھا ہے۔ بڑا ستھرا کاریگر ہے۔ ہم چند موڑ کاٹ کر پیرس ہیر کٹنگ سیلون میں پہنچ گئے۔ یہ ہیر کٹنگ سیلون بھی وطن عزیز میں جا بجا کھلنے والے ان یونانی دواخانوں کی طرح تھا جن کو یونان سے صرف نام کی نسبت ہوتی ہے اور جن کا وجود اور مجرب نسخے وہاں کہیں نہیں ملتے۔ اگر سکندر اعظم کو ذرا سا بھی گمان اس امر کا ہوتا کہ اس کے ہندوستان پر حملے کے منجملہ اثرات میں یونانی دواخانوں کا قیام بھی شامل ہوگا تو شاید ادھر کا کبھی رخ نہ کرتا۔

باربر ماموں جان کو بڑے تپاک سے ملا اور شیو بناتے ہوئے پنجاب کے حالات پوچھتا رہا۔ ہر انکشاف کے بعد وہ برش والے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر 'اچھاجی' کہتا۔ جب تک وہ جھاگ والا برش پھیرتا رہا اس اچھاجی کا اثر ظاہر نہ ہوا لیکن جب داڑھی مونڈتے ہوئے اس نے استرے والے ہاتھ کو جھٹک کر اچھاجی کہا تو ماموں جان کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے جلتا ہوا انگارہ ان کے رخسار پر رکھ دیا ہو۔ آن کی آن میں سفید جھاگ شفق رنگ ہوگئی۔ ''بس کرو!'' ماموں جان غصے میں دھاڑے.. 'اچھاجی' کہہ کر اس نے ہاتھ روک لیا اور گرد آلود میز کی دراز کھول کر پھٹکری نکال لایا۔ ماموں جان کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ اس ایک اچھاجی نے نہ صرف محرم کو مجرم بنا ڈالا بلکہ دیرینہ تعلقات کی دھجیاں بھی بکھیر دیں۔ جب ہم حمام سے باہر نکلے تو ماموں جان پھٹ پڑے۔ الو کا پٹھا بالکل اناڑی ہے۔ اچھاجی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

جب ہم ایک کھوکا نما ریسٹورنٹ میں ناشتہ کرنے داخل ہوئے تو میں نے اپنا منہ ماموں جان کے کان کے قریب لے جا کر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ کیا یہ بھی اپنے کسی پنجابی کا ہوٹل ہے؟ ماموں نے غصے سے میری طرف دیکھا' لیکن پھر فوراً ہی مسکرا اٹھے۔ کیا بچوں کی طرح ایک بات پکڑ لیتے ہو۔ چلو ناشتہ شروع کرو۔ ہر چند کہ ہوٹل چھوٹا سا تھا لیکن ناشتہ بڑا لذیذ تھا۔ گھی میں تلے ہوئے انڈے تھے' خالص شہد تھا اور گرم گرم پراٹھے جن پر تازہ مکھن کی ٹکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گرم چائے کی نیلی کیتلی سے دودھیا بھاپ اٹھ

رہی تھی۔ میز پر رکھا ہوا پرانا ریڈیو نغمے بکھیر رہا تھا۔ اور ہم پلیٹوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں سرگرداں!... اتنے میں ریڈیو سے مبارک بیگم کی سوگوار آواز ابھری.... کبھی تنہائیوں میں بھی ہماری یاد آئے گی.... چائے کا گھونٹ مجھے حلق میں اٹکتا سا محسوس ہوا۔ ماموں بڑے غور سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے' بولے "ابھی سے اس قدر انہماک! سچ سچ بتاؤ کون سی یاد ستا رہی ہے؟ پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی کہنے لگے ویسے فکر کی کوئی بات نہیں' ایسی جگہ جا رہے ہو جہاں زندگی کا بقیہ حصہ انہی حسین یادوں کے سہارے گزرے گا... پتہ نہیں حسین یادوں کی اصطلاح کس فراغت پسند نے وضع کی تھی اور پھر ان کے سہارے زندگی گزارنے کا نظریہ پیش کیا؟ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یادیں چاہے رنگین ہوں یا سنگین' جونک کی طرح دل کی دھڑکنوں سے چمٹ جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ انسان کو دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہیں.... مبارک بیگم کی آواز سن کر میری آنکھوں کے سامنے بجلی کا ایک کوندا سا لپکا تھا جس کی روشنی میں' میں نے مرجھائے ہوئے گلاب کے اس پھول کو دیکھا جو پنڈی میں ایک حسین شام کو میرے دل میں کھلا تھا۔ مرجھائے ہوئے پھول ہمیشہ مزاروں کی زینت بنتے ہیں۔ ماموں جان ساری زندگی ناک کی سیدھ میں چلے تھے' بھلا اس کسک کو کیسے محسوس کرتے۔

حفظ مراتب

جب ہم واپس آئے تو ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ گاڑیاں ایک لمبی قطار میں کھڑی تھیں۔ سب سے آگے ایک کار تھی۔ کار کے پیچھے چند جیپیں' جیپوں کے پیچھے بسیں اور بسوں کے بعد ٹرک اور ٹرکوں کے سائے میں چند کیکڑے سر نیہوڑائے کھڑے تھے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ذات پات کی جو تمیز معاشرے میں ہنوز برقرار ہے' اس کا اہتمام کل پرزوں پر بھی کیا گیا ہے۔ سڑک کے دوسری جانب پولیس اور ملیشیا کے چند ٹرک کھڑے تھے جن میں پولیس کانسٹیبل اور ملیشیا کے چاق و چوبند جوان رائفلیں ہاتھوں میں لیے بیٹھے تھے۔ ایک گاڑی کے اوپر اڑھائی انچ دھانے کی مارٹر نصب تھی' دوسری گاڑی میں چند لائٹ مشین گنیں تانک جھانک کر رہی تھیں۔ ایک نائب تحصیلدار جس نے ملیشیا رنگ کی قمیض اور شلوار پہن رکھی تھی اور جس کی موٹی توند پر بندھی ہوئی پیٹی بار بار نیچے ڈھلک آتی تھی' کسی جرمن کمانڈر کی طرح حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ یا مظہر العجائب.... میرا دماغ ماؤف ہونے لگا' کیا ہم مکران جا رہے ہیں یا کسی محاذ کی طرف بڑھنے والے ہیں؟ یہ تمام اہتمام کس کے لیے کیا گیا ہے؟ میں نے رکتے رکتے ماموں جان سے پوچھا۔ یہ تمام حفاظتی تدابیر ہیں۔ ماموں جان بولے۔ حفاظت کا یہ سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا؟ پتہ چلا کہ چند سر پھرے منچلے ہیں جو انتظامیہ سے وقتاً فوقتاً آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ تمام اہتمام ان کے لیے کیا گیا ہے۔ قلات سے لے کر وڈھ تک کا جو علاقہ ہے' اس میں ویسے تو

کئی قبیلے ہیں لیکن مینگل اور زرک زئی مشہور قبائل ہیں۔ جب تک برطانوی سامراج برصغیر پر مسلط رہا' اس صوبے میں ایک خاص حکمت عملی کے تحت کام ہوتا رہا۔ اس نظام میں قبیلے کے سردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا اور اس کی گرفتاری مقصود ہوتی تو سردار سے رابطہ قائم کیا جاتا۔ لیکن برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد سوچ کے زاویے بدل گئے۔ انتظام مصلحتوں کی جگہ ''اصول پرستی'' نے لے لی اور جب رائج الوقت قانون کو ہمہ گیر بنانے کا سوال اٹھا تو ہر طرف سرکشی نے سر اٹھالیا۔ ایک سردار نے جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے قبیلے کے لوگوں کا مقدر بن جاتا تھا' اب اپنے آپ کو تعزیرات اور ضابطہ فوجداری کے شکنجوں میں جکڑا ہوا پایا۔ وہ بروہی جس کے لیے اپنے سردار کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ایک قسم کی عبادت تھا' اب قانون شہادت کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر رہ گیا اور جب قبائلی عصبیت نے ہر طرف مفروضہ ''استحصال'' کے جال بنتے دیکھے تو اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو زمانہ قدیم سے ان کا مسلک بن چکا تھا۔ ہر طرف سرکشی کی آگ بلند ہوئی' نافرمانی کی آندھیاں چلیں اور شک و نفرت کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔ سردار عطاء اللہ مینگل گرفتار ہوا اور جب اس کی جگہ اس کے چچا کرم خاں کو قبیلے کی مرضی کے بغیر سردار بنا لیا گیا اور مستونگ میں ارباب بست وکشاد نے اسے خلعت فاخرہ پہنائی تو ہر طرف سے مبارک مبارک کا شور اٹھا۔ سردار بہرام خاں لہڑی نے خلعت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سردار کرم خاں مبارک ہو' آج تم نے اپنا کفن پہن لیا ہے۔ اور رات کو جبکہ مبارک باد کی بازگشت ابھی تک سردار کرم خاں کے کانوں میں رس گھول رہی تھی' علی محمد مینگل نمودار ہوا اور پھر وہی ہوا جو وہاں کا دستور تھا۔ ہر کام کرنے کے لیے ایک وقت درکار ہوتا ہے۔ ہر حکمت عملی سازگار حالات کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔ جب تک ملک میں تعلیم عام نہ ہو' تمام آبادی اخوت کے رشتے میں منسلک نہ ہو جائے اور تعلیم قومی شعور کو پختہ نہ کر دے' اس قسم کا تصادم ناگزیر ہوتا ہے۔ میرے ایک دوست نے واقعہ سنایا۔ وہ جھالاوان میں ایس ڈی ایم تھے۔ ایک دفعہ دورے پر گئے تو راستے میں ایک بروہی کو زمین پر درد سے تڑپتے دیکھا۔ اس کا ہاتھ اس کے پیٹ پر کسا ہوا تھا اور وہ ''دودا دودا'' پکار رہا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ بروہی میں درد کو دودا بولتے ہوں گے' چنانچہ انہوں نے اپنے اردلی کو کہا کہ یہ شخص کیا کہتا ہے۔ اردلی نے جواب دیا کہ وہ اپنے سردار دودا خان زرک زئی کو پکار رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس سے کہو کہ اپنے خدا کو پکارے' کیونکہ درد کا مداوا تو صرف ذات باری تعالیٰ ہی کر سکتی ہے۔ بروہی نے جواب دیا کہ دودا خاں' خدا کی نسبت ہمارے زیادہ قریب ہے۔

سورج خاصا اوپر آ گیا تھا۔ تمازت آفتاب سے رات کی سردی پگھل چکی تھی اور ابتدائی شور و غوغا کے بعد ماحول پر مکمل سکوت چھا چکا تھا کہ اچانک فضا میں سیٹی کی آواز گونجی۔ یہ قافلے کی روانگی کا سگنل تھا۔ گاڑیوں کے انجن پھڑ پھڑائے' فضا میں ایک ارتعاش

پیدا ہوا۔ یا اللہ! تیرا ہی آسرا' جان محمد نے منہ میں نسوار ڈالتے ہوئے کہا اور میں نے جب ہاتھ باہر نکال کر ماموں جان کو الوداع کہا تو ٹرک ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

قلات سے کچی سڑک شروع ہوتی ہے اور پھر یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ دشوار گزار گھاٹیوں اور تنگ دروں سے گزرتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار بڑی سست تھی۔ گرد و غبار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ قلات اور سراب کے درمیان بینچہ ہے جہاں گاڑیاں کچھ دیر کے لیے کھڑی ہوتی ہیں۔ بینچہ کے عقب میں فاتوگر کا پہاڑ ہے جو مفروروں اور ڈاکوؤں کا مسکن ہے اور یہاں سے پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعد میں مجھے ان پہاڑوں میں کئی دفعہ ڈاکوؤں کی تلاش میں آبلہ پا ہونا پڑا جس کا ذکر میں کسی مناسب موقع پر کروں گا۔ قریباً تین گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم سراب پہنچے۔ جان محمد نے بتایا کہ رات کو یہاں قیام کرنا ہو گا کیونکہ اگلے روز جو کانوائی خضدار سے آئے گی' اس کے ساتھ ہمیں آگے جانا ہے۔ میں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں مگر رات کہاں بسر ہو گی'' پچھلی رات کا تلخ تجربہ ابھی تک میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا اور نیند کے مرغولے آنکھوں سے ابلے پڑتے تھے۔ صاحب! یہاں قریب ہی ایک بنگلہ ہے۔ تو پھر جلد کرو۔ جان محمد نے گاڑی کا گیئر بدلا اور چند موڑ کاٹ کر گاڑی ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بنگلے کی پیشانی پر بی اینڈ آر ریسٹ ہاؤس لکھا تھا جو افسران محکمہ کی ظرافت طبع کا جیتا جاگتا شاہکار تھا' یا پھر اس خیال سے کہ اتنی خوبصورت عمارت کو نظر نہ لگ جائے' اس کالے کلوٹے بورڈ کو اس کی پیشانی پر چسپاں کر دیا گیا تھا۔ ٹرک کی آواز سن کر بنگلے کا چوکیدار باہر نکلا۔ اس نے بڑی رعونت کے ساتھ پہلے ٹرک کو دیکھا اور پھر ہمارے گرد آلود چہروں پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے بولا۔

فرمایئے! کیا چاہیے؟

استا درات گزارنی ہے۔ میں نے استدعا کی۔

کیا آپ بی اینڈ آر کے محکمے سے ہیں؟

نہیں' پی ڈبلیو ڈی کے ٹھیکیدار ہیں؟

اوں ہوں! تو پھر بسم اللہ۔ وہ سامنے سرائے مسافروں کے لیے ہے۔ چوکیدار نے ہماری اصل حیثیت کی نشاندہی کر دی...

بکواس بند کرو اور یہ سامان اٹھا کر اندر رکھو۔ میں تمام سفر میں پہلی دفعہ افسرانہ جذبے سے مغلوب ہوا۔ انور شاہ کی واحد آنکھ کی پتلی گھومی۔ شکن آلود چہرے پر غصے کا مدوجزر ابھرا اور لرزتے ہاتھوں سے اس نے میرا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور اندر چلا گیا۔ میں نے اپنا دستی بیگ اٹھایا اور جب کمرے میں جا کر قدم آدم آئینے کے سامنے اپنا حلیہ دیکھا تو باہر دور کہیں سے جان محمد کے گنگنانے کی آواز

آ رہی تھی۔عصانہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد۔انور شاہ پانی گرم کر کے لایا اور جب میں نے غسل کر کے کپڑے بدلے تو محسوس ہوا جیسے کسی جنگل بیابان میں ایک عمر تک بھٹکنے کے بعد سرسبز و شاداب نخلستان میں آ نکلا ہوں۔

سراب' کوئٹہ سے کہیں سرد ہے۔میں کمبل اوڑھ باہر لان میں جا بیٹھا۔ہر طرف خوبصورت پھولوں کی کیاریاں نہایت نفاست سے کاٹی گئی تھیں۔سرخ' پیلے' گلابی' سفید اور عنابی گلاب کے پھول ہوا میں مستانہ وار لہرا رہے تھے۔سبز گھاس اس خوبصورتی سے کاٹی گئی تھی کہ مخمل کی دبیز چادر معلوم ہوتی تھی۔چاروں طرف سرخ انار کے پھولوں نے ماحول میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ایک ویرانے میں یہ لالہ زار اور بہار کا سامان دیکھ کر کچھ ایسی فرحت محسوس ہوئی کہ راستے کی تمام کوفت بھول گیا۔

تین سیٹ پر مشتمل ریسٹ ہاؤس نہایت خوبصورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔فوم کشن کے صوفہ سیٹ' سپرنگ دار پلنگ اور خوبصورت کشیدہ کاری والے پردے محکمانہ نفاست اور امارت کے صاف آئینہ دار تھے۔میرے نزدیک ایسے خوبصورت بنگلے پر گینگ ہٹ یا بی اینڈ آر ہٹ کی تہمت لگانا گناہ کبیرہ سے کم نہیں۔کریدنے پر معلوم ہوا کہ یہ حکمت عملی اس نقطہ نظر سے اختیار کی گئی ہے کہ اگر ڈاک بنگلہ یا ریسٹ ہاؤس لکھ دیا جائے تو کہیں ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن اس پر قابض نہ ہو جائے۔سراب سے دو سڑکیں وی (V) کی شکل بناتی ہوئی خضدار اور مکران جاتی ہیں۔بائیں ہاتھ والی سڑک وڈھ اور بیلا کے راستے ہوتی ہوئی کراچی جا نکلتی ہے۔آج کل آر سی ڈی شاہراہ تعمیر ہونے سے اس علاقے کے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔نہایت کشادہ' ہموار اور حتی الامکان بغیر موڑ کے پختہ سڑک تعمیر ہو رہی ہے۔دوسری سڑک ناگ اور بسیمہ سے ہوتی ہوئی مکران جا نکلتی ہے۔

لان میں بیٹھے بیٹھے شام کے سائے بڑھنے لگے تو انور شاہ چائے بنا کر لے آیا... وہ اپنے رویے پر کچھ نادم سا لگتا تھا اور مجھے بھی وقتی ابال پر تاسف ہو رہا تھا' چنانچہ نگاہوں نگاہوں میں ہمارے درمیان شریفانہ سمجھوتہ ہو گیا۔جب وہ چائے کی ٹرے رکھ کر مڑا تو میں نے کہا" شاہ بادشاہ"

جی۔

یار کوئی گپ شپ سناؤ۔وہ میرے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔

تمہارے کتنے بچے ہیں؟ میں نے بات شروع کی۔

آٹھ بچے ہیں۔

آٹھ بچے! میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

جی ہاں! میں نے دو شادیاں کی ہیں۔

تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟

ڈیڑھ سو روپیہ۔

تو کیا اس تنخواہ میں تم دو بیویوں کو خوش رکھ سکتے ہیں؟ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

صاحب! مولا کا کرم ہے۔ صاحب لوگ کچھ نہ کچھ بخشیش دے جاتے ہیں' پھر اگر کوئی ٹھیکیدار آ جائے تو وارے نیارے ہیں۔

وہ اب کچھ کھلنے لگا تھا۔ گھر کا کھانا' بھی ادھر ہی سے نکل آتا ہے' نہیں تو کچھ دال وال بگھار لیتا ہوں۔

تم کتنے عرصے سے یہاں ہو؟ میں نے پوچھا۔

جب سردار نوروز خاں نے جھگڑا کیا تھا تو میں یہاں آیا تھا۔

سردار نوروز خاں کون تھا؟

بلوچ سردار تھا جس نے حکومت سے ٹکر لی تھی۔ صاحب! وہ دن خوب تھے۔ انور شاہ کی اکلوتی آنکھ میں حریصانہ چمک پیدا ہوئی۔ ہر روز فوجی گاڑیوں کا قافلہ خضدار کی طرف جاتا تھا۔ ریسٹ ہاؤ فوجی افسروں سے بھرا رہتا تھا۔ کھانا پکاتے پکاتے میرے ہاتھ دکھنے لگتے پھر کبھی کبھار کوئی فوجی ہوائی جہاز بھی بھوں' کر کے گزر جاتا۔ لیکن صاحب! یہ بلوچ لوگ کچھ بڑے سخت جان واقع ہوئے ہیں انور شاہ گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

انور شاہ شاید کھل کر بات نہیں کر رہا تھا' کیونکہ میں بھی تو آخر اسی نظام کا حقیر کل پرزہ تھا جسے یہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ نوروز خاں نے بغاوت کیوں کی تھی... سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اسے سزا کیوں ملی تھی... غور طلب بات اس عہد کی ہے جس کا تقدس پامال ہوا تھا... آخر دودا خاں زرکزئی کو کس لیے قرآن شریف دے کر پہاڑ پر بھیجا گیا تھا... دودا خاں نے قرآن سر پر رکھ کر نوروز خاں سے کہا تھا کہ باغیوں کو عام معافی دے دی جائے گی۔

ایک ذرا سی لغزش بعض دفعہ قومی المیوں کی تمہید بنتی ہے... بلوچ ذہنیت اور بلوچی مزاج کو سمجھنے کے لیے بعض بنیادی حقائق کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ ایک دفعہ جو بات' غلط یا درست' ان کے ذہن میں بیٹھ جائے اس کو دنیا کا کوئی نشتر نہیں نکال سکتا۔ قرآن شریف کے تقدس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کی جھوٹی قسم اٹھا لے تو اس کو بلوچ معاشرے میں کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ جہاں کہیں وہ جائے گا یہ قرآنی ہے کہہ کر لوگ منہ پھیر لیں گے... مجھے ایسے محسوس ہوا کہ ابھی میں سگریٹ

جلانے کے لیے دیا سلائی کو ماچس پر رگڑوں گا' روشنی کا مدھم سا شرارہ پھوٹے گا' پھر کسی کمین گاہ سے کوئی آتشیں شعلہ میری طرف لپکے گا اور میں اس عالم رنگ و بو سے دور فضائے بسیط کی لامحدود بلندیوں سے ہمکنار ہو جاؤں گا۔

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

صبح میں نے انور شاہ کو بل لانے کے لیے کہا۔ انور شاہ غالباً یہ کلمات سننے کا پہلے ہی سے منتظر تھا۔ اس نے جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈالا' کھٹ سے بل نکال کر پلیٹ میں رکھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں پلیٹ تھام کر اپنے جسم کو تھوڑا سا خم دیتے ہوئے اس طرح پیش کیا جیسے بل نہیں' نذرانہ دل پیش کر رہا ہو.... جس کاغذ کے ٹکڑے کو میں نے حقیر سمجھ کر اٹھایا وہ تو میری جیب کی طرف بڑھتا ہوا تیر نکلا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ پنجاب کے سب شیز انوں' سندھ کے کل میخانوں کا رس نچوڑ کر پلیٹ میں ڈال دیا گیا ہو۔ پتہ نہیں یہ میرے تصور کا کمال تھا یا اس بل کا جلال کہ مجھے اپنے لرزیدہ ہاتھوں میں تھی وہ پلیٹ جلترنگ کی طرح بجتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے ایک ہاتھ سے پلیٹ کو پکڑا' دوسرے ہاتھ سے دل کو تھاما اور پھر کچھ اس طرح رحم طلب نگاہوں سے انور شاہ کی طرف دیکھا جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کے مسافر ناخدا کو دیکھتے ہیں.... انور شاہ' جس کے حرص کے سمندر میں کئی سفینے ڈوب چکے تھے' بڑا افسر شناس تھا۔ میری پریشانی سے حظ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ صاحب! غالباً آپ پر سفر کی طوالت کا خوف سوار ہے۔ ابھی تو آپ ماشاء اللہ جوان ہیں۔ ہمت سے کام لیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا' پھر اس کی شریر نگاہ میرے حقیر جسم سے پھسلتی ہوئی کیبر بل پر جا ٹکی اور پھر وہیں جم گئی... خود کردہ را علاجے نیست۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ انور شاہ نے تو پہلے دن ہی ہماری حیثیت کا تعین کر دیا تھا۔ اب اسے خدا پرستی کی تلقین کرنا عبث تھا' کیونکہ اگر ہمیں جان و دل عزیز ہوتے تو اس کے ریسٹ ہاؤس میں آتے ہی کیوں۔ دس بجے کے قریب کانوائی چلی۔ اب کے مٹی کچھ کم اڑی۔ سڑک اگرچہ کچی تھی' لیکن پتھریلی تھی۔ ہر طرف وہی جلے سڑے پتھر' خشک پہاڑ' کوسوں تک کوئی درخت نظر نہ آتا تھا کئی گھنٹوں کے صبر آزما سفر کے بعد گاڑیاں راجہ پاس پہنچیں۔ راجہ پاس.... دو دشوار گزار پہاڑوں کو ایک سڑک کے ذریعے منسلک کیا گیا ہے۔ راجہ احمد خاں کمشنر قلات نے اس کو اپنی شبانہ روز محنت سے بنوایا تھا اور انہی کے نام پر مشہور ہے۔ یہ جگہ دو قافلوں کا سنگم ہے جہاں سے قافلے کا باقاعدہ ہینڈنگ اوور ٹیکنگ اوور ہوتا ہے۔ سراب والی کانوائی بسیمہ کے مسافروں کو اور بسیمہ والی گارد سراب کے مسافروں کو لے کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ یہاں سے نسبتاً زیادہ دشوار گزار پہاڑوں کا عمودی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور ہر سو گز کے بعد اچانک اندھے موڑ آتے ہیں۔ جان محمد مجھے بتلاتا جاتا تھا کہ صاحب یہاں پر فلاں سال اتنے افسروں کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا اور اس جگہ اتنے اہلکار کام

آئے۔ بسمیہ سے ناگ تک راستہ نسبتاً ہموار تھا اور باوجود کچی سڑک ہونے کے گاڑیاں خاصی رفتار سے چل رہی تھیں۔ راستے بھر وہی لق ودق میدان' حد نگاہ تک ویرانی اور بے سروسامانی نظر آئیں۔ کہیں بلوچ قبیلے کے لوگ بھیڑ بکریوں کو ہانکتے ہوئے نظر آئے۔ اس علاقے کی وسعت اور آبادی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بلوچستان کا رقبہ پنجاب اور سندھ کے کل رقبے کے برابر ہے لیکن پورے صوبے کی آبادی لاہور شہر سے بھی کم ہے۔ ایک عام بلوچ کے شب وروز' ایک بندوق' ستوؤں کی پوٹلی اور پانی کی چھاگل پر مشتمل ہیں۔ قلات ضلع میں سخت سردی کی وجہ سے اکثر آبادی موسم سرما میں نقل مکانی کر جاتی ہے۔ ذریعہ آبپاشی محدود ہونے کی وجہ سے کھیتی باڑی بہت کم ہے۔ قبیلے کے سردار کی گزراوقات بجار پر ہوتی ہے۔ بجار ایک رسم ہے جس کی رو سے قبیلے کا ہر خاندان' مال میں سے اپنی چند بھیڑیں بطور نذرانہ سردار کو پیش کرتا ہے۔

بسمیہ

جب قافلہ بسمیہ پہنچا تو دن کے دو بج چکے تھے۔ راستے میں زنجیر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ جان محمد میری پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔ رات یہاں قیام کرنا پڑے گا' کیونکہ کل جو کانوائی خاران سے آئے گی' وہ ہمیں لے کر ناگ جائے گی۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جو شیطان اور گہرے سمندر کے درمیان پھنس گیا ہو... تو گویا رات ہمیں یہاں گزارنا ہوگی؟ میں نے جھجکتے ہوئے مزید تسلی کی۔

صاحب! رات ہی تو ہے کٹ جائے گی۔ جان محمد کہنے لگا۔ آپ فکر نہ کریں یہاں بھی ایک ریسٹ ہاؤس ہے۔ اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ رات بالفرض کٹ بھی جاتی تو کسی گلرنگ سویرے کی تمنا بے سود تھی۔ یہاں بھی کوئی انور شاہ کا بھائی ہوگا جو چرب زبانی میں لاثانی ہوگا اور جس کا بل دیکھ کر پتا پانی ہو جائے گا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمیں آج ہی سفر کی اجازت مل جائے؟ میں نے پوچھا۔

ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا جان محمد نے کسی پیشہ ور نجومی کی طرح سکہ بند جواب دیا...

تو پھر جلدی سے وہ چراغ لاؤ جسے رگڑنے سے دیو آ کر زنجیر کھول دے۔

جان محمد ہنس کر کہنے لگا۔ کسی چراغ کی ضرورت نہیں' دیو اندر دفتر میں موجود ہے۔ آپ بات کریں۔

جان محمد کا اشارہ اس نائب تحصیلدار کی طرف تھا جو افسر انچارج تھا اور جس کا دفتر سڑک کے دائیں ہاتھ قریب سو گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے کہا "آؤ! بات کر دیکھتے ہیں۔" جان محمد کی بات سو فیصد درست تھی۔ جب ہم چق اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک دیو ہیکل شخص میز پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ کرسی اس کے وزن سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے شراب کے پیپے پر کسی

نے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی ہیں... ہماری مداخلت بیجا غالباً اسے ناگوار گزری تھی۔ اس نے بڑی خشونت سے ہماری طرف دیکھا۔ پیشتر اس کے کہ رم کے جھبکے اس بیرل سے اڑ کر ہم تک پہنچتے' جان محمد نے میرا تعارف کرا دیا۔ اس اچانک انکشاف پر قدرے وہ گھبرایا' لیکن جب اسے پتہ چلا کہ میں انڈر ٹریننگ ہوں تو اپنے بے جا گھبرانے پر تھوڑا سا شرمایا۔ کہنے لگا: "صاحب! آپ تو خود ماشاء اللہ عقلمند ہیں۔ میں آپ کو بغیر گارڈ کے سفر کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔ اگر راستے میں کچھ ہو گیا تو آپ سے کوئی کیا پوچھے گا' میں دھر لیا جاؤں گا۔ آخر نوکری کا معاملہ ہے۔ کل جب کانوائی چلے گی تو انشاء اللہ سب سے پہلے آپ کو روانہ کروں گا۔" مکتب میں ہمارے استاد بتایا کرتے تھے کہ پاکستانی مسلمان عموماً انشاء اللہ کا ورد اس وقت کرتا ہے جب اسے کوئی کام کرنا مقصود نہیں ہوتا اور مشاء اللہ اس وقت دہراتا ہے جب وہ دوسرے کو چغد سمجھتا ہے... انشاء اللہ اور ماشاء اللہ کی تکرار کے ساتھ ساتھ وہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھتا بھی جاتا تھا... جب گردان ختم ہوئی تو اس نے کاغذ تہہ کر کے جان محمد کو تھما دیا... مزید بحث فضول تھی۔ ہم اٹھ کر باہر گئے... ریسٹ ہاؤس وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر تھا' چنانچہ سامان اٹھایا اور چل پڑے۔ راستے میں میں نے جان محمد سے پوچھا کہ اس نے کاغذ پر کیا لکھا ہے؟

کوئی خاص بات نہیں تھی۔ جان محمد ہنس کر کہنے لگا... "تحصیلدار صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ ٹرک پر خالص دیسی گھی کا جو ٹین پڑا ہے' وہ ان کے ڈیرے پر پہنچا دیا جائے۔

یہ ریسٹ ہاؤس سراب والے ریسٹ ہاؤس کی سی سج دھج تو نہیں رکھتا تھا' لیکن اتنا گیا گزرا بھی نہ تھا کہ سرائے کا گمان ہوتا... چونکہ کھانا ہم بطور حفظ ماتقدم مقامی بھٹیارے سے کھا آئے تھے' اس لیے اندازہ نہ ہو سکا کہ بسمیہ کا چوکیدار بھی اتنا ہی ستم شعار نکلے گا یا کچھ کم... رات کسی طرح کٹ گئی۔ صبح اٹھ کر جلد ہی تیار ہو گیا۔ بسمیہ' لیویز اور گشتی پولیس کا سب ہیڈ کوارٹر ہے۔ چھوٹا سا گاؤں ہے جس کی آبادی مشکل سے چند سو افراد پر مشتمل ہو گی... ہر چند کہ یہاں کوئی خاص ہریالی نہ تھی لیکن یہ بستی اتنی نمیالی بھی نہ تھی' شہتوت اور بکائن کے اکا دکا درخت سنتریوں کی طرح جگہ جگہ تنے کھڑے تھے۔ ساتھ ہی شفاف پانی کا ایک چھوٹا سا نالہ بہہ رہا تھا۔

جب گیٹ پر پہنچے تو وہی مانوس سا نقشہ نظر آیا۔ وہی بے کیف یک رنگی تمام ماحول پر چھائی ہوئی تھی... بندوقوں کی کھٹ کھٹ' سپاہیوں کی آپس میں گٹ پٹ' مسافروں کے تھکے تھکے' بجھے بجھے چہرے' کھوکھا نما ہوٹلوں میں بھاپ اڑاتی ہوئی کیتلیاں اور سڑپ سڑپ چائے پیتے ہوئے لوگ۔

ناگ پہنچتے پہنچتے شام کے سائے ڈھل آئے تھے۔ جونہی ہم نے قصبے کی بغل میں بہتی ہوئی ندی عبور کی' جان محمد نے میری طرف گردن پھیر کر دیکھا... "رات یہاں بسر ہوگی؟" میں نے اس کے بولنے سے پہلے ہی اس کے دل کا چور پکڑ لیا... کیا میں نے کچھ کہا ہے؟ جان محمد نے احتجاج کیا... "اس کی ضرورت نہیں تھی" میں نے کہا۔ بعض تحریریں انسان کے چہرے پر لکھی ہوتی ہیں۔" "ٹرک کا رخ ریسٹ ہاؤس کی طرف موڑ دو' کیونکہ جسم کے ساتھ ساتھ اب تو روح بھی ہچکولے کھا رہی ہے۔" جان محمد نے دائیں ہاتھ موڑ کاٹ کے ٹرک کا رخ ریسٹ ہاؤس کی طرف کر دیا۔

ناگ اور بسمیہ میں کوئی فرق تھا تو صرف اتنا اگر بسمیہ میں شہتوت اور بکائن کے درختوں نے چھتریاں تان رکھی تھیں تو ناگ میں اناروں نے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ اگر وہاں شفاف پانی کا نالہ مجسم ناز تھا تو یہاں بھی ندی کا بہتا ہوا پانی سراپا ساز تھا۔ انار کے درختوں پر سرخ پھول کھل چکے تھے جنہوں نے تمام ماحول کو آتشیں سا بنا رکھا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کھلا تھا' لیکن چوکیدار بازار گیا ہوا تھا۔ سامان کمرے میں رکھا اور غربی کھڑکی کھول دی۔ سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں جواب شفق آمیز ہو رہی تھیں اور ندی کے شفاف سینے میں جذب ہو رہی تھیں۔ پانی کے پتھروں سے ٹکرانے سے موسیقی کی ہلکی سی لہر اٹھ رہی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شرمائی شرمائی' لجائی لجائی دوشیزہ' اپنی تمام حیا کو چہرے پر سمائے' دل کی دھڑکنوں کو تھامے' زمانے سے چھپتی چھپاتی' نپے تلے قدم اٹھاتی اپنے محبوب سے ملنے جا رہی ہو۔

میں اس ملکوتی ماحول میں غرق تھا کہ دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ غالباً چوکیدار آ گیا تھا۔ چوکیدار کا یہ دخل در معقولات مجھے قطعاً اچھا نہ لگا۔ میں نے غصے میں پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی چوکیدار نہ تھا... غالباً مست ہوا کا جھونکا تھا جو دروازے سے آ ٹکرایا تھا یا بادِ شمیم تھی جو شام کے دھندلکوں میں ہلکورے لے رہی تھی یا پھر انار کی کوئی ڈال تھی جو لچک کر دہلیز پر آ گئی تھی... یا پھر میری نظروں کے سامنے وہ نقطۂ اتصال ابھرا تھا جہاں بنارس کی صبح' اودھ کی شام سے ہمکلام ہوئی تھی۔ رنگ اور نور کا ایک سیلاب تھا جو ہوش و حواس کو بہائے چلا جا رہا تھا... "کون ہو تم؟" میں مجسم سوال تھا... "اپنے بابا کی بیٹی ہوں" وہ اپنے جوڑے میں انار کے پھول ٹانکتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولی۔ "کیا چوکیداروں کی بیٹیاں ایسی ہوتی ہیں؟" میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ رنگت ایسی صبیح کہ اگر رخ سے زلفیں ہٹا دے تو پہاڑوں کی برف پر بھی حرف آئے۔ آواز میں وہ سحر کہ محض اس کھنک ہی سے ہر ذرہ کائنات تڑپ اٹھے۔ آنکھوں میں وہ جاذبیت کہ اگر نظر بھر کر دیکھ لے تو کشش ثقل بھی لرزے میں آ جائے۔

مٹی کا زرد رو چراغ کس نے جلایا تھا؟ پھولوں کا سرخ گلدستہ میز پر کس نے سجایا تھا؟ اس غریب کا بستر کس دست حنائی نے

بچھایا تھا؟ مجھے کچھ ہوش نہ تھا... جیب تو انور شاہ اور اس کے بھائی بندوں نے پہلے ہی خالی کر دی تھی اب صرف ایک نقد دل رہ گیا تھا' سو وہ بھی لٹتا ہوا نظر آیا۔

رات کیسے کٹی' اس کا اندازہ ہجر میں شب گزیدہ شاعر کو بھی نہیں ہو سکتا۔ ہر کروٹ میں لاکھ کرب تھے' ہر دھڑکن میں سینکڑوں درد تھے... ان گنت راتیں پہلے بھی جاگ کر گزاری تھیں... لیکن خواب اور بے خوابی کی یہ کشاکش پہلے تو کبھی نہ دیکھی تھی... بستر پر سونے کا تو محض ایک بہانہ تھا' ورنہ طائر جاں کا کہیں اور ہی ٹھکانہ تھا۔

پتہ نہیں کس وقت آنکھ لگی۔ کوئی اوٹ پٹانگ سا خواب نظر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عالم ارواح میں ہوں... یوم حساب ہے۔ ہر چند کہ میرے گناہوں کی فہرست خاصی طویل تھی' لیکن یہ مشیت رب جلیل تھی کہ اسے جنت میں بھیج دیا جائے' کیونکہ یہ اپنے حصے کی سزا (بلوچستان میں) کاٹ آیا ہے۔ فرشتے ایک لمحے کے لیے رکے' بالکل اس طرح جیسے ایمپائر کے فیصلے پر عدم اطمینان ظاہر کرتے ہوئے بیٹسمین تھوڑی دیر کے لیے کریز پر احتجاج کرتا ہے... چونکہ حکم عدولی کا مزہ پہلے چکھ چکے تھے' اس لیے دوسرے لمحے انہوں نے مجھے اٹھا کر جنت میں پھینک دیا... حوران بہشت نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جس طرح فسٹ ایئر کے طالب علم کو کالج کے پرانے خلیفے آن گھیرتے ہیں... کسی نے مچل کر کہا۔ ''حضور! جام سلسبیل لا دوں؟'' تو کسی نے سنبھل کر اصرار کیا ''قبلہ! تھوڑے سے پاؤں دبا دوں؟''....... کبھی جام لیے کوئی اخلاقی ہوئی ناری آئی.... تو کسی نے کہا اب جگر تھام کہ میری باری آئی ... لیکن میں تھا کہ رنج والم کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ کبھی حسرت سے آسمان کو تکتا' کبھی حیرت سے ریشمی گھاس پر انگلیاں چٹختا۔ ہر چند کہ نالہ وشیون سختی سے ممنوع تھا' لیکن میں موقع محل دیکھ کر ایک آدھ دبی سی آہ بھر لیتا... سب حیران تھیں۔ چند ایک پریشان بھی تھیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر ایک تجربہ کار حور نے جو ان میں سب سے زیادہ سمجھدار تھی اور خاصی ہشیار بھی' محرم راز ہونے کا سوانگ رچایا۔ پہلے تھوڑی سی آپ روئی' پھر مجھے خوب رلایا... کہنے لگی ''حضور! آخر آپ اس قدر کھوئے کھوئے کیوں ہیں؟ کیا ہم سے کوئی خطا ہوئی ہے؟ آخر وہ کون سا روگ ہے جو آپ نے یہاں بھی پال لیا ہے۔'' ایسا مخلص پرسان حال بھلا کہاں سے ملتا' ضبط واحتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا... میں نے اس سے دست بستہ عرض کی ''حور جی! میرا ایک کام کر دو!'' ہنس کر کہنے لگی ''یعنی مے خانہ میرے نام کر دو'' میں نے کہا ''نہیں' یہ تو مشہور قوالی ہے۔ اس خاکسار کا سوال کچھ اور ہے'' بولی ''زہے نصیب۔ ارشاد فرمایئے!'' ''کیا چند لمحوں کے لیے'' میں نے رندھا ہوا گلا صاف کرتے ہوئے کہا ''صرف چند لمحوں کے لیے چوکیدار کی بیٹی کو یہاں لا سکتی ہو؟ ... غالباً ایک قہقہہ بلند ہوا جو اسی فتنہ ساز کا تھا... پھر قہقہوں کا ایک طوفان سا اٹھا ''لے جاؤ' لے جاؤ' اس مخبوط الحواس کو۔ اسے جنت کی

ہوا راس نہیں آئی۔ ایک کونے سے آواز آئی... پھر ایک کرخت ہاتھ میرے جسم پر پڑا۔ میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا... جان محمد کہہ رہا تھا۔ صاحب! فوراً تیار ہو جائیں۔ کانوائی نکلنے والی ہے۔

پنجگور

ناگ سے پنجگور اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں کوئی قابل ذکر مقام نہیں ہے۔ تمام سفر خاموشی سے گزرا۔ دراصل گزشتہ چندروز کے سفر نے اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پنجگور، مکران کا پہلا سب ڈویژن ہے۔ میں نے ریسٹ ہاؤس میں کھڑے ہو کر شہر کا سرسری جائزہ لیا۔ حد نگاہ تک پس منظر میں کھجوروں کے درخت نظر آ رہے تھے اور سبزے کے اس حسین سمندر میں تمام شہر کشتی نوح کی طرح ڈوبتا ہوا نظر آیا۔ سورج غروب ہونے میں چند لمحے باقی تھے۔ شفق کی سرخی سبزے کے سمندر میں جذب ہو کر عجیب قوس قزح پیدا کر رہی تھی۔ تمام شہر خاموش تھا۔ ماحول پر مکمل سکوت طاری تھا۔ میرے ذہن کو ایک دھچکا سا لگا۔ احساس تنہائی اور محرومی کا زہر رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوا۔ بارہ سو میل کے سفر سے سوچنے کی قوت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے جانے کیسے بجلی کی طرح ایک خیال ذہن میں کوندا ''یہ زندگی رائیگاں گئی ہے!'' لیکن یہ خیال بہت مختصر اور ناپائیدار تھا۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ دراصل زندگی کا آغاز ہی اس مقام سے ہوا۔ کوشش ناتمام اور نامساعد حالات میں زندہ رہنے کا عزم!

میرے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب فقیر محمد چوکیدار نے آکر کہا کہ نہانے کے لیے پانی رکھ دیا ہے۔ نہا کر کپڑے بدلے تو طبیعت خاصی بشاش ہو چکی تھی۔ چائے کی پیالی پی اور سیر کے لیے باہر چلا گیا۔ واپسی پر پتہ چلا کہ شام کے کھانے پر ناظم الحکومت نے یاد فرمایا ہے۔ کچھ دیر بعد ان کی جیپ آ گئی اور میں ان سے ملنے کے لیے ڈیرے پر چلا گیا۔

کہدا جان محمد صاحب سے مصافحہ کیا تو انہوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے میری طرف غور سے دیکھا۔ میرے سراپے کا چند لمحوں تک بنظر غائر جائزہ لیا اور پھر نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ برخوردار تمہیں کس جرم کی پاداش میں یہاں بھیجا گیا ہے؟

''میں یہاں ٹریننگ کے لیے آیا ہوں'' میں نے بات کو مختصر کرنا چاہا۔

Training in Patience کہدا صاحب زیر لب مسکرائے۔ میں بھی مسکرا دیا۔ کہدا صاحب میری توقع کے خلاف نہایت عالی ظرف، بذلہ سنج، مہمان نواز اور خوش اخلاق نکلے اور جلد ہی بے تکلف ہو گئے۔ کھانے کے دوران جب میں نے تلی ہوئی مچھلی کو بغور دیکھا تو میری حیرت کو بھانپتے ہوئے کہنے لگے ''کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے کہا "پانی کی مچھلی تو اکثر دیکھی ہے' زندگی میں پہلی بار خشکی کی مچھلی کھا رہا ہوں۔" کہدا صاحب مسکرا کر کہنے لگے۔ اس علاقے کی ویرانی پر نہ جاؤ' یہاں کہدا جان ناظم ہے۔ دنیا کی ہر چیز یہاں حسب خواہش مل سکتی ہے" اور واقعی تین سو پچاس میل سے خشکی کے راستے جبکہ کوئی باقاعدہ ٹرانسپورٹ نہ چلتی ہو گوادر سے کہدا صاحب کے لیے مچھلی کا آنا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ کہدا صاحب رند قبیلے کے سربراہ تھے اور ریاست قلات کے زمانے میں ملازم ہوئے۔ جب ون یونٹ بنا تو حکومت کی مصلحت بینی نے قلات کے تمام سول ملازمین کو پی سی ایس کاڈر میں مدغم کر لیا۔ چنانچہ کہدا صاحب اپنا روایتی ٹائٹل چھوڑ کر سرکاری اصطلاح میں ناظم سے ایس ڈی ایم بن گئے۔ کہدا صاحب کی تعلیم' گو مڈل اور میٹرک کی سرحدوں میں بھٹک رہی تھی لیکن بڑے اعتماد سے انگریزی بولتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کبھی کسی شخص کو ان کی تصحیح کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ اس کا راز ان کی بھاری بھرکم شخصیت میں مضمر تھا۔ کہنے لگے "تمہیں میرے پاس بطور ٹریٹی کام کرنا ہوگا۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے' میں اس سے اسی قدر بے بہرہ ہوں جتنا کہ تم نابلد ہو۔ ہاں' البتہ آئی ول میک یو اے گڈ ایڈمنسٹریٹر (میں تمہیں اچھا منتظم بنا دوں گا) جہاں تک کہدا صاحب کی انتظامی صلاحیتوں کا تعلق تھا' اس کا معترف تو ایک جہان تھا۔ آپ ایڈمنسٹریشن کو سائنس تو نہ بنا سکے لیکن اس ضمن میں موصوف جن بلندیوں تک پہنچ چکے تھے' اتنی اونچی جست لگانا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہ تھا۔ دروغ برگردن راوی' کہتے ہیں کہ جب ایوب خان مرحوم نے قوم کو جمہوریت کی ابجد سے روشناس کرنے کا عزم کیا اور اس سلسلے میں ان کے ایک گوہر یکتا نے بی ڈی نظام وضع کر کے تاریخ کو ان کی دہلیز پہ لاکھڑا کیا تو قصر صدارت سے زیر بار قوم کو مزید زیر بار کرنے کے لیے الیکشن کرانے کا اعلان ہوا۔ یہ اعلان کہدا صاحب کی خداداد صلاحیتوں کے لیے ایک کھلا چیلنج تھا' چنانچہ الیکشن سے چند دن قبل آپ نے اپنے علاقے کے تمام بی ڈی ممبروں کو کھانے پر مدعو کیا۔ ہر چند کہ کہدا صاحب کی مہمان نوازی کے چرچے زبان زد خاص و عام تھے لیکن مہمان نوازی کے بھی اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں' کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ جمہوریت کے طالب علموں کے لیے اتنی بڑی دعوت کا اہتمام کچھ عجیب سی بات تھی' اس لیے ممبروں کو اچنبھا تو ہوا لیکن یہ دعوت کسی ایرے غیرے نے نہیں کی تھی' بلکہ حاکم وقت کی طرف سے بلاوا آیا تھا' اس لیے انہوں نے ہر وسوسے کو ذہن کے زندان سے نکال باہر کیا اور دعوت میں جا شرکت کی۔

موسم اتفاقاً مہربان تھا۔ کھانا نہایت لذیذ تھا اور کہدا صاحب کا دبدبہ اور وقار' حلم خوش مزاجی میں ڈھل رہا تھا۔ کھانے کے بعد پھل آئے۔ پھلوں کے بعد قہوے کا دور چلا۔ اس کے بعد غالباً کچھ سرور آنا تھا کہ کہدا صاحب نے جھٹ سے مدعوئین سے حساب کا ایک سوال پوچھ ڈالا۔ غالباً سوال اتنا مشکل نہیں تھا جتنی دشواری اس کے جواب دینے میں آئی۔ میں پوچھتا ہوں سال میں دن کتنے

ہوتے ہیں؟ کہدا صاحب نے گلا صاف کرتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا۔ اس دفعہ کہدا صاحب کا لہجہ گھمبیر تھا کیونکہ پہلی مرتبہ جب انہوں نے یہ سوال کیا تھا تو حاضرین نے اس اسے ان کی تفنن طبع پر محمول کرتے ہوئے ''ہاہا' ہوہو'' میں دبا دیا تھا۔ ممبروں نے کہدا صاحب کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر مزاح کی کوئی رمق تک نہ تھی۔ لیویز کے سپاہیوں کو دیکھا جو دروازوں پر ایستادہ تھے اور آخر میں مکان کی دیواروں کو گھورا جو سکڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں تو سر جوڑ کر بیٹھ گئے... ''ہمارے خیال میں سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں۔'' آخر جواب دینے ہی میں انہیں عافیت نظر آئی۔ ''تو بس سوچ لو!'' کہدا صاحب کڑکے... ''تین سو چونسٹھ دن میرے اور ایک دن آپ کا ہے۔ اگر ووٹ دینے میں کسی شخص نے ذرا سی بھی غلطی کی تو...! میرا مطلب آپ سمجھتے ہیں نا'' کہدا صاحب نے فقرے کو ادھورا چھوڑ دیا۔ ''جی بالکل سمجھتے ہیں۔ خائف ممبر یک آواز بول پڑے اور اس طرح ایک دقیق مسئلہ انتظامی طریقے سے حل ہو گیا.... جہاں تم قانون سے نا آشنائی کا تعلق تھا کہدا صاحب اکیلے مسافر نہ تھے۔ اس کشتی میں سارے افسر سوار تھے۔ کہتے ہیں کہ جب پہلا مارشل لاء لگا تو خاران کے ایک ایس ڈی ایم صاحب نے اپنی نو سو مثلوں کو بیک نوک قلم یہ لکھ کر داخل دفتر کر دیا کہ ملک میں مارشل لاء لگ چکا ہے' عام قانون معطل ہو چکا ہے' اس لیے اس کا اطلاق اب مقدمہ ہذا پر نہیں ہو سکتا' اس لیے مثل بارتیب و تکمیل داخل دفتر ہووے۔

اسی طرح ایک اور ایس ڈی ایم صاحب نے بحث کے اختتام پر جب ملزم کو پانچ سال قید بامشقت کا حکم سنایا تو ملزم نے جھٹ سے اپیل کرنے کی نیت سے نقل فیصلہ کی درخواست دے دی۔ موصوف نے تاسف بھری نظروں سے ملزم کو دیکھا اور کہنے لگے۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے' اپنے آدمی ہو کر ہمارے خلاف اپیل کرتے ہو۔ میں نے تو پہلے ہی تمہارے ساتھ بڑی رعایت کی ہے۔'' رات گئے تک کہدا صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔ پنجاب کے حالات پوچھتے رہے اور پھر مکران کے ماحول اور لوگوں پر ایک مختصر سا لیکچر دیا۔ جب نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو میں نے اجازت چاہی۔ واپس ریسٹ ہاؤس پہنچا تو چوکیدار نے میرا بستر باہر لگا دیا تھا۔ فضا میں خنکی آ چکی تھی۔ پنجگور کی راتیں اکثر خوشگوار ہوا کرتی ہیں اور یہی مکران ضلع کی خصوصیت ہے۔ ہر سب ڈویژن کی آب و ہوا مختلف ہے۔ پنجگور سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں معتدل ہے۔ تربت سب ڈویژن نہایت گرم ہے۔ درجہ حرارت بسا اوقات ۱۲۰ درجے تک چلا جاتا ہے۔ بلوچی میں ایک مثل مشہور ہے کہ اگر تربت میں انڈا ابالنا ہو تو اس کو کھلی دھوپ میں رکھ دیں' خود بخود ابل جائے گا۔ ساحلی علاقوں کی آب و ہوا معتدل ہے۔ دراصل مکران کی ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک لمبائی چھ سو میل سے کچھ اوپر ہی بیٹھتی ہے۔ رقبے کے لحاظ سے اگر ہالینڈ اور اسرائیل کی ریاستوں کو ملا دیا جائے تو پھر بھی مکران کا

رقبہ کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ تمام لوگ بلوچی زبان بولتے ہیں جو فارسی کی مسخ شدہ شکل ہے۔ ویسے تو مکران میں کئی قبائل آباد ہیں لیکن نسلی اعتبار سے ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک بلوچ جن کا رنگ تانبے کی طرح دمکتا ہے' دوسرے غلام ہیں یہ وہ کالے کالے' چھوٹی آنکھوں اور موٹے ہونٹوں والے مکرانی ہیں جن کی ٹکر سے کراچی کے دبنے بھی پناہ مانگتے ہیں اور تیسری نسل درزادوں کی ہے جو بلوچوں اور غلاموں کے اختلاف سے معرض وجود میں آئی ہے۔ لسانی اعتبار سے سب بلوچی بولتے ہیں۔ فقہی نقطہ نظر سے مکران کی بیشتر آبادی سنی مسلمان ہے' البتہ تربت کے گردونواح میں ''ذکری'' آباد ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' صدیوں کے باہمی اختلاط اور مختلف لوگوں سے شادی بیاہ کی وجہ سے بلوچ اپنے خدوخال برقرار نہیں رکھ سکے۔ بہر حال' ایک بلوچ کے خدوخال کی اب بھی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ چھوٹی' سیدھی ناک' چمکتی ہوئی صاف کالی آنکھیں' تانبے کی طرح دمکتی ہوئی جلد' درمیانہ قد' دبلا پھرتیلا اور مضبوط جسم اور شانوں تک لمبے بال۔ دیگر نسلوں کے برعکس صفائی پر خاص توجہ دیتے ہیں... بلوچوں کی عادات واطوار کے متعلق کرنل راس رقمطراز ہے:

''مکرانی جب ایک دفعہ عہد کر لیتے ہیں تو پھر اس کو آخر دم تک نبھاتے ہیں۔ ہر چند کہ کسی خاص بہادر اور نڈر نسل سے تعلق نہیں رکھتے' لیکن خطرے کے وقت سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح جم جاتے ہیں۔ اگرچہ خطرات کو مدعو نہیں کرتے' لیکن اپنے اردگرد شیشے کی دیواریں بھی کھڑی نہیں کرتے۔ باہمی خانہ جنگی اور خونریزی سے اکثر اجتناب کرتے ہیں۔ گو قد کاٹھ کے بہت مضبوط نہیں ہیں' لیکن ایک مکرانی کا پانی کی چھاگل اور چاولوں کی پوٹلی کے ساتھ پچاس میل کا روزانہ سفر کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔''

صبح سو کر اٹھا تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ فقیر محمد چائے بنا کر لے آیا۔ جب میں نے پہلا گھونٹ حلق سے اتارا تو ذائقہ مختلف سا پایا۔ میں نے پیالی رکھ دی۔ فقیر محمد میری پریشانی کو بھانپتے ہوئے بولا۔ صاحب! بے تکلف چائے پیجئے' خالص بکری کا دودھ ہے۔'' مجھے متلی سی ہونے لگی لیکن کچھ عرصہ بعد جب طبیعت سلیمانی چائے پینے کی بھی عادی ہوگئی تو مجھے احساس ہوا کہ مکران میں خالص بکری کا دودھ واقعی غنیمت ہے۔ پورے مکران میں گنتی کی چند گائیں ہوں گی اور وہ بھی اس قدر کم دودھ دیتی ہیں کہ سرکاری ملازم تو اس کو پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کسی زمانے میں سنتے تھے کہ بھیڑ بکری کا خالص دودھ مل جاتا تھا لیکن جب سے تہذیب نو نے اپنے کرشمے دکھانے شروع کئے اور اس کی ہلکی سی کرن مکران پہنچی تو یار لوگوں کو اس نعمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا اور اس میں بھی ملاوٹ عام ہوگئی۔

پنجگور سے ہفتے میں دو مرتبہ بس تربت جاتی ہے اور اس بس کے جانے میں دو دن باقی تھے۔ ویسے بھی کہدا صاحب کا اصرار تھا

کہ میں چند دن تک انہیں مہمان نوازی کا موقع ضرور دوں۔ میں نے پوسٹ آفس جا کر واحد ٹیلیفون پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ میرا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے۔ میرے ساتھی ملک غلام مصطفیٰ وہاں پہنچ چکے تھے اور وزیر اعظم ہاؤس پر قابض ہو چکے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ ڈی سی نے یہ بھی بتایا کہ ہم میں سے ایک افسر کو گوادر جانا پڑے گا اور دوسرا پنجگور میں تربیت حاصل کرے گا۔ دفتر والوں کی بے چینی کی وجہ تو میری سمجھ میں نہ آئی' البتہ میں نے دل میں شدید اضطراب محسوس کیا۔ مجھے اپنے اوپر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ چند دن پہلے کیوں نہ چل پڑا۔ ملک صاحب کے خلاف میرا سینہ کدورت سے پھٹا پڑتا تھا۔ غضب خدا کا ایک تو وزیر اعظم کے مکان پر قابض ہو گئے اور پھر میرے پہنچنے سے پہلے ہی گوادر کا سب ڈویژن سنبھال لیں گے۔ وزیر اعظم کا مکان تو خیر خوبصورت ہوگا ہی' لیکن گوادر کے متعلق میرے حسین تصورات نے جو تانے بانے بن رکھے تھے' وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ناریل کے درختوں کے جھنڈ' کھجور کے باغات سے گھرا ہوا ایک عالی شان جزیرہ جس کے ذرے ذرے سے حسن اور رعنائی کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔

الف لیلوی ماحول جہاں ہر روز کوئی نہ کوئی جہاز لنگر انداز ہوتا اور مسافر ساحل سمندر پر کھڑا ہو کے سندباد جہازی کی طرح خوبصورت لمبے لمبے بالوں والی حسین دوشیزاؤں کو کشتیوں سے اترتا چڑھتا دیکھتا۔ اشیائے خورد و نوش کی فراوانی' بدیشی مال کی ارزانی ... قدم قدم پر ولایتی ٹرانسسٹروں سے حسین نغمے پھوٹتے ہوئے سنائی دیتے... اپنی محرومی کا اتنا شدید احساس مجھے کبھی نہ ہوا تھا۔

جب کہدا صاحب نے میرا پژمردہ چہرہ دیکھا تو بولے ''شاہ بادشاہ! خیریت تو ہے؟ ابھی تو پہلا دن بھی نہیں گزارا.... جوان آدمی ہو کر گھبرا گئے۔'' میں پہلے تو ٹال گیا لیکن جب کہدا صاحب کا اصرار تکرار کی حد تک بڑھا تو میں نے ملک صاحب کے خلاف خوب بھڑاس نکالی۔ بجائے اس کے کہ کہدا صاحب میرے ساتھ ہمدردی کرتے... زیر لب مسکرائے اور بولے'' اللہ تعالیٰ بہتر ہی کرے گا۔''

در مدح کھجور

شام کو کہدا صاحب کے ساتھ سیر کو نکلا تو شہر کے باہر چار طرف کھجوروں کا ایک جال سا بنا ہوا نظر آیا۔ کھجوریں درختوں پر لگ چکی تھیں۔ سبز' سرخ' عنابی' گلابی خوشے ہر طرف لٹک رہے تھے۔ ''مکران جیسی کھجور سارے پاکستان' بلکہ ساری دنیا میں نہیں ملتی'' کہدا صاحب نے قصیدہ خوانی شروع کی۔ ''یہاں پر کھجور کی ایک سو ایک قسمیں ہیں۔ سبزو' علینی' آب دنداں کھانے سے مسوڑھے درد نہیں کرتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اگر مضاوتی کھائی جائے تو نیند خوب آتی ہے اور رات کو اگر علینی کے چند دانے استعمال کئے جائیں تو کھانا فوراً ہضم ہو جاتا ہے۔''... بنیادی طور پر آپ مجھے حکیم حاذق نظر آتے ہیں'' میں نے کہدا صاحب کو ٹوکا۔ کہدا

صاحب مسکرائے ''گرمیوں میں کھانے کے لیے اور کھجوریں ہیں۔ سردیوں میں مضاوتی کو علینی کے شیرے میں تیار کیا جاتا ہے اور پھر دنیا کی کوئی ''سویٹ ڈش'' اتنی لذیذ نہیں ہوتی جتنا یہ مرکب ہوتا ہے۔

دراصل کھجور کے متعلق کہدا صاحب کی قصیدہ خوانی کوئی نئی بات نہ تھی۔ کھجور کو مکران میں جو روایتی اہمیت حاصل ہے' اس کا اندازہ اس دلچسپ کہانی سے لگایا جا سکتا ہے جو عام طور پر سنائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مکرانی شومئ قسمت سے ہندوستان گیا اور وہاں خلقت شہر سے بادشاہ وقت کی فیاضی اور سخاوت کے فسانے سنے تو اس نے استفسار کیا کہ آیا بادشاہ اپنی رعایا کو خوراک مہیا کرتا ہے؟ جب اسے بتایا گیا کہ ایسا تو نہیں ہے تو وہ خوب ہنسا اور کہنے لگا کہ یہ کیسا بادشاہ ہے جو اپنی رعایا کو خوراک تک مہیا نہیں کر سکتا۔ پوچھا گیا ایں طنز و تشنیع چہ معنی دار؟ تو اس نے اہل ہند پر یہ راز افشا کیا کہ اس کے ملک میں ایک ایسا حاکم ہے جو تمام مکران کا سال میں چار مہینے دورہ کرتا ہے اور اپنے قیام کے دوران میں نہ صرف تازہ میٹھی خوراک تمام باشندگان کو عطا کرتا ہے بلکہ اونٹ' گھوڑے' گدھے' بھیڑ بکری سبھی اس کے کرم سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اس عالی ظرف کی دریا دلی کے در اس کی رخصتی کے بعد بھی کھلے رہتے ہیں اور جاتے جاتے بھی وہ سب کو اس قدر خوراک دے جاتا ہے جو باشندگان کے لیے سارا سال کافی ہوتی ہے... جب حیران و پریشان لوگوں نے پوچھا کہ اس روئے زمین پر وہ سادر یمین ہے تو اس نے اطمینان سے جواب دیا ہمارا سردار میر امن ہے۔ امن اس موسم کو بولتے ہیں جو جولائی سے شروع ہو کر ستمبر تک رہتا ہے۔

جس طرح پروانے شمع جلتے ہی دیوانہ وار لپکتے ہیں' جس طرح بھنورے پھول کھلتے ہی مستانہ وار بہکتے ہیں جس طرح طیور آمد بہار پر چہکتے ہیں' اسی طرح مکرانی 'امن' شروع ہوتے ہی وطن جانے کی خواہش میں ہمکتے ہیں۔

کھجور ان کی سوچ کا نقطہ آغاز ہے۔ کھجور ان کے شوق کا سحر آفریں ساز ہے۔ کھجور ان کے قلب سے اٹھتی ہوئی آواز ہے۔ کھجور ان کی ہمدم دیرینہ و دمساز ہے۔ کھجور دشت نوردی کا ایک حسین انجام ہے۔ کھجور آبلہ پائی کا بہترین انعام ہے... الغرض' کھجور ہی ان کی صبح ہے اور یہی ان کی شام ہے۔

جب کھجور کا موسم شروع ہوتا ہے تو مکرانی چاہیے دنیا کے کسی خطے میں بھی ہو' اسے اپنے خون میں کھولن سی محسوس ہوتی ہے۔ عورتیں' مرد' بچے' ماہی گیر' کسان سب دیوانہ وار کھجور کے علاقوں کی طرف کوچ کرتے ہیں اور موسم ختم ہونے تک وہیں قیام کرتے ہیں۔

کھجور مکران میں کب آئی' اس کے متعلق مختلف بیان ہیں۔ ہر چند کہ کھجور کا پودا عرب ہی لائے تھے' لیکن تاریخی شواہد اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ زمانہ ماقبل از تاریخ بھی یہ پودا اس علاقے میں پایا جاتا تھا۔ آرائین (Arain) اور سٹریبو Strabo نے

اپنی تصانیف میں کھجور کا ذکر کیا ہے۔ اگر سکندر اعظم کی فوج کو مکران میں کھجور دستیاب نہ ہوتی تو یقیناً بیشتر سپاہ اس علاقے میں نیست و نابود ہو جاتی۔

ویسے تو کھجور تمام مکران میں، جہاں پانی ملتا ہے دستیاب ہے، لیکن کیچ اور پنجگور اعلیٰ قسم کی کھجور پیدا کرنے میں خاصے مشہور ہیں۔ کھجور کو اہل مکران دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (الف) نسبی ا (ب) کروچ۔

نسبی اعلیٰ قسم کی کھجور ہوتی ہے جس کا ذکر کہدا صاحب نے تفصیلاً کیا تھا۔ اسے کھانے کا شرف ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتا۔ کروچ سے پیدا شدہ کھجوروں کو بالخصوص مویشی اور بالعموم عامۃ الناس کھاتے ہیں۔

کھجوروں کے باغات کے ساتھ ساتھ دریائے رخشان بہہ رہا تھا۔ دریائے رخشان کی ہیبت اور سرعت رفتار کو اگر کوئی پنجابی دیکھ لے تو یقیناً غش کھا جائے۔ تین فٹ چوڑائی اور دو فٹ گہرائی کی سست رو لکیر ہے۔ اس کو اہل مکران دریائے رخشان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ہم سیر کرتے کرتے خاصی دور نکل گئے۔ شام کے سائے بڑھ آئے تھے۔ کچھ دیر بعد کھجور کی اوٹ سے چاند نے سر نکالا تو ہر طرف روپہلی چاندنی بکھر گئی۔ چرواہے اپنے مویشیوں کو ہانک کر گھر واپس جا رہے تھے۔ دور کہیں دریا کے کنارے کوئی چرواہا بانسری بجا رہا تھا۔ بانسری کی افسردہ تانوں نے ماحول کو گھمبیر بنا دیا تھا۔ میں منہمک ہو کر سننے لگا۔ کہدا صاحب حیران ہو کر بولے۔ ''سمجھتے ہو یہ کون سا بلوچی نغمہ گایا جا رہا ہے؟'' میں نے کہا ''یہ تانیں کسی زبان کی محتاج نہیں ہوا کرتیں۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ازل سے دکھی انسانیت گاتی چلی آ رہی ہے۔ یہ ان آرزوؤں کی پکار ہے جو پامال ہوئیں۔ ان حسرتوں کا نوحہ ہے جو کامیابی کی راہ دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئیں۔ وہ جذبات جو مرتے دم تک سینے میں دبے رہتے ہیں، وہ احساسات جن کے لیے ابھی تک کوئی نام تجویز نہیں ہوا۔ دنیا کا کوئی خطہ ہو، کیسی ہی آب و ہوا ہو، زبانیں کتنی ہی مختلف ہوں، جذبات و احساسات ایک سے ہوتے ہیں۔

''ہوتے ہوں گے!'' کہدا صاحب اکتا کر بولے۔

میں شام کا کھانا کھا کر جلد سو گیا۔ دوسرے دن اتوار تھا اور کہدا صاحب نے میرے اعزاز میں اپنی خاص دعوت کا انتظام کیا۔ دوپہر کو پوری پارٹی نے شہر سے چند میل دور ایک باغ میں ڈیرے ڈالے۔ کھجور اور امرود کے درختوں کے نیچے ایرانی قالین بچھا دیے گئے۔ ساتھ ہی کاریز کا شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ہم سب خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد رسالدار لیویز نے دسترخوان بچھایا اور بڑی سی ٹرے میں روسٹ کیا ہوا ایک سالم دنبہ لے آیا۔ کہدا صاحب نے اپنے بھاری ہاتھوں سے دنبے کا پیٹ چاک کیا تو

بیچ میں سے دم کیا ہوا پلاؤ نکلا جس میں تلی ہوئی کلیجیاں تھیں' جب پلاؤ کے ڈھیر کو ایک طرف ہٹایا تو درمیان میں سے مرغ مسلم نکلا۔ میں ابھی اس نئی طرز کی دعوت پر حیران ہی ہو رہا تھا کہ مرغ مسلم کا پیٹ بھی چاک ہو گیا اور اس میں سے ابلے ہوئے انڈے اور شامی کباب نکل آئے۔ اس کے بعد وہ آزمائش کا م وہ دہن ہوئی کہ سوائے ہڈیوں کے دستر خوان پر کچھ نہ بچا۔

شام کو کہدا صاحب نے بتایا کہ بس علی الصبح تربت روانہ ہو گی' لہٰذا ان کو الوداع کہا اور واپس آ کر سو گیا۔ صبح سویرے اٹھ کر جلدی سے شیو کی' کپڑے بدلے' سامان باندھ کر ناشتہ کرنے لگا۔ ابھی میں نے پہلا ہی نوالہ منہ میں ڈالا تھا کہ باہر سخت گڑگڑاہٹ ہوئی ایسے محسوس ہوا جیسے ایک ساتھ پورا ''آرٹلری کالم'' حرکت میں آ گیا ہو۔ گھبرا کر باہر نکلا تو فقیر محمد اندر آ رہا تھا' بولا... صاحب بس آ گئی ہے... سامان نکال لاؤں؟ میں نے اس خیال سے کہ ناشتہ کرنے سے سواریوں کو انتظار کی کوفت گوارا کرنی پڑے گی' ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا اور فقیر محمد سے مصافحہ کر کے بس میں جا بیٹھا۔ یہ بس ہر لحاظ سے کوئٹہ والی بس سے بھی گئی گزری تھی۔ بہر حال' جی کڑا کر کے بیٹھ گیا۔ بس تھوڑی دیر چلی اور پھر ایک موڑ کاٹ کر مخالف سمت میں گھوم گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ کسٹم ہاؤس پر چیکنگ ہوتی ہے۔ کسٹم ہاؤس پر جا کر پتہ چلا کہ انسپکٹر صاحب' جنہیں بس چیک کرنی ہے' سیر کرنے گئے ہوئے ہیں۔ قریب نصف گھنٹے بعد موصوف تشریف لائے تو بے نیازی سے ایک نگاہ بس پر ڈالی اور پھر ناشتہ کرنے چلے گئے اور پھر جب مزید نصف گھنٹہ لگا کر باہر آئے تو بس کو دیکھے بغیر حوالدار سے پوچھا ''ٹھیک ہے؟'' حوالدار کا پاؤں اوپر اٹھا اور پھر دھپ سے زمین پر آ گرا۔ سب ٹھیک ہے' اچھا .... خدا حافظ... اور ایک بار پھر آرٹلری کالم حرکت میں آ گیا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے ڈاک لینے کے لیے تحصیل کے سامنے رکی۔ چپڑاسی نے نہایت تیزی کے ساتھ تھیلا ڈرائیور کے حوالے کیا اور بس چل پڑی۔ خیال تھا کہ اب اس جانگسل انتظار سے نجات مل جائے گی لیکن یہ خیال جنون کی صورت اس وقت اختیار کر گیا جب بس پیچ و تاب کھاتی پولیس سٹیشن کے اندر داخل ہوئی۔ یہاں سے پولیس کی ڈاک جاتی تھی۔ قریب ایک گھنٹہ وہاں انتظار کرنا پڑا۔ ہر دس منٹ بعد ایک مونچھوں والا حوالدار باہر نکلتا' مشکوک انداز میں ہر سواری کو دیکھتا اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اندر چلا جاتا۔ خدا خدا کر کے ڈاک آئی۔ اب دو میل تک بس بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہی۔ شہر سے باہر کاریز کے کنارے آخری چیکنگ کے لیے اس کو پھر روکا گیا۔ بس کے عملے نے جن میں کنڈیکٹر' اسسٹنٹ کنڈیکٹر اور کلینر شامل تھے' اب ٹھوک بجائی شروع کی۔ ٹکٹ کلکٹر نے باواز بلند کہا کہ تمام سواریاں پانی پی لیں کیونکہ سو میل تک پانی نہیں ملے گا۔ نصف گھنٹے کی چیکنگ کے بعد بس کو سفر کے قابل قرار دیا گیا۔ اس اثناء میں تمام سواریاں زاد راہ لے چکی تھیں۔ حد نگاہ تک وہی ماحول تھا۔ مری ہوئی زمین' جلے ہوئے پتھر' خاکستر چٹانیں اور ذہنوں میں نام خدا۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کیسا ہی مرتد

اور کافر کیوں نہ ہو ایک دفعہ اسے مکران بھیج دیں' خدا کا قائل ہو جائے گا۔

تیس میل سفر کے بعد بس رکی تو ایک مسافر اترا۔ چند لوگ ایک پاگل کو بڑی مشکل سے تھامے بس کے قریب لائے اور استدعا کی کہ اس کو تربت ہسپتال پہنچا دیا جائے چونکہ پنجگور میں کوئی ڈاکٹر نہ تھا' اس لیے علاج کے لیے لوگوں کو تربت جانا پڑتا تھا۔

ڈرائیور نے ایک دفعہ پیچھے مڑ کر سواریوں کو دیکھا' پھر ایک ایک نگاہ پاگل پر ڈالی اور ''نہ واجہ'' کہہ کر انجن سٹارٹ کر دیا۔ ساٹھ میل کے بعد میدانی سلسلہ ختم ہو گیا اور گوران کھنڈ کی اترائی شروع ہوئی۔ محکمہ تعمیرات عامہ نے بڑی محنت سے پہاڑ کو کاٹ کر اس قابل بنایا تھا کہ کوئی گاڑی اتر یا چڑھ سکے اور اس کا نام ''زم زم'' پاس رکھ دیا۔ اس پر پورے مکران میں پڑھے لکھے طبقے نے شدید احتجاج کیا کہ بلوچی کلچر کو مٹانے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ ڈی سی نے حکم دیا کہ اس کو پھر سے گوران کھنڈ کے پرانے نام سے یاد کیا جائے۔ قریباً تیس میل تک پہاڑ میں بھٹکنے کے بعد میدانی سلسلہ شروع ہوا۔ پہاڑوں پر پیش کے درخت خاصی تعداد میں نظر آئے۔ پیش کو مکران میں وہی اہمیت حاصل ہے جو عرب میں اونٹ کو ہے۔ جس طرح عرب اپنا کھانا' پینا' اوڑھنا' بچھونا اونٹ کے اجزا سے حاصل کرتے تھے' اسی طرح اہل مکران اپنے لوازمات زندگی بڑی حد تک پیش سے پیدا کرتے ہیں۔ پیش اس کھجور نما جھاڑی کا نام ہے جو تین ہزار فٹ کی بلندی پر اور خاص طور پر پہاڑوں کی ڈھلانوں پر بکثرت ملتی ہے۔ اہل مکران اس کے پتوں سے پنکھے' ٹوکریاں' رسے' ٹوپیاں' پیالے اور مشکیزے بناتے ہیں۔ اس کی ٹہنیوں کو سکھا کر بطور ایندھن استعمال کرتے ہیں۔ اس کی ٹہنوں کو بطور دوا استعمال کرتے ہیں۔ یہ کثرت اسہال کا تیر بہدف علاج تصور ہوتا ہے۔ ضرورت کے وقت اس کے تنے کا گودا نکال کر بطور سبزی پکایا اور کھایا جاتا ہے۔

اب بس بال گتر جا کر رکی۔ بال گتر کے قریب تیس مربع میل میں پھیلا ہوا میدان ہے جہاں شام کو ہرن کلیلیں کرنے نکلتے ہیں۔ اس جگہ کو ''شکاریوں کی جنت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کھلی جیپ میں بیٹھ کر ہرن کا تعاقب کرنا ایک ایسا کیف آور نشہ ہے جس کا مزہ آج تک نہیں بھولا۔

بال گتر میں سواریوں نے کھانا کھایا' سلیمانی چائے پی اور ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد بس دوبارہ چل پڑی۔ بال گتر سے تربت اسی میل کے فاصلے پر ہے اور راستے میں کہیں کہیں کھجوروں کے جھنڈ نظر آ جاتے ہیں۔ ہوشاب کے قریب سے ایک سڑک براستہ آواران کراچی چلی جاتی ہے۔ بارہ گھنٹے کے تکلیف دہ سفر کے بعد شام کو بس تربت پہنچی۔ شہر میں سرخ آندھی چل رہی تھی اور پورا شہر اس کی سرخی میں لپٹا ہوا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی' چنانچہ وہ منتظر تھا۔ سامان اتار کر

کمرے میں رکھا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جب کپڑے بدل کر باہر نکلا تو آندھی تھم چکی تھی۔

ریسٹ ہاؤس سے باہر جیپ کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ملک صاحب وزیر اعظم ہاؤس میں منتظر ہیں۔ ملک صاحب وزیر اعظم ہاؤس..... ذہن کو پھر دھچکے لگنے لگے۔ ایک دفعہ تو سوچا کہ صاف انکار کردوں۔ میں سیدھا سادا جذباتی سا آدمی ہوں۔ واردات قلب اور ذہنی کیفیات ہر وقت چہرے سے مترشح ہوتی رہتی ہیں۔ رشک اور حسد کی جو آگ میرے سینے میں بھڑک رہی تھی' اس کی اگر ذرا سی حرارت بھی ملک صاحب تک پہنچ جاتی تو عمر بھر کی ناراضی یقینی تھی۔ سوچتا ہوں وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جو اپنے اندر سمندر کی گہرائی رکھتے ہیں... سمندر... جو بظاہر خاموش' متوازن اور پرسکون نظر آتا ہے' لیکن اندر ہی اندر کتنے طوفان اور مدوجزر جنم لے رہے ہوتے ہیں' لیکن دوسرے ہی لمحے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا... نوکری کی کچھ اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ وقت کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ میں نے ایک نظر ڈرائیور پر ڈالی اور جیپ میں بیٹھ گیا۔ جب جیپ ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلی تو میں نے شہر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پورا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑک کے دورویہ کچے پکے مکانات کھڑے تھے۔ کہیں کہیں کسی مکان سے روشنی کی کوئی ڈری ڈری' سہمی سہمی کرن باہر جھانک رہی تھی۔ صرف جیپ کا انجن فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ کیا شہر میں بجلی فیل ہوگئی ہے؟ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''شہر میں بجلی نہیں ہے'' ڈرائیور نے میری طرف بغیر دیکھے جواب دیا۔ مجھے اپنے اعصاب پر غنودگی سی طاری ہوتی محسوس ہوئی۔ ''تو کیا وزیر اعظم ہاؤس میں کوئی جنریٹر لگا ہوا ہے'' میں نے گھبرا کر جھٹ سے دوسرا سوال کر ڈالا۔ اس کے جواب میں ڈرائیور منہ سے تو کچھ نہ بولا' لیکن مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جن میں حیرانی اور بیزاری نمایاں تھی۔ اس کے بعد مجھے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تصورات' تاریخ کے پردے سرکاتے ہوئے ماضی کے مرغزاروں میں لے گئے۔ بغداد... الف لیلوی بغداد... جب شاہ ریمان کے سفیر خلیفہ وقت کے محل میں داخل ہوتے ہیں اور کوتوال شہر کے دفتر کو عباسی خلیفہ کا مسکن سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ستر ہزار زربفت کے مرصع پردے' جھلملاتے ہوئے ہزاروں فانوس' انمول موتیوں سے جڑا ہوا ساز و سامان' دنیا کے نایاب نوادرات' خوبصورت کنیزوں کے جھرمٹ' کم سن وخوبرو غلاموں کے غول' خواجہ سراؤں کی فوج' حسن و جوانی کی موج' زندگی کی ترنگ' روح کی امنگ' وقت کا چڑھاؤ' مال و زر کا بہاؤ' نغمہ و چنگ' بادہ گل رنگ۔ ان حسین خیالات کے تانے بانے اس وقت ٹوٹے جب چند بے ہنگم موڑ کاٹ کر جیپ' جھٹکے کے ساتھ ایک درخت کے نیچے رک گئی۔ کیا گاڑی خراب ہوگئی ہے؟ میں حقیقت کی دنیا میں واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔ ''گاڑی بالکل ٹھیک ہے۔ تو پھر کیوں روک دی ہے؟''

''اتریئے! سامنے قیام گاہ ہے''۔ ''کہاں؟'' مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''وہ سامنے!'' ڈرائیور نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''کیا یہ وزیر اعظم ہاؤس ہے؟'' مجھے اپنی بصارت پر شک ہونے لگا۔ ''جی ہاں!'' ڈرائیور نے مختصر سا جواب دیا۔ میں گاڑی سے نیچے اتر آیا اور آنکھیں مل کر چاروں طرف گھورنے لگا۔ سامنے ایک خارش زدہ بیری کی عمر رسیدہ شاخ پر ایک مریل سی لالٹین لٹک رہی تھی جس کی زرد روشنی اپنے محیط سے باہر نکلنے کی کوشش میں سرگرداں تھی۔ درخت کے پس پردہ خالص مٹی کا بنا ہوا ایک بوسیدہ مکان کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مٹی کا پلستر وقت کے بے رحم ہاتھوں جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور دیواروں سے باہر جھانکتی ہوئی دیمک خوردہ کڑیوں پر چمگادڑوں کی ایک فوج بیٹھی تھی۔ ''صاحب! اندر چلیئے۔ کب تک باہر کھڑے رہیں گے؟'' ڈرائیور نے مجھے جھنجھوڑا اور درخت سے لالٹین اتار کر اندر چل پڑا۔ دو چار تنگ کمروں سے گزر کر ہم ایک چھوٹے صحن میں داخل ہوئے جہاں چند بزرگ صورت پریشان حال درخت نظر آئے۔ ان کے نیچے سے گزر کر پھر چند کمروں کا طواف کرنے کے بعد بڑے صحن میں آ نکلے جہاں ایک چبوترے پر ملک صاحب صرف ایک چادر باندھے سادھو کی طرح آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور میں دوڑ کر اس طرح ان سے لپٹ گیا جیسے دو عزیز سالہا سال کی جدائی کے بعد ایک دوسرے کو ملتے ہیں۔ ''کہو! پسند آیا وزیر اعظم ہاؤس؟'' ملک صاحب میری پریشانی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ''بہت!'' میرے پاس دوسرا کوئی جواب نہ تھا۔ تمام مکان کوئی چھ کنال کے رقبے میں تھا۔ سارے کمرے کچے تھے جن کی چھتوں پر حشرات الارض نے اپنے مستقل ٹھکانے بنا رکھے تھے اور جن میں رات کے وقت کوئی دل گردے والا آدمی ہی داخل ہو سکتا تھا۔ تمام صحن بے ثمر درختوں سے بھرا پڑا تھا جس میں تمام دن گلہریوں اور دیگر جانوروں میں دوڑ لگی رہتی۔ رات کو مچھر دانی لگانی پڑتی جس سے دم گھٹنے لگتا کیونکہ جو گرم لو دن کو جھلستی' اس کی تپش اور گھٹن رات کو بھی بے چین رکھتی۔ بعد میں پتہ چلا کہ انگریزی دور میں ایک تحصیلدار کوئٹہ سے بطور وزیر اعظم مکران بھیجا جاتا تھا اور یہ مکان اسی دور کی یادگار ہے۔ شدید تھکن کے باوجود تمام رات نیند نہ آئی۔ مچھر دانی نہ ہونے کی وجہ سے مچھر پے در پے حملہ کرتے رہے۔ میرے پاس مدافعت کے لیے صرف ایک چادر تھی جس کو سر پر لیتا تو پاؤں پر ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک ساتھ کئی نوکدار تیر پیوست ہو گئے ہیں اور اگر پاؤں ڈھانپتا تو سر میں سوئیاں سی چبھنے لگتیں۔ خدا خدا کر کے رات کاٹی۔ صبح جب موذن نے اذان دی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں مچھروں کا شوق جہاد بھی شاید سرد پڑ چکا تھا' اس لیے اپنے ہتھیار سمیٹتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

صبح اٹھ کر ناشتہ کیا بشرطیکہ اس کو ناشتہ کہا جا سکتا ہو' کیونکہ ایسی گرمی میں انڈا چھوڑ مرغی بھی سلامت نہیں رہ سکتی تھی۔ چائے بغیر دودھ' ڈبل روٹی کا وجود ناپید اور پراٹھا سارے مکران میں مفقود۔ ناشتے کے بعد ڈی سی صاحب کو سلام کرنے ضلع کچہری گیا۔ ضلع

کچہری کچھ زیادہ دور نہ تھی اور اگر دور بھی ہوتی تو بھی ملک صاحب کی تقریر کچھ ایسی دلپذیر تھی کہ لاہور تک کا راستہ با آسانی طے کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ملک صاحب نے مافوق الطبیعات پر ابھی ابتدا ہی کی تھی کہ ہم کچہری کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ کالے کوٹوں والے وکیل نظر آئے نہ ٹوٹی ہوئی عینکوں والے منشی... ''مشتری ہشیار باش'' کیسا مشتری کیسی ہشیاری؟ نہ شکار نہ شکاری! ڈی سی صاحب دفتر میں غالباً مصروف تھے اور باہر سنگ راہ جس سے نہ بچنا ممکن' نہ ٹکرانا قرین مصلحت۔ سلام تو بہر حال کرنا تھا' اس لیے باہر کرسیوں پر ڈٹ گئے۔ اس زندگی میں سلام کو کتنی اہمیت حاصل ہے! کہتے ہیں کہ ہندوستان پر ڈیڑھ سو سال تک انگریز نے جو حکومت کی اور ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ بنایا اس کی اساس اسی سلام پر تھی.... سلام.... جس میں ہزاروں مصلحتیں ہوتی ہیں.... سلام... جس میں لاکھ احتجاج ہوتے ہیں۔ سلام جس کو ان گنت مجبوریاں جنم دیتی ہیں۔

اس کائنات کے آگے ایک اور کائنات ہے' اس کے آگے... اور پھر اس کے آگے پیچھے'' ملک صاحب نے اکتا کر اپنی مافوق الطبیعاتی تقریر کے تانے بانے بننے شروع ہی کئے تھے کہ ڈی سی صاحب کا پیغام آ گیا' چنانچہ میں چق اٹھا کر اندر چلا گیا۔ ''آخراتنی دور آپ کو ٹریننگ کے لیے بھیجنے میں کیا مصلحت تھی؟'' ڈی سی صاحب نے جھٹ یہ سوال کر ڈالا۔ اس کا جواب ہمارے پاس نہ تھا۔ اس کا جواب شاید ان کے پاس بھی نہیں تھا جنہوں نے ہمیں یہاں بھیجا تھا۔ ویسے بھی بعض ایسے سوال ہوتے ہیں جن کا بہترین جواب خاموشی ہوتا ہے' کیونکہ اگر کچھ کہا جائے تو لوگ سنتے ہیں اور سننے سے اکثر ذہن میں شبہات جنم لیتے ہیں۔ اگر شبہات راسخ ہو جائیں تو طبیعت میں ابال اٹھتا ہے اور یہ ابال چاہے دودھ میں ہو یا طبیعت میں' خطرناک ہوتا ہے۔ بہر حال ڈی سی صاحب کی بوجھل پلکیں اور فکر مند چہرے کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ امور انتظامیہ اہتمام خشک وتر کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتے ہیں۔



کیچ......مکران کا شہزادہ

مکران میں ہمارا قیام کئی لحاظ سے تکلیف دہ تھا... اجنبی لوگ... انوکھی زبان' اس پر ستم ظریفی یہ کہ سارے مکران میں مشہور ہو گیا تھا کہ حکومت بلوچوں پر باہر سے حاکم مسلط کر رہی ہے۔ ہم جہاں کہیں جاتے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا۔ لوگوں کے چہروں پر بیزاری صاف جھلکتی... حتیٰ کہ چھوٹے بچے بھی ہمیں دیکھتے ہی آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیتے... زبان کا مسئلہ بذات خود بڑا پریشان کن تھا... ایسے محسوس ہوتا جیسے قوت گویائی چھن گئی ہو.... کس سے بات کرتے؟ کس کی بات سنتے؟ اگر زبان یار ترکی بھی ہو تو دہن یار سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک ساز محسوس ہوتا ہے اور ساز کسی زبان کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے صوتی اثرات سے روح میں پھلجھڑیاں سی چھوٹتی ہیں۔ لیکن یہی الفاظ کسی ایرے غیرے کی زبان سے نکلیں تو ترکی کی تمام ہوتی نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ بلوچی زبان کوئی ایسی سرکش نہ تھی کہ اس کے منہ کو لگام نہ دی جا سکتی' لیکن اڑیل چھوڑ اصیل گھوڑے کو بھی قابو میں کرنے کے لیے پچکارنا پڑتا ہے' تب کہیں جا کر رکاب پر پاؤں ٹکتے ہیں۔ لیکن یہاں تو "نے ہاتھ باگ پر تھا نہ پا تھے رکاب میں" کوئی سکھانے کے لیے راضی ہی نہ ہوتا' کوئی سمجھانے کا تردد ہی نہ کرتا۔ "آپ پڑھے لکھے ہیں' خود ہی سیکھ جائیں گے" ہر طرف سے یہی جواب ملتا۔ زبان کا بغیر کسی استاد کے سیکھنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی تیراکی جانے بغیر تالاب میں چھلانگ لگا دے اور الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دے.... کتابی زبان اور اصل بول چال میں بھی بعد المشرقین ہوتا ہے۔ محض کتابی عبارت پڑھنے سے ذہن میں جو تاثر ابھرتا ہے' وہ قریباً اسی قسم کا ہوتا ہے جو گراموفون پر گھسی ہوئی سوئی کے چلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایران کے ایک وفد کے اعزاز میں عشائیہ کے بعد جب محفل راگ رنگ شروع ہوئی تو ملکہ ترنم نے ترنگ میں آ کر ازراہ مہمان نوازی' مہمانان نیک نام کے لیے خیام کی ایک جاں سوز رباعی پڑھی اور پھر داد طلب نگاہوں سے متحیر ارکان وفد کی طرف دیکھا تو مہمان خصوصی نے کمال تجسس سے مترجم سے پوچھا تھا۔

In which language she is singing (محترمہ کس زبان میں گا رہی ہیں؟)

کہدا صاحب نے جانے کیا سوچ کر "صبر و تحمل کی تربیت" کہا تھا' کیونکہ قوت برداشت یہاں قدم قدم پر ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ پائے ثبات کا پاشنہ نہ صرف زخمی ہوا تھا بلکہ معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ ہماری تربیت کے لیے جو پروگرام وضع کیا گیا تھا' وہ بظاہر کوئی ایسا

جان لیوا تو نہ تھا کہ اس پر با قاعدہ کوئی مرثیہ لکھنے کی نوبت آتی۔ تمام ٹریننگ محکمہ مال' فوجداری نظام اور جنرل ایڈمنسٹریشن کی تثلیث کے گرد گھومتی تھی۔ ہر چند کہ ان شعبہ جات کے راز ہائے سربستہ ہم پر ابھی منکشف نہ ہوئے تھے' لیکن چھوٹا سا زمیندار ہونے کے ناتے سے نہ صرف ذاتی طور پر ان سے استفادہ کر چکے تھے' بلکہ کثرت نظارہ سے چشم تنگ خاصی حد تک وا بھی ہو چکی تھی۔ مثلاً ہمیں اس امر کا بخوبی علم تھا کہ محکمہ مال وہ محکمہ ہوتا ہے جو ایک عام زمیندار کا جینا محال کر دیتا ہے۔ کسی دل جلے کی یہ پھبتی کہ "اوپر ذات باری' نیچے پٹواری' تو شاید آپ نے بھی سنی ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بلاواسطہ خود فیضیاب نہ ہوئے ہوں۔ ان کے پاس الہ دین کا چراغ تو نہیں ہوتا لیکن جو کرشمات نائے ضعیف سے بنی ہوئی قلم دکھلاتی ہے' وہ اس لحیم شحیم دیو کے بس کا روگ نہیں۔ اگر چشم زدن میں زید کی زمین بکر کے کھاتے میں جا رہی ہے تو دن دہاڑے احمد کی پگڑی محمود کے سر پر رکھی جا رہی ہے۔ آج جس زمین کے بل بوتے پر آپ لاکھوں میں کھیل رہے ہیں' کل اسی زمین کی وجہ سے ان گنت مقدمات کی صعوبتیں بھی جھیل رہے ہوں گے۔ آج جو پگڈنڈی آپ کی زمین کے شرقی جانب دامن نیاز کی طرح بچھی ہے' کل وہی بے مروت آپ کے سینے پر مونگ دلتی' ناگن کی طرح بل کھاتی' لہراتی' غربی سمت اپنا پھن لہرا رہی ہو گی۔

انسان کی مٹی صرف فساد کے عرق میں تو نہ گوندھی گئی تھی لیکن ظلم کا عنصر جسد خاکی کے کسی کونے کھدرے میں گھات لگائے ضرور بیٹھا رہتا ہے اور یہ داغ عیوب برہنگی' ننگ وجود ہو یا نہ ہو' باعث سرور ضرور ہوتا ہے' لہٰذا کون بدبخت تھا جو اس قسم کی ٹریننگ پر ردو کد کرتا.... یہ اور بات ہے کہ بدبختی ہمیں یہاں بھی گھیرے ہوئے تھی۔ پتہ چلا کہ جو ریونیو سسٹم راجہ ٹوڈرمل کے ذہن کی اختراع تھا' اس کے اثرات ابھی یہاں مرتب نہیں ہوئے تھے۔ نہ تو زمین کو کسی جکڑ کے جمع بندیوں میں ڈالا گیا تھا اور نہ لٹھے پر اس کے بخیے ہی ادھیڑے گئے تھے۔ جہاں ننانوے فیصد زمین غیر ممکن چھوڑ' ناممکن ہو' وہاں اتنے لمبے چوڑے اہتمام کی ضرورت ویسے بھی نہیں پڑتی۔ لہٰذا وہ قلم جو ہم نے بڑے کروفر سے اراضیات کو زیر و زبر کرنے کے لیے پکڑا تھا' چل نہ سکا۔

مایوسی چونکہ گناہ ہے اس لیے ہم نے جیتے جی ایک اور گناہ پالنا گوارا نہ کیا اور اپنی تمام تر توجہ فوجداری ٹریننگ کی طرف مبذول کر دی کہ کچھ تو ہاتھ آئے۔ لیکن یہاں بھی کوئی امید بر آنے کی صورت نظر نہ آئی۔ جس سرزمین نے راجہ ٹوڈرمل جیسے زیرک شخص کا داخلہ ممنوع کر رکھا تھا' وہ بھلا لارڈ میکالے کو کہاں برداشت کرتی؟ چنانچہ ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کو تہ کر کے ہم نے طاق نسیاں میں رکھ دیا... سارے مکران میں جرگہ سسٹم رائج تھا۔ جرگے میں نہ تو قانونی موشگافیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ضابطہ و تعزیر کے گورکھ دھندوں میں الجھنا پڑتا ہے.... سیدھے سادے سے لوگ... سیدھا سادا طریق کار... صاف اور سستا انصاف... مختصر'

مگر جامع فیصلہ جس کی ابتدا ہمیشہ اس فقرے سے ہوتی۔ ''ہم معزز ممبران جرگہ کو خفیہ طریقے سے پتہ چلا ہے کہ... ''اب ظاہر ہے کہ اگر منصف معزز ہو اور ذریعہ خفیہ ہو تو ملزم کو سر دھنتے ہی بنے گی۔ اس سلسلے میں ملزم کو تھوڑی سی مشکل ضرور پیش آتی اور وہ یہ کہ تمام معزز ممبران جرگہ کو اکٹھا ہونے میں بہت وقت لگتا... اور اس کی بھی ایک معقول وجہ تھی۔ ایک تو انسان معزز ہو اور دوسرے ممبر جرگہ ہو تو یوں ندیدوں کی طرح ایک ہی بلاوے پر لپک پڑنا کچھ غیر مدبرانہ سا فعل ہے۔ پھر خفیہ اطلاع کا ملنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا' اس لیے فیصلہ ہونے میں سال لگ جاتے۔ ایک دفعہ ڈسٹرکٹ جیل کے معائنے کے وقت میں نے ایک حوالاتی کو دیکھا جو گزشتہ پانچ سال سے پابند سلاسل تھا۔ تحقیق پر پتہ چلا کہ بدنصیب نے ایک گدھے کو چاقو مارا تھا۔ میں نے ڈی سی صاحب کی توجہ اس طرف دلائی تو غریب کو نجات ملی۔

ڈسٹرکٹ جیل دو بوسیدہ کمروں پر مشتمل تھی جس کے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ سارے ضلع کے قیدی یہاں رکھے جاتے۔ حوالاتی اور دوسرے قیدیوں میں کوئی تمیز نہ برتی جاتی۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا۔ ارباب بست وکشاد غالباً ناخوش و بیزار تھے مرمرکی سلوں سے' اس لیے تمام جیل میں ایک آدھ پکی اینٹ بطور تبرک بھی نہ لگائی گئی تھی۔ کچی دیواریں آخر کب تک چھت کا بوجھ سہارتیں' چنانچہ ایک دن کڑیوں نے جب چھت سے باہر نکل کر دانت نکوسنے شروع کیے تو تمام قیدیوں نے بیک آواز اس میں رہنے سے انکار کر دیا۔ یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔ گو سارے مکران میں ابھی تک قیدیوں کی کوئی باقاعدہ یونین تو نہ بنی تھی' چونکہ اسپرو اور اس برادری کی دوسری گولیاں ابھی تک مکران نہ پہنچ پائی تھیں' اس لیے انتظامیہ اس دردسری سے حتی الامکان بچنا چاہتی تھی... خاصی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ قیدیوں کو کمروں سے نکال کر صحن میں رکھا جائے۔ ہجوم کی نفسیات' فرد کی نفسیات سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ جب ایک ساتھ تمام قیدی کھلی فضا میں لائے گئے تو انہوں نے خوشی سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ رات کو جب سردی پڑتی تو یہ چوہوں کی طرح کمبلوں میں دبک جاتے اور عجیب آوازیں نکالتے جس سے سونا دوبھر ہو جاتا۔ اتفاقاً ہمارے گھر اور جیل میں صرف ایک گلی حد فاصل تھی اس لیے ہم بلاواسطہ اس ہاؤ ہو سے فیضیاب ہوتے۔ جرم وسزا کے اس ترقی پسند معاشرے کا ایک بوسیدہ جیل کب تک ساتھ دیتی۔ جوں جوں جرائم کی رفتار میں اضافہ ہوا توں توں ممبران جرگہ کی مصروفیتیں بڑھیں۔ جب جیل کا مختصر صحن برگد کی شاخ کی طرح پھیلتے ہوئے مجرموں کو پناہ دینے میں ناکام ہو گیا تو قیدیوں کو جیل کے باہر سرس کے درخت کے نیچے ڈیرے ڈالنے کی اجازت دی گئی... قیدیوں نے انتظامیہ کی اس مجبوری کا ناجائز فائدہ کبھی نہ اٹھایا۔ بیٹھے بیٹھے اگر کسی قیدی کے پاؤں میں اینٹھن ہونے لگتی تو وہ بازار کا ایک آدھ چکر لگانے ہی پر اکتفا کرتا یا اگر کسی ملاقات پر کوئی عزیز رشتے دار چند روپے جیب میں ڈال جاتا تو

سنتری کی اجازت لے کر دینو نانبائی کی دکان سے چائے کی ایک پیالی پی لی اور بس.... دوسرے صوبوں کے قیدیوں کی طرح نہیں کہ فرار ہونے کے باقاعدہ منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ آہنی سلاخوں کو کاٹنے اور خاردار تاروں کو پھلانگنے کی باقاعدہ مشقیں ہو رہی ہیں۔ سنتریوں کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے انوکھے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ سارے مکران کی تاریخ میں صرف ایک قیدی فرار ہوا تھا۔ بدبخت کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ آرام کی زندگی کو تج کر عسرت اور مفلسی کے سمندر میں کود گیا۔ فرار ہونے میں اس نے جو انوکھا طریقہ ایجاد کیا وہ نہ صرف دوسرے قیدیوں کے لیے مشعل راہ ہو سکتا ہے' بلکہ مفرور کی ظرافت طبع کا بھی جیتا جاگتا شاہکار تھا۔ موصوف ساری رات کھانے کے چمچے سے جیل کی بوسیدہ دیوار کریدتے رہے اور صبح جب سنتری نے کمرے میں جھانکا تو حیرت سے اس کی آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں۔

ہر روز ملک غلام مصطفیٰ اور میں علی الصبح اٹھتے۔ اس وقت تک ہمارا اردلی اپنے گھر سے نہ پہنچ پاتا' اس لیے قریبی کنوئیں سے ہم باری باری چار ٹین پانی کے کھینچ کے لاتے۔ ہفتے میں تین دن ملک صاحب کی ڈیوٹی ہوتی اور چار دن میرے حصے میں آتے۔ میں نے ملک صاحب کو بہت سمجھایا کہ آپ بزرگ ہیں' مجھ سے عمر میں بڑے ہیں' اس لیے آپ یہ فرض بھی مجھے ہی سونپ دیں اور خود تکلیف نہ کیا کریں۔ لیکن ملک صاحب ہر دفعہ مصر ہوتے کہ وہ اپنی باری ہر صورت میں پوری کریں گے۔ ایک دن ہنس کر کہنے لگے ''کیا ہوا جو میں عمر میں بڑا ہوں۔ آخر تم بھی تو آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو' کیا تم چاہتے ہو کہ میں تھوڑی سی تکلیف کے لیے اپنی عاقبت خراب کر لوں؟'' نہانے کا تو محض ایک بہانہ ہوتا' کیونکہ دوران غسل بھی پسینہ جسم سے پھوٹتا رہتا۔ عجیب قسم کے بادلوں کے ٹکڑے تمام فضا میں تیرے پھرتے جس سے گرمی تو کم نہ ہوتی' البتہ حبس بڑھ جاتا اور سانس لینا بھی دشوار ہونے لگتا۔ ہمارے غسل کرنے تک اردلی آ جاتا اور ناشتہ تیار کرتا۔ چونکہ ایک آدھ مکھی اپنے قافلے سے جدا ہو کر بے صبری میں چائے کی پیالی کا ضرور طواف کر جاتی اس لیے ہمیں یہ حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی کہ اگر ملک صاحب چائے پی رہے ہوتے تو میں پنکھا لے کر مکھیوں کا محاسبہ کرتا اور جب میں گرم سیال حلق میں انڈیلتا تو ملک صاحب لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اتر آتے۔ ناشتے کے دوران اکثر ایک ہی موضوع زیر بحث رہتا۔ دفتر جا کر کیا کریں گے؟ میں کہتا ''اور گھر بیٹھ کر کیا حاصل ہوگا؟'' ملک صاحب برجستہ بول پڑتے۔ ہر دو نقطہ نظر اپنی جگہ وزن رکھتے تھے' لیکن چونکہ ملک صاحب اپنے استدلال میں اپنی بزرگی کا وزن بھی شامل کر لیتے' اس لیے احتراماً ہتھیار پھینکنا مجھ پر لازم ہو جاتا اور ہم دفتر جانے کے لیے گھر سے نکل پڑتے.... چونکہ ہمارا اپنا کوئی دفتر نہ تھا اس لیے وقت کی پابندی کا سوال صرف ہمارے ضمیر تک محدود تھا۔ یہ سوچ کر کہ ہمارا زیادہ دیر تک کسی ایک اہلکار کے پاس بیٹھنا تضیع اوقات کا موجب بن سکتا ہے' ہم

سیدھے دفتر نہ جاتے' بلکہ گلیوں' کوچوں اور بازاروں کے چکر کاٹتے ہوئے دفتر پہنچتے۔ اب چونکہ بلوچی زبان سے رسمی علیک سلیک ہو گئی تھی اس لیے باہر نکلتے ہی ہم سب سے پہلے اپنے پڑوسیوں کی مزاج پرسی کرتے۔ سرس کے نیچے لیٹے ہوئے قیدی ہمیں دیکھتے ہی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے۔ سارے مکران میں یہ واحد جگہ تھی جہاں ہماری عزت نفس مجروح نہ ہوتی۔ ملک صاحب ہر قیدی کی فرداً فرداً خیریت پوچھتے اور ان کے مسائل کو ڈائری میں نوٹ کر لیتے۔ جیل کے عقب میں بازار تھا' وہاں جا کر ہم ہر قابل ذکر دکان پر کھڑے ہوتے' بے مقصد چیزوں کے بھاؤں پوچھتے۔ چونکہ دکاندار ہماری اس روش کو سمجھ گئے تھے' اس لیے منہ سے تو کچھ نہ بولتے لیکن ان کے چہرے کی ہر لکیر ان کے خیالات کی چغلی کھاتی نظر آتی۔ بازار کے ساتھ ڈاک خانہ تھا۔ اس کے بعد بیچارے پوسٹ مین کی شامت آتی.... ''کوئی خط آیا؟'' ''کوئی خط کیوں نہیں آیا؟'' میرے خیال میں تم خط گم کر دیتے ہو۔ کیا تم انگریزی بھی پتہ پڑھ لیتے ہو؟ یہ باتیں سن سن کر غریب زچ ہو گیا تھا' لیکن کیا کرتا؟ ہنس کر کہتا: ''صاحب! فکر نہ کریں' انشاء اللہ جب بھی آپ کی ڈاک آئی تو سب سے پہلے پہنچا دوں گا'' ڈاک خانے کے پہلو ہی میں ہسپتال تھا۔ اب ڈاکٹر ہماری زد میں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب' یہ سر کا درد کیوں نہیں جاتا؟ میں کہتا۔ ڈاکٹر' یہ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ ملک صاحب شکایت کرتے۔ ڈاکٹر بیچارہ ابن مریم تو نہ تھا کہ ہر دکھ کا مداوا کر سکتا' لیکن تشخیص اس نے بہرحال کر ڈالی تھی۔ کہنے لگا ''ملک صاحب! نیند نہ آنے کا علاج تو میں کر سکتا ہوں' لیکن جس بے خوابی کے مرض کا آپ شکار ہیں' اس کا علاج صرف سول سیکرٹریٹ میں ہوتا ہے۔ جب ہم کچہری پہنچتے تو سورج نصف النہار پر آ چکا ہوتا۔ ہماری سب سے پہلی یلغار میر کمال خاں سپرنٹنڈنٹ پر ہوتی۔ میر کمال خاں بڑا وضع دار آدمی تھا۔ اٹھ کر ہم سے ہاتھ ملاتا۔ دو چار منٹ تک رسماً ہماری خیریت پوچھتا اور پھر عادتاً خاص اہتمام سے ہمارے لیے دودھ والی چائے کی نصف پیالی منگواتا۔ ہر چند میں اس شدت کی گرمی میں چائے پینے کے خلاف تھا' لیکن ملک صاحب نے یہاں پر بھی مجھے مات دینے کے لیے منطق کو سائنس میں گھول کے چند فارمولے گھڑ رکھے تھے۔ کہتے ''جس طرح لوہا' لوہے کو کاٹتا ہے' زہر زہر کا تریاق ہے' اس طرح گرمی کو گرم چیز ہی ختم کر سکتی ہے۔'' ظاہر ہے کہ اس مدلل جواب کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہتی اور میں ایک ہی سانس میں گرم چائے کو حلق میں انڈیل لیتا۔ چائے کے حلقوم سے اترتے ہی پسینے کی روانی میں اضافہ ہو جاتا تو ملک صاحب خوش ہو کر کہتے۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ گرمی کافور ہو جائے گی؟ جسم سے پسینہ پھوٹے گا تو مسام کھلیں گے اور جب مسام کھلیں گے تو ہوا کو اپنے اندر جذب کریں گے اور ہوا مساموں کے ذریعے جسم میں جائے گی تو گرمی از خود زائل ہو جائے گی۔ سچ سچ بتاؤ گرمی کا اثر کچھ کم ہوا ہے یا نہیں۔ پھر جو داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے تو میں سچ بتانے کی بجائے فریاد طلب نگاہوں سے آسمان کو تکتا۔ گھنٹہ بھر ہم میر کمال خان کے اعصاب پر سوار

رہتے۔ بیچارہ ایک ہاتھ سے فائلوں پر نوٹ لکھتا تو دوسرے ہاتھ سے شکر چائے میں ملاتا۔ اگر ایک کان سے ڈی سی صاحب کے احکامات سنتا تو دوسرا کان اس نے ہماری لایعنی باتوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ جب ڈیڑھ بجتا تو اس کی جان چھوٹتی... گھر پہنچتے پہنچتے دو بج جاتے... کھانا زہر مار کر کے ہم چادریں باندھ کر بستر پر لیٹ جاتے۔ یہاں سے مصائب کی ایک نئی داستان کا آغاز ہوتا۔ پسینہ ہے کہ بان کی بنی ہوئی چارپائی کی درزوں سے رستا ہوا زمین پر ٹپ ٹپ گر رہا ہے... مکھیاں ہیں کہ انہوں نے تمام جسم پر ایک کمبل سا تان دیا ہے... نیند ہے کہ اس نے ذہن کو ممنوعہ علاقہ سمجھ رکھا ہے... کہیں دل کی دھڑکن ذہنی الجھن سے دست و گریباں ہے تو کہیں چاک گریباں سے خاک پریشان اڑ رہی ہے۔ آنکھیں بند ہیں لیکن ذہن جاگ رہا ہے... مکھیوں کی بھرمار لشکر تاتار نظر آ رہی ہے۔ گرمی کی شدت' جنون کی وحشت میں ڈھل رہی ہے... ہر گھڑی' ہر منٹ' ہر لحظہ شمار کیا جا رہا ہے... تقویم وقت کو انگلیوں پر نچایا جا رہا ہے.... کروٹ پر کروٹ بدلی جا رہی ہے... کبھی اٹھ رہے ہیں۔ کبھی باہر برآمدے میں ٹہلا جا رہا ہے' تو کبھی تولیے کو پانی میں بھگو کر جسم پر رکھا جا رہا ہے۔

جب سورج مورنا تواں کے مانند لطف خرام لیتا ہوا غربی جانب جھکتا' تو ہم تینوں اٹھا کر کنوئیں کی طرف بھاگتے۔ ہمارے غسل کرنے تک آسیب زدہ درختوں کے سائے دراز ہو کر صحن میں بنے ہوئے چبوترے تک آ پہنچتے۔ اردلی کرسیاں اٹھا کر لے آتا .... اتنے میں ملک صاحب کا ایک نیم پاگل' حواس مختل دوست آ پہنچتا۔ وہ ہمیں غیر ملکی سمجھتا تھا اور ہر روز اس کے آنے کا ایک ہی مقصد ہوتا' ہمیں یہ باور کرانا کہ ہماری آمد کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ میں اس شخص کی باتوں سے بری طرح بیزار تھا لیکن ملک صاحب اس کی لن ترانیاں سن کر بہت محظوظ ہوتے اور اسے چھیڑتے ہوئے کوئی ایک آدھ لقمہ دے جاتے... بس ذرا سی چابی بھرنے کی دیر ہوتی۔ اب جو راگ سے پر باجا بجنا شروع ہوتا تو رکنے کا نام ہی نہ لیتا۔ ایک دن ملک صاحب اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگے "دیکھو صابر! یہ قضا و قدر کا مسئلہ ہے ورنہ کوئی آدمی اپنی خوشی سے اتنے دور دراز علاقے میں نہیں آتا۔ نوکری میں نخرہ نہیں چلتا۔ حکومت کا ہمیں یہاں بھیجنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ آپ لوگوں کی خدمت کی جائے اور عوام کے مسائل حکام بالا تک پہنچائے جائیں۔ اس کلام نرم و نازک کا اس پر کیا اثر ہوتا تھا' وہ کہہ اٹھتا مقصد ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ آپ لوگوں کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اپنے تجربات کی بنیاد پر ظلم و ستم کے نئے طریقے ایجاد کریں اور اپنی سفارشات بھجوائیں کہ ہمیں کس طرح موثر طور پر کچلا جا سکتا ہے۔ میں ملک صاحب کو سمجھاتا کہ جب ہٹ دھرمی اور نفرت یکجا ہو جائیں' وہاں ایک ایسا زہر گھلتا ہے جس کا اس جہاں میں کوئی تریاق دریافت نہیں ہو سکا۔ ملک صاحب اپنے مخصوص نظریات کے علمبردار تھے کہتے "شاہ جی! محبت کی حکمرانی ہر اقلیم پر ہو سکتی ہے' صرف

عزم صمیم چاہیے۔ نفرت کے آتش کدے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے قلزموں کی ضرورت نہیں' جذبہ براہیمی درکار ہے۔

جب دردانگیز منظر سے ظالم سورج کی نظر تھوڑی سی اور شرماتی تو ہم چھڑیاں اٹھا کر سیر کے لیے نکل پڑتے۔ تربت سے دریائے کیچ تین میل کے فاصلے پر تھا اور وہی ہماری منزل مقصود ہوتا۔ دریائے کیچ کے پہلو میں پنوں کا قلعہ ہے جس کے کھنڈرات بھی اب کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ پنوں کیچ مکران کا وہی شہزادہ تھا جس کی گرم سانسوں سے سسی کا پندار محبت پگھلا تھا۔ ملک صاحب ان کھنڈرات میں کچھ دیر کے لیے رکتے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے۔ ان کا سر احتراماً جھک جاتا۔ اب ان کھنڈرات میں کیا رہ گیا ہے؟ ایک دن میں اپنا تجسس چھپا نہ سکا۔ ملک صاحب نے نم آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کہنے لگے۔ تم ابھی بچے ہو' شاید ان باتوں کو نہ سمجھ سکو۔ کیچ کا یہ پریشان حال شہزادہ ان ائمہ محبت میں سے تھا جنہوں نے آنے والی نسلوں کو سچائی کی راہ دکھائی۔ شہادت گاہ الفت میں قدم رکھنا ہے صرف شرف انسانی ہے بلکہ شرط مسلمانی بھی ہے۔ میں ایسا کم سن تو نہ تھا کہ اس تلخ نوائی کو نہ سمجھتا ..... یہ برق چمن زاد کبھی ہماری زندگی میں بھی لہرائی تھی جس سے خرمن ہستی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بولنے کا مقام نہ تھا' کچھ سننے کا وقت تھا... کیونکہ جب تجربہ بول رہا ہو تو تربیت کو لازم ہے کہ ہمہ تن گوش ہو جائے۔

کیچ تک پہنچتے پہنچتے سورج اور ندی کے درمیان آنکھ مچولی شروع ہو جاتی۔ دریائے کیچ اگر رخشان ندی کا برادر خورد نہ تھا تو برادر بزرگ بھی نہ تھا... ہیئت' سرعت رفتار اور ڈیل ڈول سے دونوں جڑواں بھائی معلوم ہوتے' کچھوے کی چال چلتے ہوئے' اپنی کم مائیگی پر کف افسوس ملتے ہوئے بہتے' لیکن برسات کے موسم میں دونوں بھائیوں کی طبیعت میں ابال آتا تو کچھ اس طرح بپھرتے کہ ہر چیز خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے۔ ہم جوتے اتار کر دریا میں ننگے پاؤں داخل ہو جاتے اور پندرہ بیس منٹ تک پانی میں کھڑے رہتے۔ اس طرح ذہن کو تھوڑا سا سکون ملتا۔

سیر کر کے لوٹتے تو شام ہو جاتی۔ بجائے گھر جانے کے ''تربت کلب'' کا رخ کرتے... اب آپ اگر یہ سوچنا شروع کر دیں کہ جس علاقے میں دریا ہوں' گلابی' عنابی کھجوروں کے جھنڈ ہوں' تاریک سہی' لیکن تاریخی اہمیت کی حامل عمارات ہوں' نوواردان محبت کے لیے مشعل راہ' شہید محبت کے قلعے کے کھنڈرات ہوں اور ان سب سے بڑھ کر عصر حاضر کی' نعمت غیر مترقبہ' کلب ہو' اس کے متعلق اس قدر واویلا کفران نعمت ہے۔

دراصل ناشکرا پن انسان کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ جب گرمی ہو تو وہ موسم سرما کے گن گاتا ہے' جاڑا پڑنے لگے تو گرمی کے تصور سے للچاتا ہے۔ خزاں آئے تو برسات کے گیت گاتا ہے' اگر ابر دو گھنٹے برستا ہے تو چھت کے چار گھنٹے ٹپکنے کا رونا روتا

ہے.... یہ درست ہے کہ ہر کلب' پنجاب کلب اور جمخانہ جیسی آن بان نہیں رکھتا' لیکن کلب بہر حال' کلب ہوتا ہے' کوئی حجرہ شاہ مقیم نہیں ہوتا۔ پھر ہر کلب کی اپنی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے' کوئی انفرادیت ہوتی ہے' کوئی انداز ہوتا ہے۔ کوئی اپنے "سوئمنگ پولز" کی وجہ سے مشہور ہے تو کوئی اپنے "مخملیں بار" پہ مغرور.... اسی طرح تربت کلب نے بھی حتی المقدور اپنے اندر جدت پیدا کر لی تھی جس پر باقی کلب جتنا بھی رشک کریں' کم ہے۔ کلب کا واحد ملازم "حسن" جو بیک وقت چوکیدار' باورچی' بیرا اور بیرا گیری بھی کرتا تھا' نہایت اہتمام سے بکری کے خالص دودھ والی چائے تیار کرتا تھا اور ہمارے کلب جانے کا واحد مقصد اس چائے کی پیالی کو نوش جان کرنا ہوتا۔ سب سے کٹھن مرحلہ اس وقت پیش آتا جب ہم گھر کو لوٹتے۔ وزیر اعظم ہاؤس میں داخل ہونا پل صراط سے گزرنے کے مترادف تھا.... اس گھپ اندھیرے میں کمرے' ڈیوڑھیاں' غلام گردشیں' آسیب زدہ درخت کاٹنے کو دوڑتے۔ ایسے محسوس ہوتا کہ ابھی کوئی خون آشام چمگادڑ دیمک خوردہ کڑیوں سے جھپٹ کر نکلے گا اور شاہ رگ پر اپنے نکیلے دانت گاڑ دے گا یا حشرات الارض میں سے کوئی چیز چھت پر سے لٹک کر گلے کا ہار بن جائے گی' یا کوئی کیڑا مکوڑا یکدم زمین سے اچھل کر پاؤں پر سٹک کر مزاج پرسی کر ڈالے گا۔

یہاں کسی اخبار کی آمد کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لائبریری کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی۔ بجلی شاید تخیل میں چمکتی تھی۔ برف صرف احساس پر پڑتی تھی۔ پھل صرف صبر کا دستیاب تھا۔ دودھ شادی بیاہ کے موقع پر استعمال کیا جاتا اور ٹھنڈا پانی پینے کی بشارت اکثر جمعے کے وعظ میں ملتی۔ اس ٹھنڈے پانی سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ہمارا اندوختہ کم ہو رہا تھا۔ کئی ماہ سے تنخواہ نہ ملی تھی اور کنٹرولر جنرل کے دفتر والے اپنی روایات کو زندہ رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ اس عسرت اور تنگدستی کے زمانے میں ملک صاحب نے ایک ایسی بات کہہ دی جس کی کم از کم مجھے ان جیسے زیرک' سنجیدہ اور دور اندیش انسان سے توقع نہ تھی۔ گرمیوں کے دن تھے' سورج نصف النہار پر تھا' پسینے کے ساتھ جسم سے چربی بھی پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور ہم چارپائیوں پر آنکھیں بند کئے' سونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے کہ ملک صاحب ایک دم بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ "شاہ جی!" ملک صاحب کی گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ کیا کوئی نیا خواب دیکھا ہے؟ میں نے آنکھیں کھولے بغیر پوچھا۔ ان دنوں ملک صاحب کو خواب بہت آتے تھے۔ "خواب نہیں' ایک خیال آیا ہے۔" ملک صاحب نے آواز کو یکجا کرتے ہوئے کہا۔ "فرمایئے!" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "آج ٹھنڈا پانی منگوا کر سکنجبین پی جائے" مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں' آپ بجٹ دیکھ لیں۔ بجٹ کو چونکہ ملک صاحب کنٹرول کرتے تھے' اس لیے میں نے نتائج کے ذمے داری بھی ان پر ڈال دی۔ ملک صاحب خسارے کے بجٹ کے ماہر معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگے فکر نہ کرو' اگر ضرورت پڑی تو میں ادھر ادھر سے

کٹ مارلوں گا' چنانچہ اصولی طور پر یہ طے پایا کہ سکنجبین پی جائے۔ بازار میں جا کر سکنجبین پینا افسرانہ شان کے منافی تھا۔ بنی بنائی سکنجبین بازار سے دستیاب نہ ہوتی تھی۔ صرف ٹھنڈا پانی ایک روپے فی بوتل کے حساب سے ایک دکاندار سے ملتا تھا جو تیل سے چلنے والے فرج میں تیار کرتا تھا۔ لیموں اور چینی اتفاق سے گھر میں موجود تھی۔ چنانچہ سکنجبین بنانے کی تراکیب کا تمام پہلوؤں سے تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ گھر سے بازار کا فاصلہ' اردلی کی سرعت رفتار' درجہ حرارت اور لیموں کاٹنے کا وقت' سب کو جمع تفریق کیا گیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام کام تیز رفتاری سے نہ کیا گیا تو حصول مقصد بھی نہ ہوگا اور رقم کا ضیاع الگ ہوگا۔ چنانچہ ملک صاحب نے بسم اللہ پڑھ کر لیموں کاٹا۔ اس کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پکڑ کر برتن کے اوپر رکھا اور اردلی کو ہدایت کی کہ دوڑ کر ٹھنڈے پانی کی دو بوتلیں لے آئے... اس کے بعد کے واقعات بقول شخصے وضاحت طلب ہیں۔ شاید اردلی نے راستے میں تیز دوڑ نہ لگائی تھی یا دکاندار نے دھوکہ دہی سے کام لیا ہوگا یا اس اثنا میں موسمی تغیر و تبدل نے تمازت آفتاب میں اضافہ کر دیا ہوگا' اور اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ملک صاحب کے ہاتھوں میں وہ پھرتی نہ رہی ہو' کیونکہ جب سکنجبین ہم نے ہونٹوں سے لگائی تو ایسے محسوس ہوا جیسے نیم گرم جو شاندہ پی رہے ہیں۔ میں نے ملک صاحب کو پی جانے والی نظروں سے دیکھا اور ملک صاحب دھڑام سے بستر پر... آپ نے اچھا خاصا نقصان کرا دیا ہے۔ بس آج کے بعد ٹھنڈی چیزیں پینے کا پروگرام ختم! ملک صاحب ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولے۔

وقت کسی نہ کسی طرح کٹ رہا تھا۔ وزیر اعظم ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہمیں آٹھ ماہ ہو چلے تھے۔ اس عرصے میں لاہور میں دو دفعہ محکمانہ امتحان ہو چکا تھا لیکن سیکرٹریٹ والوں نے ہمیں اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے باوجود ہمیں اگر کوئی گلہ شکوہ تھا بھی تو صرف اپنے مقدر سے تھا۔ ارباب بست و کشاد سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ انہوں نے مکران جیسے حقیر ضلع کو طاق نسیاں پر رکھ چھوڑا تھا۔ ان کی فہم و فراست کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ سیکرٹریٹ والوں نے از راہ بندہ پروری یہ استفسار کر ڈالا کہ تربت' مکران سے کتنا دور ہے۔ ڈی سی صاحب نے جواباً لکھ بھیجا کہ تربت' مکران سے اتنا ہی دور ہے جتنا لاہور پنجاب سے... ایک نیم مہذب ضلع کے سربراہ کی یہ جرات رندانہ غالباً مزاج خسروی سے براہ راست متصادم ہوئی تھی۔ اس لیے مکران کی فائل کو سیکرٹریٹ کی کسی ایسی غلام گردش میں ڈال دیا گیا جس کو دریافت کرنے کے لیے پھر کسی کولمبس کی ضرورت تھی اور بالفرض لاہور سے اطلاع بھیج بھی دی جاتی تو یہ مکران پہنچتے پہنچتے قصہ پارینہ بن جاتی۔ شیر شاہ سوری نے ڈاک کا جو نظام رائج کیا تھا وہ اہل مکران کے لیے باعث صدرشک تھا۔ جہاں تار پندرہ بیس یوم میں پہنچتا ہو وہاں خط کو تو اک عمر چاہیے اثر ہونے تک۔

امتحان کے لیے ہمارا اضطراب حاشا وکلا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ہمیں کسی گولڈ میڈل کی آرزو تھی۔ آرزوئیں تو ایک مدت سے ہم

نے مکران کی مٹی میں گوندھ ڈالی تھیں۔ اس وسیع زنداں سے چند دن کی رہائی بھی ہمیں مقصود نہ تھی کیونکہ ہوس گل کا ذرا سا بھی کھٹکا دل زار سے نکل چکا تھا۔ دراصل جس چیز نے ہمیں امتحان دینے کے لیے دیوانہ کر دیا تھا وہ غم روزگار تھا۔ ہر چند کہ ہم امتحان پاس کر کے سروس میں آ گئے تھے لیکن ہماری تنخواہ پر ابھی تک ایک تہائی اور دو تہائیوں کی قدغن لگی ہوئی تھی یعنی ہمیں پوری تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔

طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے تھے پرویزی

تمام سروسز میں یہ شرف صرف ہمیں حاصل تھا کہ پوری تنخواہ کے لیے محکمانہ امتحان پاس کرو۔ ایسی حکمت کی باتیں ہم جیسے فرومایہ انسان بھلا کہاں سمجھ سکتے! ہوسکتا ہے اس کا مقصد ہماری شخصیت کا نکھار ہو... یا پھر سوچ کا گرد و غبار ہو... ہمیں جب اطلاع ملی کہ دو دفعہ محکمانہ امتحان ہو چکا ہے تو ملک صاحب کہنے لگے۔ ''شاہ جی! غضب ہو گیا۔ ہمیں ایک لاکھ روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا ''مبالغہ آرائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آپ نے مذاق مذاق میں سو روپے سے ایک دم لاکھ کی جست کہاں لگا دی؟''۔ تمہاری اتنی عمر نہیں جتنا میرا تجربہ ہے۔'' ملک صاحب نے اپنا سکہ بند فقرا دہرایا۔

ذرا سوچو! اگر سو روپے تنخواہ کم ملے تو سال میں بارہ سو روپے بنتے ہیں۔ بالفرض، تیس سال نوکری کرنی ہے تو یہ چھتیس ہزار بن جاتے ہیں۔ اب ان پر سود مرکب لگاؤ تو رقم لاکھ سے کچھ اوپر ہی اٹھے گی۔'' ''آپ کو بہت دور کی سوجھتی ہے۔ اول تو زندگی کے اس پل صراط پر تیس برس تک سفر کرنا ہی محال ہے، پھر تیس برس تک عافیت کے ساتھ نوکری کرنا بھی دیوانے کا خواب ہے۔ آج کل خزاں میں درختوں سے اتنے پتے نہیں جھڑتے جتنے سرکاری ملازم ہر سال فارغ ہو جاتے ہیں۔ تمہاری یہ قنوطیت تمہیں لے ڈوبے گی۔ ملک صاحب غصے میں بولے اور میں نے چپ ہو جانے ہی میں مصلحت سمجھی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ تربت مکران کا صدر مقام ہے۔ شہر کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ سڑکیں، مکانات، دکانیں، دفتر کوئی بھی عمارت ایسی نہیں جس پر پختگی کی تہمت لگائی جا سکے۔ البتہ محکمہ تعمیرات کی کرمفرمائی سے اب کہیں پکی عمارتیں نظر آنے لگی ہیں۔ شہر کی نصف آبادی باہر، کھجور اور پیش کے بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہتی ہے۔ کھجور اور مچھلی اہل مکران کی بنیادی خوراک ہیں۔ صنعت و حرفت اور زرعی زمین کے فقدان کی وجہ سے روزگار کے مواقع محدود ہیں۔ اس وجہ سے شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جس کا کوئی نہ کوئی فرد باہر خلیج فارس کی ریاستوں میں نوکری نہ کرتا ہو۔ ہر سال کھجور کے موسم میں یہ لوگ چھٹی لے کر مکران واپس آتے ہیں تو اپنے ساتھ ولایتی ٹرانزسٹر اور کپڑوں کے تھان لے آتے ہیں اور انہی چیزوں کی فروخت سے ہر گھر کا کاروبار چلتا ہے۔ محکمہ شاہرات والوں نے بھی خاصے آدمی کھپائے ہوئے ہیں۔ سمگلنگ بذات خود کئی لوگوں کے کاروبار کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ یہ لوگ نہ

صرف بدیشی مال کو کراچی اور کوئٹہ پہنچانے میں ممد اور معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ اندرون ملک سے باہر غیر قانونی طور پر جانے والے پاکستانیوں کی بھی رہنمائی کرتے ہیں اور اس کام کے لیے باقاعدہ تنظیمیں بنی ہوئی ہیں جن کے مخصوص ''کوڈ'' ہیں اور نہایت مہارت سے یہ گھناؤنا کاروبار کرتی ہیں۔ایک دفعہ ان لوگوں سے میرا بھی ٹکراؤ ہوا تھا جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

ویسے تو روپے پیسے کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے' لیکن ایک مکرانی کے لیے یہ ضرورت ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ایک خاص مقصد کے لیے وہ عمر عزیز کے بیشتر ماہ وسال اس کے حصول میں صرف کر دیتا ہے۔قاری یقیناً وہ مقصد جاننا چاہے گا جس کے لیے انہیں اتنی تگ ودو کرنا پڑتی ہے۔

زرولور یالب' یہ وہ رقم ہے جو شادی سے قبل اسے اپنے سسرال والوں کو دینا ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں لڑکی کی پیدائش کو نیک فال گردانا جاتا ہے۔دلہن کے گہنے پاتے' اس کا ہار سنگھار' بارات کا قیام وطعام' الغرض ہر چیز دولہا میاں کے ذمے ہوتی ہے۔اس ایک دن کی آرزو میں بیچارا سالہا سال وقت کی گاڑی میں جتا رہتا ہے۔بہر حال' مکرانی حسب حیثیت شادی بیاہ کی رسومات بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔شادی سے کئی یوم قبل ہی محفل رقص اور سرود شروع ہو جاتی ہے۔ہلو ہالیس' اور لیلڑ ولاڑو کی تال پر زن ومرد رقص کرتے ہیں۔عورتوں کی آواز میں ایک خاص کھنک ہوتی ہے۔ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کئی کانچ کی چوڑیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔بارات بڑی دھوم دھام سے باجے اور نفیریاں بجاتی دلہن کے گھر جاتی ہے اور نکاح کے بعد بوجھل قدموں اور بجھے دل کے ساتھ واپس لوٹ آتی ہے' کیونکہ دولہا میاں اپنے سسرال ہی میں ڈٹ جاتے ہیں۔بعض دفعہ ایک مکرانی کو ایک سال تک اپنے سسرال میں رہنا پڑتا ہے۔مکران میں ایک مثل مشہور ہے کہ اگر کسی مکرانی کو تلاش کرنا ہو تو اس کے سسرال میں جاؤ اور اگر کسی گائے کی تلاش مقصود ہو' تو وہ آپ کو اپنے پہلے مالک کے کھونٹے پر بندھی ملے گی۔

مکرانیوں کے اصل لباس کی تفصیل تو آپ کو تاریخ کے کسی مدفن ہی میں مل سکے گی' لیکن یہ امر واقع ہے کہ یہاں کے چپڑاسی بھی بوسکی اور کے ٹی زیب تن کئے نظر آئیں گے' چاہے گھر میں دو وقت کا راشن ہو یا نہ ہو۔پانچ سو پچپن کے سگریٹ پھونکیں گے' چاہے جوتیاں چیخ کر الف ہو گئی ہوں۔

سیاسی اور سماجی شعور پختگی کی منازل طے کرتا ہوا کچھ زیادہ ہی پک گیا ہے۔اپنے حقوق منوانے کے لیے فوراً یکجا ہو جائیں گے۔ایک دفعہ ہمارے ایک دوست بطور سپرنٹنڈنٹ بورڈ کا امتحان لینے مستونگ سے تربت آئے۔پرچہ دیتے وقت جب طلبہ نے حسب عادت کتابوں سے استفادہ کرنا شروع کیا اور موصوف نے انہیں اس کار خیر سے روکنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے تو طلبہ نے کرسیوں

اور ڈنڈوں سے ان کی اور ان کے عملے کی تواضع کر ڈالی۔ آنجناب ابھی مرہم پٹی سے فارغ بھی نہ ہو پائے تھے کہ تمام شہر لاٹھیاں لے کر حق مہمان نوازی ادا کرنے آن پہنچا۔ ''آپ نے ہمارے بچوں کو نقل لگانے سے کیوں روکا ہے؟'' ہر شخص کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ملک غلام مصطفیٰ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ملک صاحب اپنی عدالت میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ ایک طالب علم سائیکل کی گھنٹی بجاتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوا۔ ملک صاحب نے اسے اندر بلا کر تھوڑی سی سرزنش کی تو ہونہار بروا کہنے لگا ''گھنٹی ہی بجائی ہے' کون سا عدالت کو مسمار کر دیا ہے؟'' ملک صاحب نے اسے کہا ''تمہیں شرم آنی چاہیے۔ پڑھے لکھے ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو!'' بس پھر کیا تھا' سارے شہر نے ہڑتال کا نوٹس دے دیا۔ بڑی مشکل سے صلح صفائی ہوئی اور خطرہ ٹلا۔

اس بات سے قطع نظر کہ تربت ایک تاریخی شہر ہے۔ اس کی اہمیت کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں۔ جس طرح مسلمانوں کے لیے مکہ متبرک مقام ہے' اسی طرح ذکری مذہب کا مرکز تربت ہے۔ ہر سال سندھ' بلوچستان اور عراق تک سے ہزاروں ذکری حج کے لیے تربت اکٹھے ہوتے ہیں اور کوہ مراد پر اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ کوہ مراد تربت سے تین میل کے فاصلے پر ہے جہاں ذکریوں نے اپنی عبادت گاہیں بنا رکھی ہیں۔ وہاں عام مسلمانوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ ایک مقامی کاریز کو یہ بطور آب زمزم استعمال کرتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کے عقائد عجیب و غریب ہیں۔ ان کے اور ایک عام مسلمان کے درمیان صرف ایک ہی ناتا ہے اور وہ یہ کہ ذکری بھی قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کے اور ایک عام مسلمان کے عقائد اور رسومات میں بڑا فرق ہے۔ یہ اپنی عبادت کو ذکر کہتے ہیں' اس لیے اس نام کی مناسبت سے ذکری کہلاتے ہیں۔

ذکریوں کے مذہب اور رسومات کے متعلق کئی روایات مشہور ہیں اور اس ضمن میں کئی قصے بھی گھڑے گئے ہیں۔ ان کی دو مذہبی کتابوں' سفر نامہ مہدی' اور' تردید مہدویت' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس فرقے کی ابتدا ہندوستان سے ہوئی اور ان مذہب کی بنیاد محمد جونپوری نے رکھی۔ سید محمد کے متعلق کئی مورخین کا خیال ہے کہ وہ افغانستان کا باشندہ تھا' بعض کے خیال میں سید تھا۔ جب محمد جونپور سے علاقہ بدر ہوا تو اس نے دکن میں پناہ لی جہاں کے مقامی حاکم کو وہ اپنے حلقہ ارادات میں لے آیا۔ جب مقامی مسلمانوں نے نئے مذہب کے خلاف بغاوت کر دی تو اسے دکن چھوڑنے ہی میں عافیت نظر آئی۔ پر آشوب سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا وہ گجرات کاٹھیاواڑ پہنچا۔ لیکن یہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی تو صحرائے بیکانیر اور جیسلمیر سے ہوتا ہوا سندھ پہنچا۔ قندھار میں شاہ بیگ ارغوان اس کا مرید بن گیا۔ جب علمائے کرام نے دیکھا کہ مذہب حقہ کے مقابلے میں ایک غلط مذہب رائج ہو گیا ہے تو انہوں نے بغاوت کر ڈالی۔ اور اس طرح ایک دفعہ پھر محمد مذکور کو قندھار چھوڑنا پڑا۔ وہ قندھار سے فراہ پہنچا اور یہاں' تردید مہدویت' کے

مطابق فوت ہو گیا۔ مکرانی ذکریوں کا عقیدہ ہے کہ وہ مرا نہیں تھا' بلکہ فراہ سے غائب ہو کر مکہ پہنچا۔ مکہ سے مدینہ اور پھر شام گیا... پھر مکران آ کر کوہ مراد پر مستقل رہائش رکھی۔ دس سال تک رشد و ہدایت کے چشمے پھوٹتے رہے اور جب تمام مکران ذکری مذہب کا پیرو کار ہو گیا تو اس نے وفات پائی۔

ابوالفضل نے سید محمد جونپوری کی جو تاریخ لکھی ہے' مندرجہ بالا آراء اس سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔ ابوالفضل کے مطابق یہ سید بڈھا اویسی کا بیٹا تھا اور مذہبی تعلیم نے چونکہ اسے بھٹکا دیا تھا اس لیے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی یہ ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۵۰۵ء میں فوت ہوا۔

ایک روایت کے مطابق سید محمد جونپوری جب مغلوں کے زمانے میں معتوب ہوا اور مکران آیا تو یہاں کے باشندوں کو اس نے اپنی پیروی کے لیے موزوں پایا اور ان کو اپنے حلقہ ارادت میں لے لیا۔ جب کچھ لوگوں نے اس سے کہا کہ ہر نبی کوئی نہ کوئی معجزہ لے کر آتا ہے' تم بھی اپنا اعجاز دکھاؤ تو اس نے اگلے موسم بہار میں معجزہ دکھانے کا وعدہ کیا' چنانچہ جب خزاں کا موسم آیا اور مکران میں گنتی کے چند درخت ٹنڈ منڈ ہو گئے تو اس نے ایک چمڑے کے خول میں ایک کتاب بند کی' پھر ایک درخت کا تنا کھود کر اس میں چھپا دی۔ جب بہار آئی اور ہری ہری کونپلیں پھوٹیں تو اس نے تمام لوگوں کو کوہ مراد پر جمع کیا اور کہا مجھے بشارت ہوئی ہے کہ جو کتاب تم پر اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے وہ فلاں درخت کے تنے میں موجود ہے' چنانچہ سارے لوگ جب وہاں پہنچے اور انہوں نے درخت کے تنے کو کاٹ کر جھانکا تو سچ مچ کتاب موجود تھی۔ موصوف نے اسی پر اکتفا نہ کیا' بلکہ دودھ کے چند مشکیزے ایک گڑھے میں ڈال کر ان پر مٹی کی باریک تہہ جما دی۔ تمام لوگوں کو ایک بار پھر اکٹھا کیا۔ "پیغمبر" صاحب نے اپنی سرخ نشیلی آنکھوں کو اوپر اٹھایا' چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہوئے' نیزے کو فضا میں بلند کر کے زمین میں گاڑا تو دودھ پہاڑی چشمے کی طرح پھوٹ نکلا۔ تمام مجمع عش عش کر اٹھا۔ حضرت کو اپنی کمزوری کا علم تھا۔ پیشتر اس کے کہ ان کا بھانڈہ بیچ چوراہے میں پھوٹ جاتا' انہوں نے با آواز بلند کہا۔ "اسے مٹی سے فوراً بند کرو' نہیں تو دودھ کی بے لگام موجیں تمام مکران کو غرق شیر کر دیں گی۔" خوفزدہ لوگوں نے فوراً مٹی ڈال کر حکم کی تعمیل کر دی۔ اس طرح اس مذہب کی بنیاد پڑی جس کے پیروکار اب کراچی سے لے کر عراق تک پھیلے ہوئے ہیں اور ہر سال ماہ رمضان میں کوہ مراد پر حج کی غرض سے جمع ہوتے ہیں اور ایک مقامی کاریز کے پانی کو بطور آب زمزم استعمال کرتے ہیں۔

جب میر نصیر خاں اول نے دیکھا کہ ذکری مذہب کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور اس کی ریاست کو ذکریوں سے خطرہ لاحق ہے تو اس کی تیغ بے نیام ہوئی اور مکران کی خشک زمین ان کے خون سے سرخ ہو گئی۔

اس روایت سے قطع نظر تاریخی واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سید محمد جونپوری از خود مکران نہیں آیا تھا بلکہ اس کے تابعین نے اس مذہب کو مکران تک پہنچایا جن میں میاں عبداللہ نیازی کا نام خاصا مشہور ہے۔ بہر حال' یہ امر مسلمہ ہے کہ جب بلیدی مکران پر قابض ہوئے تو اس مذہب کی جڑیں مضبوط ہونا شروع ہوئیں۔ خیال ہے کہ پہلا بلیدی حکمران بوسعید' جو وادی ہلمند کے علاقے گرمسل سے آیا تھا' اس مذہب کو اپنے ساتھ لایا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سید محمد جونپوری فراہ میں فوت ہوا تھا اور چونکہ فراہ وادی ہلمند سے بہت قریب ہے' اس لے اغلب خیال یہی ہے کہ بوسعید' سید محمد جونپوری کی تعلیمات سے بالواسطہ متاثر ہوا ہوگا۔

بلیدیوں کے زمانے میں مکران میں ذکری مذہب خوب پھلا پھولا اور جب مراد گچی نے بلیدیوں کو نکال باہر کیا تو اس مذہب کو باقاعدہ فلسفیانہ رنگ دیا گیا اور مذہب حقہ کے مقابلے میں رسومات گھڑی گئیں۔ ذکری حسب ذیل عقائد پر یقین رکھتے ہیں۔

۱۔ رسالت ماب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ان کی جگہ مہدی جونپوری نے لے لی ہے۔

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو قرآن لے کر آئے تھے اس کی تاویل وتفسیر مہدی کے ذمے کر دی گئی ہے۔

۳۔ نماز کی جگہ ذکر نے لے لی ہے۔

۴۔ اسی طرح روزہ رکھنے کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۵۔ کلمہ طیبہ کی جگہ "لا الہ اللہ محمد مہدی رسول اللہ" پڑھا جائے۔

۶۔ زکوۃ کی جگہ صرف عشر دینا واجب ہے۔

۷۔ دنیا کی رنگینیوں اور دنیا سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ذکر کرنے کے دو طریقے ہیں' ایک ذکر جلی جو بلند آواز سے کیا جاتا ہے اور دوسرا ذکر خفی جسے صرف دل میں دہرایا جاتا ہے۔ یہ ذکر دس بارہ سطور پر مشتمل ہے جسے دن میں چھ مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔

ویسے تو ذکری مذہب میں عبادت کے کئی طریقے ہیں لیکن ان میں جو سب سے دلچسپ ہے وہ "کشتی" ہے۔ "کشتی" کی رسم جمعہ کی اس رات کو ادا کی جاتی ہے جو چاند کی چودھویں تاریخ کے نزدیک ہوتی ہے یا پھر ذوالحجہ کی پہلی دس راتوں کو اس تقریب کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ عیدالاضحیٰ کے بعد پہلا دن بھی اس رسم کے لیے موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ ذوالحجہ کی نویں رات "کشتی اکبر" منعقد ہوتی ہے۔ شادیاں اور ختنے کشتی کی رات کو کئے جاتے ہیں کیونکہ ذکریوں کے نزدیک یہ نہایت متبرک موقع ہوتا ہے۔ زن ومرد ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں اور ایک خوش الحان عورت مہدی کی شان میں قصیدے پڑھتی ہے جبکہ مرد صرف طرح مصرع

دہراتے ہیں۔ عورت اپنی سریلی آواز میں "ہادیہ" پکارتی ہے تو تمام مرد یک آواز "گل مہدیہ" الاپتے ہیں۔ یہ سلسلہ تمام رات جاری رہتا ہے اور اس وقت بند ہوتا ہے جب تھک کر زن و مرد نڈھال ہو جاتے ہیں۔ ذکریوں کی جائے عبادت کو "ذکرینہ" کہتے ہیں جو کھجور کے پتوں اور مٹی کی اینٹوں سے بنائی جاتی ہے۔ عبادت کے لیے کوئی خاص سمت مقرر نہیں ہوتی' جدھر ان کا امام منہ کرتا ہے تمام ذکریوں کا منہ بھی ادھر ہی پھر جاتا ہے۔ اپنے مردوں کو مسلمانوں کی طرح قبر میں دفناتے ہیں' لیکن نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاتی۔

اس کے علاوہ نواب مکران کا ہیڈ کوارٹر بھی تربت میں ہے۔ اس وقت نواب بائی خان مکران کے نواب تھے۔ نواب صاحب کا اکلوتا محل جوان کے نواب بننے کے بعد تعمیر ہوا تھا' تربت سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ نواب صاحب کا تعلق بگی خاندان سے تھا۔ تقسیم سے قبل مکران پر خان قلات کی عملداری تھی' اس لیے بائی خان صرف رسالدار لیویز تھے۔ چونکہ خان قلات کا رویہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کے ساتھ کچھ زیادہ دوستانہ نہ تھا اور روز بروز خان کی وفاداریاں مشکوک ہوتی جا رہی تھیں' اس لیے حکومت پاکستان کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ تاریخی عمل کو دہراتے ہوئے حق بہ حقدار رسید کر دیا جائے۔ ایک شام رسالدار لیویز بائی خان کو گورنر جنرل ہاؤس کراچی طلب کیا گیا۔ جب بائی خان ملاقات کر کے باہر نکلا تو وہ رسالدار نہ تھا نواب بن چکا تھا بائی خان نے بھی اپنے عہد کو نبھایا اور پاکستان کے ساتھ مکران کی ریاست کا الحاق کر دیا۔

نواب صاحب بڑے دلچسپ انسان تھے۔ گہرا سانولا رنگ' درمیانہ قد' گٹھا ہوا جسم اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے پناہ چمک جوان کی ذہانت کی آئینہ دار تھی۔ تعلیم گو واجبی تھی' لیکن تجربے کی بنیاد پر بہت سی مدبرانہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔ نواب صاحب نے کئی شادیاں کر رکھی تھیں' بیشتر تو نواب بننے سے پہلے کی تھیں اور ایک دو اس منصب پر فائز ہونے کے بعد کیں۔ شاید یہ رموز مملکت کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ نواب صاحب بڑے کم گو' زیرک اور متوازن انسان تھے۔ مسائل کی تہہ تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہ لگتی۔ ماضی کی تلخیوں اور تجربات و حادثات نے ان کے فہم و ادراک کو اس قابل بنا دیا تھا کہ مستقبل کی نشاندہی کر سکیں' چنانچہ فکر فردا نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ جانشین کا مسئلہ رسم و رواج سے ہٹ کر حالات کے مطابق حل کیا جائے۔ نواب صاحب کا سب سے بڑا لڑکا نواب حمید اللہ خان تھا جسے قانونی اور رسم و رواج کے مطابق ان کے بعد نواب بننا تھا لیکن نواب مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ ان کے بعد شیخ عمر جو حمید اللہ سے چھوٹا تھا اور دوسری بیوی سے تھا' اس منصب پر فائز ہو۔

شیخ عمر دور ایوبی میں صوبائی اسمبلی کا رکن تھا۔ ہر چند کہ حمید اللہ خاں تمام بھائیوں سے زیادہ باحوصلہ' جرات مند اور فیاض تھا لیکن نواب صاحب اس کی لاابالی طبیعت اور تیز قدمی سے خائف رہتے تھے۔ گو دونوں بھائیوں کی تعلیم اپنے دستخط کرنے تک محدود تھی لیکن

شیخ عمر نے سیاسی نشیب و فراز میں چل کر جو تجربہ حاصل کیا تھا' حمید اللہ خاں اس سے قطعی نابلد تھا۔ کہاں دورِ ایوبی کا ایک شاطر سیاستدان اور کہاں ایک سیدھا سادا نواب زادہ جس کا حلقۂ احباب کراچی کے نائٹ کلبوں تک محدود تھا اور فکر اپنے محیط سے باہر بھی نہ جاسکتی تھی۔ اگر یہ سچ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو پھر یہ دونوں باپ بیٹے بھی اسی دوراہے پر کھڑے تھے جہاں سے کاروانِ مغلیہ بار بار گزرا تھا۔ خون بہر حال خون ہے' لیکن جب یہ ہوسِ اقتدار کی تنگناؤں سے گزرتا ہے تو پھر خون نہیں رہتا' گدلا پانی بن جاتا ہے۔ اگر اورنگزیب' شاہجہاں کو قلعے میں بند کر کے بھی مطمئن نہیں تھا تو حمید اللہ یہ دیکھ کر کہ اس کا اپنا حق اس کے چھوٹے بھائی کو منتقل کیا جارہا ہے' کیسے خوش رہ سکتا تھا؟ نواب صاحب زندگی کے اس موڑ پر پہنچ چکے تھے جہاں موت اور حیات میں صرف ایک جست کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور ہر لمحہ یہ گمان ہوتا ہے کہ سینے کی دھونکی سے نکلتا ہوا کا ہر جھونکا چراغ زیست کی لو کو سرد کر دے گا....

وہ موسم سرما کی ایک شام تھی جب خبر آئی کہ نواب بائی خاں کی طبیعت خطرناک حد تک بگڑ چکی ہے اور مسلسل ہچکیاں آرہی ہیں۔ مکران کے واحد ڈاکٹر کی یہ آخری رائے تھی کہ شاید اس شام کی صبح نواب صاحب کو دیکھنا نصیب نہ ہو۔ نواب صاحب کے دیگر فرزندان تو شاید محل میں ہوں' لیکن حمید اللہ اس وقت ہمارے ساتھ بیٹھا ریسٹ ہاؤس میں تاش کھیل رہا تھا۔ خبر سن کر حمید اللہ بظاہر ملول نظر آتا تھا' لیکن درپردہ اس کے ذہن کے پرسکون سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں شاید کوئی مدوجزر اٹھ رہا تھا۔ ڈاکٹر ریاض' حمید اللہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''یار! اتنے اداس نہ ہو۔ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ نواب صاحب نے اپنا وقت بہت اچھا گزارا ہے۔ اب وہ اپنے خالقِ حقیقی سے ملنے والے ہیں... تمہیں ریاست کا انتظام بھی سنبھالنا ہے۔ اگر ابھی سے دل ہار بیٹھے تو آگے چل کر طوفانوں کا مقابلہ کیسے کرو گے؟'' ڈاکٹر ریاض ایک لمحہ کے لیے رکا' پھر کہنے لگا: ''یار نواب بن کر اپنا وعدہ نہ بھولنا۔'' ساتھ ہی ڈاکٹر نے مکینکی انداز میں حمید اللہ خان کا ہاتھ دبایا۔

اب اسی طرح یار لوگوں نے جو تقاضے شروع کیے تو حمید اللہ بیچارہ 'اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے' کے مصداق کبھی گھڑی کو دیکھتا کبھی احباب کو....

خبر آئی کہ نواب صاحب کی ہچکیاں تیز ہوگئی ہیں.... پتہ چلا کہ ڈی سی نے اپنی شیروانی استری کروانے بھجوادی ہے... مشہور ہوا کہ نواب صاحب کی سانس اکھڑنے لگی ہے۔

تمام رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ جب کسی موٹر کی بھوں بھوں' فضا میں ارتعاش پیدا کرتی تو وہم ہوتا کہ بری خبر سننے کی گھڑی آ

پہنچی۔ کوئی گیدڑ قریبی جنگل میں ہوکتا تو کسی کے بین کرنے کا گمان ہوتا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی ایک چھناکے کے ساتھ بج اٹھتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی کے ساز کی آخری دھن اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ جب رات کی سیاہی سپیدہ سحر میں تحلیل ہوگئی اور سورج کی شریر کرن نے مشرقی روشن دان سے اندر جھانکا تو ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ جیپ نکلوائی اور ہم سب بھاگم بھاگ محل پہنچے تو سراسیمگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ چھوٹا شہزادہ باہر کھڑا ہر آنے جانے والے فرد اور گاڑیوں کو گھور رہا تھا۔

نواب صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟ ملک صاحب بے ساختہ پوچھ بیٹھے۔

خاصی سنبھل گئی ہے۔ وہ ہنسی بکھیرتے ہوئے بولا اور ہم سب ہکا بکا رہ گئے اور ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

حمید اللہ کی طبیعت کیسی ہے؟ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

نواب صاحب کا سرکاری وظیفہ ان کے اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اس لیے اکثر تنگ دست رہتے‘ طبعاً فیاض انسان تھے پھر اولاد ماشاء اللہ اتنی کثیر تھی کہ چاہتے تو ریاست کی فوج کھڑی کر سکتے تھے۔ عام آدمی انہیں ریاست کا کار مختار سمجھتا لیکن اصل صورت اس سے بڑی مختلف تھی۔ عملاً تمام ریاست پر پی ڈبلیو ڈی کے محکمے کا تسلط تھا جو آن بان اور جاہ و حشم افسران محکمہ کا تھا اس کا تصور بھی نواب صاحب کے لیے ممکن نہ تھا۔ نواب صاحب کے آدھے فرزندان کی پے لسٹ پر تھے۔ محکمے کے مقامی سربراہ نے جو وہاں ”پرنس“ کے نام سے مشہور تھا اور سال کا بیشتر حصہ کراچی کے نائٹ کلبوں میں صرف کرتا تھا‘ حکم دے رکھا تھا کہ مکران کے ریسٹ ہاؤسوں میں جو شخص بھی ٹھہرے گا‘ وہ اس کا ذاتی مہمان تصور ہوگا۔ اگر تربت کی پرسکون فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا اور ”لوہے کی چیل“ فضا میں ڈولتی نظر آتی تو یار لوگ سمجھ جاتے کوئی نیا ٹھیکہ منظور ہوا ہے۔

اتنے خطرناک علاقے کا دورہ کرنا اعلیٰ افسروں کے لیے ممکن نہ تھا۔ ان کے اکثر دورے اخباروں تک محدود رہتے اور بالفرض کوئی بھولا بھٹکا افسر آ بھی جاتا تو شکایت کون کرتا؟ بااثر افراد ان کی جیب میں تھے۔ عوام کی بات کون سنتا؟

مکران کے خارزاروں میں جو بہار ان لوگوں نے پیدا کر رکھی تھی‘ وہ الف لیلوی‘ قصوں کو مات کر دیتی تھی۔ انہوں نے کراچی میں فلم کمپنیوں کے باقاعدہ دفتر کھول رکھے تھے جہاں ہمہ وقتی عملہ تعینات تھا۔ اخبارات میں ’نئے چہروں کی تلاش‘ کے اشتہارات نکلتے اور پھر ان کا انٹرویو موصوف کالے شیشوں والی عینک لگا کر خود لیتے۔ کہتے ہیں کراچی کے ایک نائٹ کلب میں اس زمانے کے ورکس منسٹر بیٹھے ہوئے تھے کہ موصوف تشریف لائے۔ ان کی آمد سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ جب مہ وشوں کا جمگھٹ ان کے اردگرد شہد

کی مکھیوں کی طرح جھنجھنانے لگا اور حسینائیں لپک لپک کر ان پر گرنے لگیں تو وزیر صاحب نے بڑی سبکی محسوس کی۔ انہوں نے گھٹی گھٹی آواز میں ایک شخص سے پوچھا۔

''یہ کون سی ریاست کا شہزادہ ہے؟''

اصل صورت حال معلوم ہونے پر اس وقت تو غصہ پی گئے' لیکن دوسرے دن دفتر جا کر جو سب سے پہلا کام انہوں نے کیا' وہ موصوف کی معطلی کے احکامات تھے۔

برداشت کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر کوئی واضح مقصد یا نصب العین سامنے ہو تو انسان تمام عمر کانٹوں کی سیج پر بھی گزار دیتا ہے۔ ہر تکلیف ہنس کر سہہ لیتا ہے مصائب میں بھی آسودگی کے پہلو تلاش کرتا ہے۔ زندگی کے سفر میں اکثر ایسے موڑ آتے ہیں جہاں آدمی کچھ دیر کے لیے رکتا ہے اور اپنے اندر جھانکتا ہے اور اس طرح اپنی منزل کا تعین کرتا ہے۔ بے مقصد چلنے سے گو ہر مراد ہاتھ نہیں آتا' صرف آبلہ پائی مقدر بن جاتی ہے۔ وزیر اعظم ہاؤس میں ہمارے اعصاب پر مسلسل دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وقت کی رفتار تھمتی ہوئی نظر آتی' جہاں دن' رات کے انتظار میں سسک سسک کر تمام ہو جائے اور شام کو صبح کرنے کے لیے کسی فرہاد کے تیشے کی ضرورت محسوس ہو وہاں اعصاب چھوڑ' روح بھی چٹخنے لگتی ہے۔ آخر ایک روز جب ہمیں فشار خون سے اپنی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں تو ہم چق اٹھا کر ڈی سی صاحب کے کمرے میں دھمکے... ''اینی پرابلم؟''.... ڈی سی صاحب نے اپنا مخصوص فقرہ دہرایا۔ ''جناب! سب سے بڑا پرابلم تو ہم خود ہیں جو آپ کو اکثر تکلیف دیتے رہتے ہیں۔'' ملک صاحب کہنے لگے ''نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں'' ڈی سی صاحب مسکرائے۔ ''جناب! بات یہ ہے کہ وزیر اعظم ہاؤس ہمیں راس نہیں آیا۔ اگر ہو سکے تو ہمیں ریسٹ ہاؤس منتقل ہونے کی اجازت دی جائے۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں' آپ ایکسین سے بات کر لیں۔ ریسٹ ہاؤس میں شاذ و نادر ہی آ کر کوئی ٹھہرتا' اس لیے محکمے کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم نے دوسرے دن ہی وزیر اعظم ہاؤس کو الوداع کہا اور ریسٹ ہاؤس منتقل ہو گئے۔

ریسٹ ہاؤس میں آ کر ہمیں جو خوشی ہوئی وہ ایسی ہی تھی جیسے کسی ''سی'' کلاس کے قیدی کو ''اے'' کلاس میں منتقل کر دیا جائے۔ قید صرف جسمانی ہی نہیں ہوتی' ذہنی بھی ہوتی ہے اور اکثر سیانے کہہ گئے ہیں کہ پہلی کی نسبت دوسری خاصی خطرناک ہوتی ہے۔ بہر حال ریسٹ ہاؤس میں ہمیں جو سہولتیں میسر تھیں' ان کا پہلے مکان میں تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے' مثلاً سونے کے لیے بان کی بنی ہوئی کھردری چارپائی کی بجائے نواڑی پلنگ تھا۔ پینے کے لیے بوسیدہ کنویں کے سڑے ہوئے پانی کی بجائے کاریز' کا بہتا ہوا شفاف پانی بھی دستیاب تھا اور نہانے کے لیے شفاف سفید ٹائلیوں کا بنا ہوا غسلخانہ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ خشک مچھلی کی

ناگوار بو جو وہاں سرشام ہی ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی' یہاں تک نہ پہنچ پاتی۔ اس کے علاوہ بھی چند مراعات تھیں جن سے استفادہ کرنا ہم نے مناسب نہ سمجھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس بھی دیگر بنگلوں کی طرح بی اینڈ آر کی ملکیت تھا اور یہ وہ شاہی محکمہ تھا جس کا ضلعی سربراہ بننے کی خواہش نواب مکران کے دل کے کسی کونے کھدرے میں بھی ضرور چھپی ہوگی۔

ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ وقت نے پھر انگڑائی لی۔ ہر کارہ آیا کہ ڈی سی صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ ''خدا خیر کرے'' ملک صاحب نے میری طرف دیکھا اور دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگے۔ ہم جب دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ تین ماہ کے لیے ہمیں جیل ٹریننگ کے لیے مچھ بھیجا جا رہا ہے۔ ''کیا مزید کسی جیل ٹریننگ کی ضرورت ہے؟'' میں نے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ ''جیل میں رہنا اور جیل ٹریننگ میں بڑا فرق ہے!'' ملک صاحب خوشی سے دہرے ہوئے جا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے کانوں میں صور اسرافیل پھونکا جا رہا ہے۔ چلو گھر جا کر رخت سفر باندھیں'' چنانچہ ہم فوراً ریسٹ ہاؤس واپس آئے اور مچھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔

پیشتر اس کے کہ سفرنامے کے دوسرے حصے کا آغاز ہو آئیے تاریخ بلوچستان اور بلوچ کلچر پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالیں۔



تاریخ بلوچستان

اس خطہ زمین پر جسے آج بلوچستان کے نام سے پکارا جاتا ہے' انسانی زندگی کے آثار تین ہزار قبل مسیح میں بھی پائے جاتے تھے۔ تاریخی شواہد اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس وقت اس خطہ ارض میں بڑی بارشیں ہوا کرتی تھیں۔ آب و ہوا خوشگوار تھی۔

جو ستوپے (Monds) برآمد ہوئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ ماقبل از تاریخ بھی اس خطے پر انسان بستے تھے۔ اس علاقے میں انسانی زندگی کی ابتدا غالباً اس وقت ہوئی جب بنی نوع آدم نے وادی سندھ میں قدم رکھے۔ ایس پگٹ (S.Piggot) کے مطابق بولان پاس' نال ویلی' کولواہ اور ژوب میں چار مختلف طبقات کے لوگ بستے تھے۔ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت اسماری (Sumerian) مکران اور جنوبی بلوچستان کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔

پہلا تاریخ دان ''ہیرووڈوٹس'' لکھتا ہے کہ مائی کنز (My Kins) ایرانی سلطنت کے چودھویں صوبے میں شامل تھے جس کی بنیاد داریوش (Darious) نے چھٹی صدی قبل مسیح میں رکھی تھی۔ مکران اور اس سے ملحقہ ایرانی علاقے کو اس وقت سرزمین ماکا کہا جاتا تھا۔ یہ علاقہ اس وقت بھی اتنا دشوار گزار تھا کہ ایک روایت کے مطابق دیومالائی اسماری (Semiramis) اور سائرس اعظم کیخسرو کی فوجیں بلوچستان کے ریگستان میں دفن ہو گئی تھیں لیکن پہلی مرتبہ بلوچستان صفحہ تاریخ پر اس وقت ابھرتا ہے جب سکندر اعظم نے ۳۲۶ ق م میں ہندوستان پر حملہ کیا۔

راجہ پورس کو شکست دینے کے بعد جب سکندر اعظم کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تو سکندر کو چاروناچار واپس ہونا پڑا۔ واپسی پر اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ مرکزی فوج کی کمان اس نے خود سنبھالی اور براستہ لسبیلہ اور مکران' یونان کی جانب بڑھا جبکہ اس کا معتمد جرنیل نیرکس Near Chus ساحل کے ساتھ ساتھ باقی ماندہ فوج لے کر خلیج فارس روانہ ہوا۔ تیسرا جرنیل کریٹیس جس کے ذمے بیماروں اور ہاتھیوں کی نگہداشت تھی اور جس کو سکندر اعظم سندھ چھوڑ آیا تھا' براستہ مولا پاس اور شمالی بلوچستان ہوتا ہوا ہلال رود (Hilal Rud) کی وادی میں سکندر سے جاملا۔

مکران کے ساحل کے ساتھ ساتھ سکندر اعظم کا سفر نہایت دلچسپ تاریخی واقعات کا حامل ہے۔ اس کٹھن اور دشوار گزار راستے پر سکندر کا سفر کسی لاعلمی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اسے بتایا گیا تھا کہ قبل ازیں سائرس اور سمری کی فوجیں اس علاقے میں نیست و نابود ہو

چکی ہیں، لیکن خطر پسند سکندر نے اس تاریخی المیے کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا اور تہیہ کیا کہ وہ اپنی فوج کو اسی راستے سے لے کر جائے گا ... سکندر کے اس خطرناک اور پر آشوب سفر نے تاریخ کے سینے پر جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان کے متعلق ارائین (Arrains) لکھتا ہے:

''گذروشیہ (Gadrosia) اس خطہ زمین کو بولتے ہیں جو لسبیلہ (Oreitai) سے شروع ہو کر کرمان تک جا پہنچتا ہے۔ سکندر اعظم اپنے تیراندازوں، گھڑسواروں اور پیادہ فوج کی معیت کی گذروشیہ کی طرف بڑھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا راستہ ایک تنگنائے سے گزرتا ہے جس کے دہانے پر لسبیلہ اور گذروشیہ کی فوجیں کیل کانٹے سے لیس ہو کر مقابلے کے لیے تیار کھڑی ہیں اور اس کا راستہ روکیں گی۔ سکندر کے لیے اس قسم کی اطلاع کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ بے خطر آگے بڑھا۔ جب دشمن کو پتہ چلا کہ سکندر اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے تو بے شمار سپاہی اپنی چوکیوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور تتر بتر۔ لسبیلہ کے حکام نے شکست تسلیم کرنے میں اپنی عافیت سمجھی۔ سکندر نے حکم دیا کہ دشمن فوج فوراً منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائے اور اس کے بعد اپنے جرنیل اپولوفینز کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ اپنی فوج کے کچھ سپاہی اور تیرانداز اس کی کمان میں چھوڑ کر وہ اپنی باقی فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔

سکندر نے گذروشیہ کے ریگستان کا کٹھن راستہ اختیار کیا جہاں ضروریات زندگی قریباً ناپید تھیں اور پانی کی کمی نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ فوج رات کے وقت سفر کرتی اور وہ بھی ساحل سمندر سے خاصے فاصلے پر، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ ساحلی فوج کے لیے وافر مقدار میں پانی اور دیگر ضروریات تلاش کی جائیں اور نئی بندرگاہیں اور تجارتی مرکز دریافت کئے جائیں۔ اسے یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ اس علاقے میں سوائے ریت کے کوئی جنس دستیاب نہ تھی۔ چنانچہ سکندر نے طاؤس کو ساحل سمندر کی طرف بھیجا کہ وہ پتہ چلائے کہ ساحل سمندر کے قریب پانی دستیاب ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ طاؤس نے واپس آ کر جو رپورٹ دی، وہ بھی خاصی مایوس کن تھی۔ اس نے بتایا کہ ساحل سمندر پر پینے کا پانی ناپید ہے۔ صرف چند ماہی گیروں کے جھونپڑے ہیں جو مٹی کے گھونگھوں اور مچھلی کی ہڈیوں سے تیار کئے گئے ہیں اور ان ماہی گیروں کے پاس پانی نہ ہونے کے برابر ہے اور جو تھوڑا بہت پانی انہوں نے جمع کیا ہے، وہ خاصا کڑوا ہے۔ ہر چند کہ یہ رپورٹ بڑی مایوس کن تھی، لیکن سکندر آگے بڑھتا ہوا گذروشیہ کے صدر مقام تک پہنچ گیا۔ وہاں اسے وافر مقدار میں مکئی مل گئی۔ سکندر نے تمام مکئی کی فوری ضبطی کا حکم دے دیا اور اس کو گھوڑوں اور ہاتھیوں پر لاد کر اپنی مہر ثبت کر دی، پھر حکم دیا کہ تمام مکئی ساحل سمندر پر پہنچا دی جائے لیکن جس طرح مفلسی لطیف حسیات کو مٹا دیتی ہے، اسی طرح بھوک کسی ضابطے کی پرواہ نہیں کرتی۔ ساحل سمندر تک پہنچنے سے قبل ہی جنس نایاب، بھوکی فوج کے پیٹ کے جہنم میں اتر چکی تھی، جو سپاہی مکئی پہنچانے گئے تھے

انہوں نے شکم سیری کے بعد باقی فوج کو بھی دعوت کام و دہن دی اور دیکھتے ہی دیکھتے صرف خالی بوریاں رہ گئیں۔ بھوک آنکھوں کے سامنے ناچتے ہوئے موت کے شیطانوں نے شاہی احکامات کو پس پشت ڈال دیا۔ جب سکندر کو اس صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو اس نے سب سپاہیوں کو معاف کر دیا۔ اس نے خوراک کی تلاش تیز کر دی اور جو کچھ بھی دستیاب ہو سکتا تھا' وہ کریتھس کے حوالے کر کے اس کو ہدایت کی کہ اسے ساحلی فوج تک پہنچا دے جو سمندر میں کشتیوں پر آ رہی تھی۔ اس نے اس بات پر اکتفا نہ کیا' بلکہ مقامی لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ چقندر اور کھجوروں کے علاوہ جتنی مکئی بھی ان کے پاس ہے' پیس کر مع اپنی بھیڑوں کے بیچ دیں... سکندر پھر آگے بڑھا اور ساٹھ دن کے سفر کے بعد اور اسے پورا پہنچا جو گڈروشیہ کا صدر مقام تھا۔

تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ سکندر اس علاقے میں جن مصائب و آلام کا شکار ہوا' وہ ان تکالیف سے کئی گناہ زیادہ تھیں جو اس کی فوج نے ایشیا میں برداشت کیں۔ انسان' انسان سے تو ٹکر لے سکتا ہے' بڑے بڑے خطرناک اور خونخوار درندوں کا قلع قمع کر سکتا ہے' لیکن آسمانی آفتوں کا مقابلہ یقیناً اس کے بس کی بات نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' اس نے لاعلمی میں یہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ نیرکس لکھتا ہے کہ اسے بتایا گیا تھا کہ ان کھنڈروں میں سرمی اور سائرس اعظم کی فوجیں نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ سرمی صرف اپنے بیس فوجیوں کے ساتھ جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا جبکہ سائرس اپنی تمام فوج میں سے صرف سات آدمیوں کو بچا سکا تھا۔ جب سکندر اعظم کو ان واقعات کی اطلاع دی گئی تو اس نے بجائے گھبرانے کے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اس موت کی وادی میں سے ضرور گزرے گا۔ غالباً وہ تاریخ عالم میں اپنا مقام متعین کرنے کی فکر میں تھا۔ نیرکس لکھتا ہے کہ اس کی اس خواہش کے پس پردہ دیگر عوامل بھی کارفرما تھے۔ سکندر کی جو فوج سمندر کے راستے آ رہی تھی' اس کے لیے خوراک کا بندوبست کرنا تھا اور وہ بندوبست صرف اسی طرح کیا جا سکتا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ موت کا مہیب اژدہا کب سے جبڑے کھولے اس کی فوج کا منتظر تھا۔ تمازت آفتاب' باد سموم' دہکتی ہوئی ریت' پانی کی کمی' گھوڑوں اور خچروں کی زبانیں باہر نکل آئیں۔ سپاہیوں کو اپنے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ موت کے اس جہنم میں ہر چیز جھلس رہی تھی۔ گھوڑوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ سلگتی ہوئی ریت اتنی گرم تھی کہ اگر ایک مرتبہ کوئی سوار پاؤں رکھ دیتا تو دلدل کی طرح اس کے اندر دھنستا ہی چلا جاتا۔ آسمان سے گری ہوئی برف بھی شاید اتنی نرم نہیں ہوتی جتنی وہ سلگتی ہوئی ریت تھی' اس پر غضب یہ ہوا کہ ریت کی عمودی دیواریں راستے میں آ گئیں گھوڑے اور خچر گر گر کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ جب صبح کو سورج کی گرمی سے ریت سرخ انگاروں کی طرح دہکنے لگتی تو سپاہیوں کی زبانیں حلق سے باہر نکل آتیں۔ کہتے ہیں مصیبت جب آتی ہے' تنہا نہیں آتی۔ صرف پیاس ہی دشمن جاں نہ تھی' بھوک کا بھیانک عفریت الگ منہ کھولے

کھڑا تھا۔ سپاہیوں نے بھوک کی شدت سے نڈھال ہو کر سواری کے جانوروں کو مار کر کھانا شروع کر دیا۔ استفسار پر یہی کہا جاتا کہ جانور سفر کی تکالیف سے مر گئے ہیں۔ یہ حالات اس بات کے متقضی نہ تھے کہ سپاہیوں کو سرزنش کی جاتی یا فوجی قواعد کی خلاف ورزی پر سزا دی جاتی' پھر کوئی ایک آدھ سپاہی ایسی حرکت کرتا تو ممکن بھی تھا' جہاں ساری فوج مجبوری کے تحت خلاف قواعد وہ فعل کر گزرے جو اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہو تو وہاں ایسے فعل پر چشم پوشی ہی عقلمندی ہوتی ہے۔ سکندر اعظم بذات خود ان تمام باتوں سے آگاہ تھا لیکن وہ بھی عمداً تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا تھا' کیونکہ ان نامساعد حالات میں کسی سپاہی کو سزا دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نیز گرفت کی صورت میں فوج پر رہا سہا رعب و دبدبہ بھی جاتا رہتا۔

موت سائے کی طرح سکندر کی فوج کا تعاقب کر رہی تھی۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ اگر کوئی سپاہی بیمار ہو جاتا یا پیاس کی شدت سے بے دم ہو کر گر پڑتا تو کوئی بھی اسے اٹھانے کی کوشش نہ کرتا اور وہ ہونٹوں پر مچلتی ہوئی سسکیوں اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کارواں کی گرد کو دیکھتا ہوا دم توڑ دیتا۔ چھکڑے اور رتھ وغیرہ پہلے ہی فوج نے توڑ پھوڑ دیے تھے کیونکہ اس شدت کی گرمی اور گہری ریت میں ان کو کھینچنا فوج کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بچا کھچا سامان سپاہیوں کو اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑا۔ سکندر کی کوشش یہ تھی کہ رات کو سفر کیا جائے' کیونکہ دن کو تمازت آفتاب کی وجہ سے سفر ناممکن ہو جاتا۔ رات کے سفر نے ایک اور گل کھلایا۔ نیند کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اکثر سپاہی سو جاتے اور جب صبح ان کی آنکھ کھلتی تو فوج آگے نکل چکی ہوتی۔ ضعف اور پیاس کی وجہ سے فوج کو جا ملنا یقیناً مشکل کام تھا۔ اکثر سپاہی داعی اجل کو لبیک کہہ دیتے۔

بھوک' پیاس اور گرمی کی شدت کی اذیت ہی کیا کم تھی کہ ایک اور مصیبت نے فوج کو آ لیا۔ ایک پہاڑی ندی کے پاس فوج نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا کہ رات کو غیر متوقع طور پر طوفان باد و باراں شروع ہو گیا۔ جب پہاڑی ندی بپھری تو اس کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ عورتیں' بچے' باقی ماندہ بار برداری کے جانور اور سامان حرب خس و خاشاک کی طرح پانی کے ریلے میں بہہ گیا۔ سپاہی بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا سکے۔ اب ان کے پاس تن کے کپڑوں اور چند ہتھیاروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔

جہاں بیشتر سپاہ نے پیاس کی وجہ سے دم توڑ دیا' وہاں اکثر سپاہی پانی پینے سے بھی لقمہ اجل بن گئے۔ پیاس کی شدت کی وجہ سے جب کہیں پانی نظر آتا تو سپاہی ٹوٹ پڑتے اور اتنا پانی پی لیتے کہ پیٹ پھول جاتا اور آنکھیں پتھرا جاتیں' لہٰذا سکندر نے یہ حکمت عملی اختیار کی جہاں کہیں پانی دستیاب ہوتا' اس جگہ پڑاؤ نہ کرتا بلکہ اس سے خاصا ہٹ کر فوج کو ڈیرا ڈالنے کا حکم دیتا اور ترتیب وار سب کو پانی ملتا۔

ان نامساعد حالات میں سکندر اعظم نے جس اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا' اس کی داد نہ دینا یقیناً تاریخ سے ناانصافی ہوگی۔ آگ کے اس دہکتے ہوئے الاؤ میں جبکہ تمام فوج پا پیادہ چل رہی تھی' سکندر بھی اپنے گھوڑے سے اتر کر فوج کے ساتھ پیدل چلنے لگا۔ جب سپاہیوں نے اپنے محبوب بادشاہ کو اپنے شانہ بشانہ چلتے دیکھا تو ان کی ہمت بڑھی اور ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ رواں دواں ہوئے۔ دنیا کو فتح کرنے کا عزم رکھنے والا حکمران آداب جہانبانی اور انسانی نفسیات سے کماحقہ واقف تھا۔

ایک اور موقع پر جبکہ تمام فوج پیاس کی شدت سے جاں بلب تھی' چند سپاہیوں نے بڑی مشکل سے ایک جگہ سے پانی حاصل کیا اور سکندر کی خوشنودی کے لیے دوڑے۔ پیاسے سکندر نے پانی سے بھری ہوئی ہیلمٹ کو ہاتھ میں تھاما' ان سپاہیوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر ساری فوج کے سامنے پانی سے بھری ہوئی ہیلمٹ کو زمین پر انڈیل دیا۔ ایثار کے اس نفسیاتی لمحے نے تھکی ماندی فوج میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔

جب فوج اپنی منزل کی جانب گامزن تھی تو ایک نئی مصیبت آن پڑی۔ راہبر راستہ بھول گئے اور جو نشانات منزل کی نشاندہی کر سکتے تھے' ریت کے طوفان میں دب گئے۔ ریت کے طوفان نے چھوٹے موٹے درختوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابھی تک یونانی فوج نے ستاروں یا سورج کی مدد سے راستہ تلاش کرنے کا فن نہ سیکھا تھا لہٰذا فوج بے بس ہو کر رک گئی۔ سکندر نے اس موقع پر اپنی چھٹی حس سے کام لیا۔ پانچ سواروں کا معیت میں اپنے بائیں جانب چل پڑا۔ اس قیامت کی گرمی میں بھی اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی اور بالآخر وہ سمندر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ خوش قسمتی سے پینے کے پانی کا وافر ذخیرہ بھی دستیاب ہو گیا۔ وہ واپس ہوا اور تمام فوج کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ اس طرح سات یوم تک فوج سمندر کے کنارے مارچ کرتی رہی تا آنکہ گائیڈ اپنا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے۔

سرتھامس ہولڈچ کے مطابق سکندر نے جو راستہ اختیار کیا' وہ ساحل سمندر سے شروع ہو کر دریائے ہنگل کے شمالی کنارے سے ہوتا ہوا سلسلہ ہائے کوہ مکران سے جاملتا ہے۔ وہ ان دشوار گزار پہاڑوں سے گزر کر پسنی پہنچا۔ پسنی سے گوادر گیا اور پھر شمالی رخ اختیار کرتا ہوا بمپور کے راستے آگے بڑھا۔

جس کڑی محنت' جانفشانی اور عزم کے ساتھ سکندر نے دنیا فتح کرنے کی ٹھانی تھی' اس کا اثر سکندر پر پڑنا یقینی امر تھا۔ آخر کار زندگی نے وفا نہ کی اور بابل کے مقام پر فوت ہوگیا... اس کی موت کے ساتھ ہی طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا اور اس کے جرنیلوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔ ونسنٹ سمتھ لکھتا ہے کہ اس جنگ اقتدار میں پورے ایشیا میں اقتدار اعلیٰ کے متمنی دو جرنیل

رہ گئے۔ سلیوکس نکوٹار نے بال آخر انٹی گونز پر غلبہ پایا اور چھ سال قلیل عرصے میں وسطی اور غربی ایشیا اس کی مکمل عملداری میں آ گیا۔ اس کی سلطنت کی شرقی حدیں ہندوستان سے جا ملتی تھیں اور پورا مکران بھی اس کے زیر تسلط تھا۔ ان فتوحات سے سرشار سلیوکس ۳۰۵ ق م میں ہندوستان کی طرف بڑھا اور دریائے سندھ کے پاس راجہ چندر گپت موریہ نے اس کو بڑی ذلت آمیز شکست دے کر مکران اور کئی دیگر صوبے اس سے چھین لیے۔

سلیوکس نکوٹار کی اولاد میں گریکو بکٹوئین پھر اس علاقے پر قابض ہو گیا۔ اس کی عملداری میں پنجاب اور افغانستان بھی شامل تھے لیکن یہ خاندان زیادہ دیر تک اس علاقے پر اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکا اور ۴۰۔۱۳۵ ق م میں وسط ایشیا سے جو منگولوں کا ٹڈی دل اٹھا' وہ وادی ہلمند سے ہوتا ہوا اس علاقے میں پہنچا اور ہر چیز کو تاخت و تاراج کر گیا۔ اس وقت تک بدھ مت اس علاقے میں پھیل چکا تھا اور اس کی تعلیمات کی وجہ سے لوگوں میں جنگی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔

ساسانی خاندان کے دور اقتدار میں بلوچستان پھر ایک دفعہ پردہ تاریخ میں چھپ جاتا ہے۔ پانچویں صدی میں بہرام گور نے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور مکران پر قابض ہو گیا۔ بہرام گور ساسانی خاندان کا چودھواں حکمران تھا جس نے شاہ شرما والی ہند کی لڑکی سے شادی کی اور یہ علاقہ اس کی بیوی کو جہیز میں ملا۔ بہرام گور واپسی پر ہزاروں ناچنے والی عورتیں یہاں سے ہمراہ لے گیا۔ قریباً دو سو سال تک ساسانی خاندان اس علاقے پر قابض رہا حتیٰ کہ خسرو پرویز نے چھٹی صدی کے آخر میں اس علاقے پر قبضہ کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جب ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے ایرانیوں کو شکست دی تو اس وقت بلاشک وشبہ بلوچستان ایرانی سلطنت کا حصہ تھا۔ شکست کے بعد بلوچستان کے کئی شہر عربوں کے قبضے میں آ گئے۔ ۷۰۷ عیسوی میں محمد بن قاسم نے کئی اور مقامات پر قبضہ کر لیا اور پھر سندھ تک بڑھتا چلا گیا اور وادی سندھ میں ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد رکھی۔ عربوں نے خضدار کو صوبائی دار لخلافہ بنا کر دسویں صدی تک بلوچستان پر حکمرانی کی۔

جب خلافت کا اثر و رسوخ کم ہوا تو ایرانیوں نے آہستہ آہستہ آزادی حاصل کر لی اور بلوچستان کو سلطنت ایران میں شامل کر لیا' لیکن داخلی طور پر اس کو مکمل خود مختاری دی گئی۔ سردار اندرونی طور پر خود مختار تھے' صرف جنگ کی صورت میں لازم تھا کہ وہ مرکزی حکومت کو فوجی لشکر روانہ کریں۔

۱۵۹۵ء سے ۱۹۳۶ء تک بلوچستان مغل سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ بلوچ' جن کی وجہ سے اس خطے کو بلوچستان کہا جاتا ہے' بہت

دیر بعد اس علاقے میں وارد ہوئے۔ آریہ نسل سے تعلق رکھنے والے یہ بلوچ ایک قبیلے کی صورت میں گیارہویں اور بارہویں صدی میں اس خطہ زمین پر حملہ آور ہوئے۔ جب سلجوقوں نے ایران پر حملہ کیا اور اس قبیلے کو نکال باہر کیا تو یہ بلوچستان پر حملہ آور ہوئے اور مکران کے جنوبی علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ابتدا میں قلات کے بالائی علاقوں میں ان کو شکست ہوئی' بجائے پہاڑوں سے ٹکرانے کے یہ نیچے اتر گئے اور وادی سندھ کے کچھ حصوں پر قابض ہو گئے۔ جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے' انہوں نے قبائلی نظام رائج کیا جس میں سرداری نسل در نسل چلتی تھی۔ ان کے بالمقابل بروہی تھے جو قلات کے بالائی علاقوں پر قابض تھے۔ یہ دراوڑی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ساراواں اور جھالاواں میں آباد تھے۔

بلوچوں کی اس خطے میں آمد سے متعلق چند دیگر روایات بھی مشہور ہیں۔ بعض مورخین انہیں عربی النسل کہتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ بعض تاریخ دان انہیں ایرانی النسل گردانتے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ بلوچ دراصل عرب قبیلے بلوص سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب امیر معاویہ کی وفات کے بعد یزید اول تخت نشین ہوا اور فسق و فجور کی لہر نے تمام معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو ایک مرد حق نے اس کے ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کی' چنانچہ جب کربلا میں معرکہ حق و باطل ہوا اور امام حسین علیہ السلام راہ حق میں اپنے کنبے سمیت جام شہادت نوش کر گئے تو قبیلہ بلوص نے اس خون ناحق پر سخت احتجاج کیا اور وہاں سے کوچ کر کے اس خطہ زمین میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔

براہوی سترھویں صدی میں برسر اقتدار آئے۔ سردار قمبر نے مقامی ہندو راجے کو شکست دے کر تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان اس علاقے میں غالب رہے۔ قمبر کی چوتھی پشت سے عبداللہ خاں پیدا ہوا جس میں جذبہ جہانبانی بدرجہ اتم موجود تھا اس نے سندھ کے راجوں کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں اور کیچ گندھاوا ہتھیا لیا۔ جب نادر شاہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے قبل قندھار پہنچا تو اس کے لیے بلوچستان کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ضروری ہو گیا۔ اس نے چند قابل جرنیلوں کے تحت ایک مہم قلات بھیجی جنہوں نے بلوچستان میں نادر شاہ کی حاکمیت منوائی۔ جرنیل واپسی پر عبداللہ خان کے دو بیٹوں نصیر خان اور حاجی محمود (محبت خان کو بطور پرغمال نادر شاہ کے پاس لے گئے۔ عبداللہ خان کو اعتدال میں رکھنے کا یہ نہایت موثر طریقہ ثابت ہوا۔ نادر شاہ نے عبداللہ خان کو معزول کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسے بدستور قلات پر حکمران رکھا' لیکن عبداللہ خان کے ساتھ زیادہ دیر تک زندگی نے وفا نہ کی اور تھوڑے ہی عرصے بعد وہ سندھ کے نوابوں کے ساتھ جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔

نادر شاہ تک جب یہ خبر پہنچی تو اس نے عبداللہ کے بڑے بیٹے حاجی محمود خان کو خلعت فاخرہ عطا کی اور قلات کی گدی پر بٹھا دیا

...ہر چند کہ حاجی محمود خان اپنے باپ کے برعکس سخت نااہل اور عیش کوش تھا اور اس کی ان عادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھیوں نے ایک دفعہ پھر کیچ گندھاوا پر حملہ کر دیا' لیکن پہلی جنگ میں بلوچ ان کے مظالم کو نہ بھولے تھے اس لیے انہوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور سندھیوں کو فیصلہ کن شکست دی۔

محمود خان اپنی عادات وخصائل کی وجہ سے نادر شاہ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ اس نے غیر ضروری محصولات لگا کر تجارت اور صنعت وحرفت کو تباہ کر دیا۔ اس کے حرص و آز کے سمندر میں قبیلے کے وقار کا سفینہ ڈگمگانے لگا۔ نفسانی خواہشات کے سائے اس کے فہم وادراک پر پڑنے لگے۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا رویہ خاص طور پر معاندانہ تھا۔ اس نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے ہر ہندو پر یہ لازم تھا کہ شادی کی پہلی رات وہ اپنی دلہن خان کے پاس بھیج دے۔ اس کی جنسی کج روی کا یہ عالم تھا کہ اس قانون کا اطلاق وہ مسلمانوں پر بھی کرنا چاہتا تھا لیکن حالات نے اسے اس خواہش کی تکمیل کی اجازت نہ دی۔

محمود خان کو حکومت کرتے ہوئے دو سال اور چار ماہ ہو چکے تھے۔ قلات کا شہر اس کے ظلم وستم کی وجہ سے خالی ہو گیا۔ جب نادر شاہ کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو اس نے محمود خان کے بھائی نصیر خان کو خلعت دے کر قلات بھیجا اور ساتھ ساتھ یہ نصیحت بھی کی کہ مظلوم رعایا کو محمود کے ظلم وستم سے نجات دلائے۔ نصیر خان نادر شاہ کے دربار میں پروان چڑھا تھا۔ اس نے ہندوستان میں بہادری کے ایسے جوہر دکھلائے تھے کہ تمام فوج عش عش کر اٹھی تھی اور اس طرح اس نے نادر شاہ کا دل جیت لیا تھا۔

نصیر خان جب قلات پہنچا تو شہر قریباً خالی ہو چکا تھا۔ اس نے محمود خان کو بہت سمجھایا کہ وہ اپنی ظالمانہ روش ترک کر دے' لیکن جب تمام پندونصائح صدا بصحرا ثابت ہوئے تو ایک شام وہ خنجر لے کر اپنے بھائی کے محل میں گیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ محمود خان کی موت کی خبر نے سارے علاقے میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی اور متفقہ طور پر لوگوں نے نصیر خان کو گدی پر بٹھا دیا۔ نصیر خان نے تمام واقعات لکھ کر نادر شاہ کو بھیجے جس نے خوش ہو کر اسے بیگلر بیگی کا خطاب دیا۔ نصیر خان کے عہد کو بلوچستان کی تاریخ کا سنہری باب کہا جاتا ہے۔ اس کے حسن انتظام' جرات' بردباری اور عالی حوصلگی کے قصے تاریخ کے صفحات میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ جب وہ گدی پر بیٹھا تو اس کے بھائی کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ریاست کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ تجارت اور صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے لیے اس نے ان تمام ٹیکسوں کو منسوخ کر دیا گیا۔

معاشی استحکام کے بعد اس نے سیاسی امور پر توجہ دی اور تمام سرداروں کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ اپنے حصے کی سپاہ مہیا کریں۔ اس طرح جب ایک زبردست لشکر اکٹھا ہو گیا تو اس نے براستہ خضدار' پنجگور' کیچ مکران کا دورہ کیا۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ خاران

کے راستے واپس قلات پہنچا۔ واپسی پر اس نے قلات میں بے شمار باغات لگوائے اور فصیل بنوائی۔

نادر شاہ کی وفات کے بعد ۱۷۴۷ء میں نصیر خان نے احمد شاہ ابدالی کو بطور حکمران تسلیم کرلیا کیونکہ مصلحت وقت کا یہی تقاضا تھا۔ ۱۷۵۸ء میں نصیر خان نے مکمل خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے نصیر خان کی سرکوبی کے لیے ایک مہم بھیجی نصیر خان نے ایک لشکر جرار اکٹھا کیا اور معرکہ پڑنگ آباد میں مکمل طور پر افغان فوج کو تباہ کر دیا۔ جب احمد شاہ کو اس ہزیمت کی اطلاع ملی تو وہ خود ایک لشکر جرار لے کر پہنچا اور مستونگ میں ایک دفعہ پھر زور کا رن پڑا' چونکہ احمد شاہ ابدالی کا پلہ بھاری تھا' اس لیے نصیر خان نے یہاں ایک جنگی حکمت عملی سے کام لیا اور نہایت منظم طریقے سے پیچھے ہٹتا ہوا قلات میں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ احمد شاہ نے قلات کا محاصرہ کرلیا اور تین بھرپور حملے کئے لیکن قلعہ سر نہ کر سکا۔ اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے احمد شاہ کو گفت و شنید پر آمادہ کرلیا۔ ایک روایت کے مطابق نصیر خان نے ایک دن احمد شاہ ابدالی کو اپنے خیمے کے باہر نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ نصیر خان نے توپچی سے کہا کہ توپ کا رخ اس طرف موڑ دے۔ جب احمد شاہ نماز پڑھ کر ہٹا تو اس جگہ کا نشانہ لے کر توپچی نے توپ داغ دی۔ نشانہ درست بیٹھا۔ احمد شاہ اس واقعے سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنے جرنیلوں کی بات مانتے ہوئے مصالحت پر آمادگی ظاہر کی اور اس طرح معاہدہ قلات عمل میں آیا جس کی مندرجہ ذیل شرائط تھیں۔

۱۔ دوستی کے رشتوں کو مکمل طور پر استوار کرنے کے لیے احمد شاہ نے نصیر خان کی چچازاد بہن سے شادی کرلی۔

۲۔ معاہدے کی رو سے نصیر خان نے خراج دینا بند کر دیا' لیکن اس کے ساتھ یہ طے پایا کہ جب بھی احمد شاہ کو حملے کی صورت میں فوج کی ضرورت ہوگی' نصیر خان مہیا کرے گا لیکن خانہ جنگی کی صورت میں نصیر غیر جانبدار رہوگا۔

واپسی پر احمد شاہ کے ساتھ نوبیاہتا دلہن کی ماں اور بھائی بہرام خان بھی کابل چلے گئے۔ ۶۲-۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی دوسری مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس نے نصیر خان سے مدد طلب کی۔ نصیر خان نے عہد نبھایا اور ایک لشکر جرار لے کر لاہور روانہ ہوا۔ یہاں سکھوں اور احمد شاہ کے درمیان جنگ ہوئی جس میں نصیر خان نے بہادری کے نمایاں جوہر دکھلائے اور ہر دفعہ موت کے منہ سے بچ نکلا۔ دوران جنگ جب گھمسان کا رن پڑا تو نصیر خان سکھوں کی صف میں گھس گیا اور ابھی داد شجاعت دے رہا تھا کہ اس کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ اپنے زور میں نیچے گر گیا جس سے اس کی پگڑی کھل گئی۔ چونکہ بلوچوں میں بھی لمبے بال رکھنے کا رواج تھا اس لیے سکھ سمجھے کہ ان کا کوئی بھائی بند گر گیا ہے۔ ایک سکھ نصیر خان کو مارا ہی چاہتا تھا کہ باقی سکھوں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ کیوں اپنے خالصے پر ہاتھ چلاتے ہو۔ جب سکھوں پر اصل حقیقت آشکار ہوئی تو نصیر خان ان کے نرغے سے نکل چکا تھا۔ جنگ سے واپسی

پر نصیر خان نے جو پہلا کام کیا وہ اپنے بالوں اور داڑھی کی تراش خراش تھی۔

اسی طرح جب ۱۷۶۹ء میں ایرانی سرداروں نے منظم ہو کر کابل پر حملہ کیا تو نصیر خان کو ایک دفعہ پھر عسکری جوہر دکھانے کا موقعہ ملا۔ دوران جنگ جب ایرانی فوجیں فتح کے قریب تھیں' نصیر خان نے تین ہزار بلوچوں کے ساتھ ایسا زبردست حملہ کیا کہ ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ احمد شاہ اس واقعے سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے مستونگ' شال اور ہرندا جل کے اضلاع مکمل طور پر نصیر خان کے حوالے کر دیے۔ نصیر خان ایک لمبے عرصے تک حکومت کرنے کے بعد ۱۷۹۵ء میں فوت ہوا۔

برطانوی تسلط

۱۸۱۰ء میں برطانوی سیاح سر ہنری پونگر بلوچستان سے گزرا اور اس طرح پہلی مرتبہ برطانوی راج کا بلوچستان سے رابطہ قائم ہوا۔ پہلی جنگ افغانستان نے' جس کا مقصد شاہ شجاع کو تخت قندھار پر متمکن کرنا تھا' قلات کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیا۔ برطانوی فوجیں درہ بولان سے مارچ کرتی ہوئی قندھار کی طرف بڑھیں تو فوجی نقطہ نظر سے محراب خان سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہو گیا۔ ابھی باہمی گفت وشنید جاری تھی کہ ایک ناخوشگوار حادثہ پیش آ گیا۔ برطانوی فوج کی سپلائی لائن پر چھاپہ پڑا۔ انگریزوں نے اس واقعے کو محراب خان کی بدعہدی پر محمول کیا اور ایک مہم قلات کو سر کرنے کے لیے بھیجی گئی۔ محراب خان کے وزیر نے خان کو معتوب کرنے کے لیے یہ چال چلی تھی اور برطانوی فوج پر اس کے آدمیوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حملہ کیا تھا۔ محراب کے جانشین خان نصیر خان کو پہلے تو انگریزوں نے معزول کر دیا' لیکن جب تمام مقامی سردار اس کے اردگرد جمع ہو گئے تو انگریزوں نے ۱۸۴۱ء میں اسے باقاعدہ خان تسلیم کر لیا اور علاقہ خالی کر کے چلے گئے۔ ۱۸۵۴ء میں بریگیڈیئر جنرل جان جیکب نے جو سندھ میں کانسٹیبلری کا کمانڈر تھا' خان نصیر سے ایک معاہدہ کیا۔ انگریزوں نے خان کی وفاداری کے عوض اسے سالانہ پچاس ہزار روپے گرانٹ دینے کا وعدہ کیا۔ نصیر خان ۱۸۵۶ء میں فوت ہو گیا اور خداداد خان جس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی اس کا جانشین مقرر ہوا۔ چند سرداروں نے جنہیں جانشینی کے وقت بیش قیمت تحائف نہ ملے تھے' بغاوت کر دی۔ بغاوت کے لیے یہ موقع نہایت سازگار تھا' کیونکہ اس وقت ہندوستان میں جنگ آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے تھے اور خیال تھا کہ اس انتشار میں انگریز ہندوستان میں الجھ کر قلات پر پوری توجہ نہ دے سکیں گے۔ لیکن یہ محض خیال خام تھا۔ برطانیہ پر پہلی جنگ افغانستان کے بعد قلات کی فوجی اہمیت واضح ہو چکی تھی' اس لیے انہوں نے قلات میں ۱۸۵۷ء میں ایک مستقل افسر تعینات کر دیا۔

خداداد خان کو اس کے ایک چچازاد بھائی نے زخمی کر دیا اور خود قلات پر قابض ہو گیا' لیکن صرف ایک سال حکمرانی کے بعد قتل کر

دیا گیا۔ خداداد خان کو پھر بحال کر دیا گیا۔ خداداد خان میں جہانبانی کی صلاحیتیں مفقود تھیں اور چونکہ اس کے دور میں بدنظمی بے حد بڑھ گئی تھی' اس لیے انگریزوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ناسازگار حالات کو مداخلت کا جواز بناتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں کیپٹن سنڈے مان کو بھیجا جو بعد میں سر سنڈے مان کے نام سے مشہور ہوا۔ سر سنڈے مان نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے خان اور اس کے سرداروں کے درمیان ۱۸۷۶ء میں مستقل بنیادوں پر سمجھوتہ کرا دیا جس میں برطانیہ کی پوزیشن ایک منصف کی تھی۔ اس طرح اس قبائلی نظام کی بنیاد پڑی جس میں سرداروں کو داخلی طور پر خود مختاری حاصل ہوگئی اور خان کا ان کے ساتھ تعلق محض رہ گیا۔ یہ تو محض ابتدا تھی۔ سنڈے مان کی دور رس نگاہیں بولان کی فوجی اہمیت سے پوری طرح واقف تھیں' چنانچہ ۱۸۷۹ء میں معاہدہ گندمک کی رو سے بولان پاس' کوئٹہ اور اس کے مضافات برطانوی تسلط میں آ گئے۔ سنڈے مان نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ ۱۸۹۱ء میں پشین اور سبی بھی برطانوی تسلط میں لے لیے گئے حتیٰ کہ پورا بلوچستان سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ بن گیا اور برطانوی حکومت نے افغانستان اور ایران کے ساتھ ایک کمیشن کے ذریعے سرحدوں کا تعین کر لیا۔

۱۸۹۳ء میں خان معتوب ہوا اور انگریزوں نے اس کی نازیبا حرکات کو بہانہ بنا کر اسے معزول کر دیا اور اس کے بیٹے کو جانشین مقرر کیا۔ چند سال بعد تو عمر خان نے معمولی رقم کے عوض نوشکی انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریز سیستان کے راستے تجارتی راہ کھولنا چاہتے تھے۔ اس راہ کو کھولنے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو تجارت کو فروغ دینا ضروری تھا۔ جس محنت اور جانفشانی سے انگریزوں نے اس دشوار گزار علاقے میں ریلوے لائن بچھائی' وہ یقیناً قابل تحسین ہے اور جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس ریلوے لائن کو زہدان تک بڑھا دیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمن حکمت عملی یہ تھی کہ ہندوستان پر ترک فوج سے حملہ کرایا جائے' چنانچہ انگریزوں کے مخصوص مفادات کو نقصان پہنچانے کے لیے ایک خاص جرمن مشن ایران بھیجا گیا۔ اس مشن نے خاصا کام کیا اور انگریز افسروں کو قتل کرنے کے لیے ایران سے گوریلے بلوچستان بھجوائے گئے۔ اپریل ۱۹۱۶ء میں میسوپوٹیمیا کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث انگریزی وقار کو سخت دھچکا لگا اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اس کے اثرات بلوچستان پر بھی مرتب ہوں گے۔ دو انگریز افسر مکران میں قتل کر دیے گئے۔

خان قلات اور قبائلی سرداروں کی بروقت مداخلت سے یہ تحریک زیادہ پھیل نہ سکی اور ۱۹۱۶ء میں حکومت ہند کی طرف سے بریگیڈیئر جنرل سر پرسی سائیکس اور میجر ٹی ایچ کیز کی سرکردگی میں دو لشکر علیحدہ علیحدہ بھیجے گئے اور چھوٹی چھوٹی شورشوں کا سختی سے قلع قمع کر دیا گیا۔

مئی ۱۹۱۹ء میں تیسری افغانستان جنگ شروع ہوئی تو وزیری اور مسعودی قبائل نے فورٹ سنڈے مان پر حملہ کر دیا۔ شہر کو لوٹ لیا

گیا اور خاصے لوگ تہ تیغ ہوئے۔ انگریزی فوج قلعہ بند ہوگئی اور اس نے اس وقت تک مدافعت جاری رکھی جب تک مرکز سے کمک نہ پہنچ گئی۔

اس کے بعد تقسیم پاک و ہند تک خوانین قلات بلوچستان کے ایک حصے پر قابض رہے۔ کوئٹہ ڈویژن کے بیشتر علاقوں پر انگریزوں کی عملداری رہی۔ میر احمد یار خان آخری خان آف قلات تھا جس کا ذکر آگے چل کر تفصیلاً آئے گا۔

مکران

مکران وحدت مغربی پاکستان کا آخری جنوب مغربی خطہ ہے جس کے شمال میں سلسلہ ہائے کہیان ہے جو اس کو خاران سے علیحدہ کرتا ہے۔ مشرق میں جھالاواں اور بیلا کے کچھ حصے میں، مغرب میں ایران ہے اور جنوب میں فوجی نقطہ نگاہ سے بحیرہ عرب جیسا اہم سمندر واقع ہے۔

وجہ تسمیہ

مکران کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مکران کا جو علاقہ پاکستان کے حصہ میں آتا ہے اس کو کیچ مکران کہتے ہیں اور جو علاقہ ایران میں شامل ہے اس کو ایرانی مکران بولتے ہیں۔ مکران کی وجہ تسمیہ پر کئی آراء ہیں۔ شمس العلمائے جے جے مودی نے اپنے ایک مضمون میں جو ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا، حمزہ کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ مکران دراصل ماہ کران کا مخفف ہے۔ ماہ شہر کو کہتے ہیں اور کران کے لغوی معنی سمندر کے ہیں۔ یعنی ساحل سمندر پر آباد شہر۔ ایک دیگر روایت میں یہ علاقہ موکراان بن فرح بن سام بن نوح کے نام سے موسوم ہے۔ موکران نے پہلے پہل اسے آباد کیا تھا۔ دیگر محققین کے مطابق جن میں ڈاکٹر بیلو اور سر آلیور سینٹ جان کے نام سر فہرست ہیں، یہ فارسی لفظ ماہی خوران کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

لارڈ کرزن کی تحقیقات کے مطابق لفظ مکران دراوڑی زبان سے اخذ کیا گیا ہے جس میں اس کو "موکارا" بولتے ہیں۔ "موکارا" مختلف قبائل میں سے ایک قبیلہ ہے۔ اس کا ذکر Birhat Sanikitor میں تفصیل سے آ چکا ہے۔ مکران کے متعلق سر چارلیس میک ریگر نے (Sir Charles Mecgregor) کہا تھا:

Take one of these big brown stones one sees all over baluchistan. Which looking, as if they had just comer out of fire. Very aptly represent makran.

تاریخ

اپنے مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے قدیم تاریخ میں بلوچستان کے کسی حصے کو اتنی اہمیت حاصل نہیں رہی جتنی مکران نے حاصل کی ہے۔ چونکہ ہندوستان اور شرق اوسط میں نقل وحمل کا یہ واحد راستہ تھا اس لیے تمام فاتحین کی نگاہیں اس خطۂ زمین پر بار بار پڑتی تھیں۔ اس وجہ سے اس خطے کے متعلق کئی افسانے اور الف لیلوی قصے بھی تاریخ کے سینے میں دفن ہیں۔ ان دیو مالاؤں کا ذکر حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ مورخین نے سائرس' سمری اور سکندر اعظم کے اس خطۂ زمیں سے گزرنے کا جو حال قلمبند کیا ہے' اس کا ذکر تفصیلاً کیا جا چکا ہے۔

فردوسی نے شاہنامے میں اس خطے کا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور اسے ایرانیوں اور تورانیوں کی رزم گاہ بتایا ہے۔

شاہ کاؤس کے زمانے میں مکران ایران کا ایک حصہ تھا۔ شاہ کاؤس نے اس علاقے کا تفصیلی دورہ کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ علاقہ وقتی طور پر ایرانیوں کے قبضہ سے نکل گیا اور افراسیاب کی عمل داری میں آ گیا' لیکن پانچ خونریز جنگیں لڑنے کے بعد کیخسرو نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ کیخسرو اس علاقے کی فوجی اہمیت سے کماحقہٗ واقفیت رکھتا تھا۔ وہ ایک سال تک اس علاقہ میں رہا اور زراعت پر خاص توجہ دی۔ اس کے زمانے میں بڑی بڑی چراگاہیں بنوائیں گئیں۔ یہاں سے واپسی پر اس نے اپنے معتمد جرنیل شخص کو گورنر مقرر کیا۔ شاہنامے کا دوسرا ہیرو جس کے اردگرد مقامی روایات کا جال بنا ہوا ہے' بہمن بن اسفندیار ہے۔ اس کے نام سے آج تک تربت میں بہمنی کاریز اور بہمنی Domb موسوم ہیں۔

ایک مقامی روایت کے مطابق بہمن کو تربت کے نزدیک اپسر کے جنگل میں ایک راکشس نے نگل لیا تھا۔ اس موقع پر رستم کا پوتا بارزان بھی موجود تھا۔ بارزان ایک لڑائی میں بہمن کے ہاتھوں شکست کھا کر گرفتار ہوا تھا اور اس سے بہمن نے یہ عہد لیا تھا کہ اس کی موجودگی میں تلوار نیام سے باہر نہیں نکالے گا۔ چنانچہ جب راکشس بہمن کو نگل رہا تھا تو بہمن نے اسے مدد کے لیے پکارا لیکن بارزان نے یہ کہہ کر اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے عہد کا پابند ہے اور معاہدے کی رو سے وہ تلوار نہیں اٹھا سکتا۔ جب راکشس بہمن کو نگل چکا تو بارزان نے نیام سے تلوار نکالی اور ایک ہی بھرپور وار سے راکشس کو دو ٹکڑے کر دیا' پھر خوشی سے چلایا "میں نے آج بہمن سے اپنے دادا کی موت کا بدلہ لے لیا ہے اور راکشس کو قتل کر کے بہمن کے خون کا حساب چکا دیا ہے۔" بارزان کے یہ الفاظ آج کل بلوچی گیت میں جذبہ انتقام کی قدیمی اقدار کی عکاسی کرتے ہوئے نسل جدید کے لیے سبق پیش کرتے ہیں۔

"شاہنامہ" کے مطابق مکران پر کیکاؤس' کیخسرو' لہراسپ' ساسپ' بہمن' مسما اور دواب یکے بعد دیگرے حکمران رہے۔

تقریباً آٹھ سو سال تک مکران پردہ تاریخ پر نہیں ابھرتا حتیٰ کہ ۴۲۰ء میں شرما ملک اپنی بیٹی کے جہیز میں یہ علاقہ بہرام گور کو

دے دیتا ہے۔ بہرام گور ساسانی خاندان کا چودھواں فرمانروا تھا۔ دو سو سال تک یہ علاقہ ساسانیوں کے تسلط میں رہا اور آخر کار خسرو پرویز نے ۵۹۱ء میں اسے دوبارہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۶۳۵ء میں جب ایرانیوں کا زور ٹوٹا تو راجہ چچ نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

عرب دور

عربوں کی نگاہیں ایک عرصے سے اس علاقے پر لگی ہوئی تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال بعد ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جو گورنر عراق تھے خلیفہ کو مکران اور سندھ کے متعلق تفصیلی رپورٹ بھیجی۔ ابوموسیٰ اشعری کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سندھ پر ایک ظالم شخص حکمرانی کرتا تھا جس سے رعایا بڑی تنگ اور نالاں تھی۔ اس نے گناہ آلود زندگی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ مصلحت وقت کے تحت اس علاقے کو لازمی طور پر فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا' لیکن جب عربوں نے ایران فتح کر لیا تو ان کی نگاہیں خود بخود مکران اور سندھ کی جانب اٹھنا شروع ہو گئیں۔ خلیفہ دوم کے زمانے میں عبداللہ بن عبداللہ نے ایک خونریز جنگ کے بعد ملک سعد کو شکست فاش دی اور اس کی وہ تاریخی رپورٹ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کی جس کا ذکر شروع میں آ چکا ہے۔ خلیفہ ثانی نے رپورٹ سن کر حکم دیا کہ سندھ پر حملے کا ارادہ ترک کر دیا جائے' اس کے باوجود عربوں کا مکران پر تسلط رہا اور وہ اسے سرحدی چوکی استعمال کرتے رہے۔ جب مسلمان اندرونی خلفشار کا شکار ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تخت نشین ہوئے تو عربوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ عبداللہ بن زیاد کو کیکنان (موجودہ وادی نال) کے نزدیک زبردست شکست ہوئی اور اس کی جگہ سنان ابن سلمہ کو جرنیل مقرر کیا گیا۔ میجر سائیکس اپنی کتاب ایران میں دس ہزار میل Ten Thousand Miles in persia میں لکھتا ہے کہ جب سنان ابن سلمہ کو جرنیلی کا حکم نامہ ملا تو وہ دہشت سے کانپنے لگا اور قاصد کو مخاطب کر کے بولا ''تم مجھے اس مکران کا راستہ دکھانے آئے ہو جس کے تصور ہی سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور خوف وہراس میری روح کو کپکپا دیتا ہے۔ میں اس علاقے میں کبھی نہیں جاؤں گا کیونکہ حکم دینا الگ بات ہے اور اس پر عمل کرنا دوسری بات ہے۔

سنان ابن سلمہ کے تاثرات چاہے کچھ بھی تھے وہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ خلیفہ کی حکم عدولی کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ فوراً مکران پہنچا اور کئی شہر آباد کئے۔ اس نے کئی علاقے فتح کئے اور آخر کار کچھی کے نزدیک مارا گیا۔ اندرونی خلفشار اور باہمی آویزشوں کی وجہ سے کچھ عرصے تک عرب فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔ ولید کے عہد میں محمد بن قاسم کو فتح سندھ کے لیے بھیجا

گیا۔ سندھ فتح ہونے کے بعد مکران کو صوبہ سندھ میں مدغم کر دیا گیا۔

مکران کی تاریخ پر ایک دفعہ پھر گرد کی تہہ جم جاتی ہے اور کئی سو سال تک پتہ نہیں چلتا کہ یہ علاقہ کن ادوار سے گزرتا ہے۔ ابن حوقل کے مطابق دسویں صدی عیسوی میں ایک عرب حکمران عیسیٰ بن سرن اس پر حکمرانی کرتا تھا۔ دسویں صدی سے لے کر سترھویں صدی تک مکران طوائف الملوکی کا شکار نظر آتا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف حملہ آور آتے رہے۔ اس کی حیثیت ایک شکارگاہ کی سی تھی۔ حملہ آور آندھی کی طرح آتے' علاقے کو تاخت وتاراج کرتے نیز لوٹ مار کر کے کوئی مستقل نشان چھوڑے بغیر چلے جاتے۔ اندرونی طور پر مقامی سردار خودمختار رہے اور ہر حملہ آور کو وقتاً فوقتاً خراج دیتے رہے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں نصیر خان اول نے اس علاقے پر اپنا تسلط جما لیا اور سرداروں کو مجبور کیا کہ آدھا مالیہ ابھرتی ہوئی ریاست قلات کو دیا جائے۔

سولھویں صدی کے شروع میں پرتگیزی جب ہندوستان کی طرف بڑھے تو انہوں نے مکران کے کئی ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ بہر حال' یہ قبضہ صرف ساحلی علاقوں تک ہی محدود رہا۔ ۱۵۸۱ء میں انہوں نے گوادر اور پسنی کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

بلیدی خاندان

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ بلیدی خاندان کی داغ بیل ابوسعید نے ڈالی جو گرمسل سے آیا تھا۔ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ وادی ہلمند سے آیا ہو۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کا آبائی وطن مسقط تھا۔ پہلے خیال کو اس امر سے تقویت ملتی ہے کہ تمام بلیدی قریب قریب ذکری ہیں اور ان کا مکران میں ورود ذکری مذہب کے احیاء کے ساتھ ہوا جو پندرھویں صدی میں مکران میں پھیلا تھا۔ ابوسعید کے متعلق یہ رائے بھی قائم کی جاتی ہے کہ وہ مسقط کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔ چونکہ یہ لوگ مکران کے قصبہ بلیدہ میں آ کر رہائش پذیر ہوئے تھے' اس لیے بلیدی کہلائے... اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بلیدی پندرھویں صدی میں مکران آئے تو انہیں اقتدار سنبھالنے میں دو صدیاں بیت گئیں' کیونکہ سترھویں صدی میں جا کر کہیں لیلائے اقتدار ان کے ہاتھ آئی۔ شاہ ابوسعید' شکر اللہ' شاہ قاسم' شاہ زہری' شاہ حسین' شاہ احمد اور شاہ عبداللہ اس خاندان کے مشہور حکمران گزرے ہیں۔

ابوسعید جس نے بلیدی خاندان کی یہاں بنیاد رکھی' دراصل اپنے وقت میں اقتدار حاصل نہ کر سکا تھا۔ بلیدیوں کے دور حکومت کے حالات اور واقعات پر تاریخ کی گرد پڑی ہوئی ہے' اس لیے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ اس خاندان کے حکمرانوں نے کس طرح حکومت کی۔ کرنل راس نے گوادر میں ایک پتھر دریافت کیا تھا جس پر شاہ بلدر کے زمانے کی لکھی ہوئی عبارت ملتی ہے۔ بلدر شاہ قاسم کا چچا تھا جو بلیدی خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔

چونکہ گچکی مکران میں بڑی تیزی سے طاقت پکڑ رہے تھے اس لیے بلیدی خاندان کا سورج ڈوبنے لگا۔ شاہ بلدر نے جو ذکری مذہب چھوڑ کر مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا' ملک دینار خان گچکی سے ٹکر لی اور اس کے ہاتھوں مارا گیا' کیونکہ ملک دینار خان کو اب ذکریوں کی مدد حاصل ہو گئی تھی۔ شاہ قاسم نے نادر شاہ سے مدد طلب کی۔ نادر شاہ نے جو ہندوستان پر حملے کی تیاری کر رہا تھا اس کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اپنے جرنیل تاکی خان کو اس کی امداد کے لیے بھیجا۔ لیکن جب نادر شاہ ہندوستان سے واپس چلا گیا تو پھر گوادر پر ملک دینار خان کا قبضہ ہو گیا۔

گچکی خاندان

گچکیوں کی مکران میں آمد کے متعلق بھی مختلف آراء ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ جے پور سے آئے تھے' کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ جودھپور' مردواڑ جام نگران کا اصل گھر تھا۔ گچکی مکران میں کب آئے' اس کے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کرنل راس کے مطابق یہ پندرھویں صدی میں آئے تھے۔ بہر حال' یہ جب بھی آئے تھے سترھویں صدی تک یہ اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ نادر شاہ کو ان کی سرکوبی کے لیے باقاعدہ ایک فوج بھیجنا پڑی۔ ہر چند کہ ان کی تیسری نسل مسلمان ہو چکی تھی' لیکن جب مکران میں ذکری مذہب نے جڑیں پکڑیں تو یہ ذکری ہو گئے۔

گچکیوں کے متعلق ایک اور دلچسپ روایت یہ بھی ہے کہ ایک بلوچ سردار نذر محمد نے اپنے اکلوتے بیٹے کمال خان کو رشتہ داروں کی انگیخت پر اشتعال میں آ کر قتل کر دیا۔ بعد میں جب تاسف کے سائے اس کی روح پر پڑنے لگے تو اس نے عزم صمیم کر لیا کہ وہ اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو بھی اپنا جانشین نہیں بننے دے گا' چنانچہ اس نے اپنے گماشتوں کو حکم دیا کہ اس کے بعد جانشینی کے لیے کوئی موزوں شخص تلاش کیا جائے۔ خاصی تلاش کے بعد اس کے سپاہی کرنگا پہنچے جو ریاست برودا کا ایک شہر تھا اور وہاں کے حاکم وقت سادل جی کے بیٹے سامت جی کو بروز جمعہ ۱۵۵۸ء میں اٹھا لائے۔ وہ راجپوت خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ نذر محمد نے اپنی بیٹی ویلیو کی شادی سامت جی کے ساتھ کر دی اور اس کی آل اولاد گچکی کہلائی۔

ان روایات سے قطع نظر' عام طور پر تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ گچکی پنا سنگھ لاہوری کی اولاد ہیں البتہ مکران میں ان کے ورود کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ باہمی خانہ جنگی' معاشی تقاضے' حاکمان وقت کا خوف یا جذبہ جہانگیری۔ بہر حال' ایک بات نہایت واضح ہے کہ وہ کسی نیک مقصد سے یا سیر و سیاحت کی غرض سے یہاں نہ آئے تھے۔ تینوں بھائی مار سنگھ' چرت سنگھ اور بھگت سنگھ چالیس سواروں کا ایک منظم جتھہ لے کر پنجگور کے موضوع گچک میں آ بسے اور اسی وجہ سے گچکی کہلائے۔ شاہ قاسم بلیدی کی فطری کمزوریوں

نے ان کے شوق جہانبانی کو مزید ہوا دی۔ چنانچہ شاہ قاسم کو ذلت آمیز شکست دے کر یہ وادی کیچ کے تمام علاقے پر قابض ہو گئے۔ جب ملک مرزا خان حاکم کیچ کو اطلاع ملی کہ گچکی آہستہ آہستہ مکران کے افق پر امڈ رہے ہیں تو اس نے ان کا قلع قمع کرنے کی ٹھانی۔ ابتدائی شکست کے بعد گچکیوں کی حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی اور انہوں نے بلیدیوں کے ساتھ اتحاد کر کے ملک مرزا خان کو کیچ سے نکال باہر کیا۔ اس طرح گچکیوں نے تمام مکران پر حکمرانی کی راہ ہموار کر لی لیکن بلیدیوں کا کانٹا ابھی تک انہیں اپنے حلق میں چبھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا' چنانچہ ملک دینار نے اس آخری روڑے کو بھی اپنی راہ سے ہٹایا۔

ملک دینار خان عقیدتاً ذکری تھا۔ ہر چند کہ وہ ایک دور اندیش اور باہمت حکمران تھا' لیکن قدرت کو شاید کچھ اور منظور تھا۔ موت سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ خوانین قلات کی حریصانہ نگاہیں ایک عرصے سے مکران پر لگی ہوئی تھیں۔ میر نصیر خان اول کے مذہبی جنون نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے ذکریوں کی سرکوبی کے لیے یکے بعد دیگرے نو مرتبہ مکران پر لشکر کشی کی۔ پنجگور اور کیچ پر قبضہ کرنے کے بعد ملک دینار کو گرفتار کر لیا۔ پھر اسے پابہ زنجیر قلات لایا گیا جہاں اسے نہایت بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ ملک دینار کے لڑکے شے عمر نے مشرف بہ اسلام ہونے میں اپنی عافیت سمجھی اور اس طرح میر نصیر خان کا دل جیت لیا۔ شے عمر کو نصیر خان نے نہ صرف رہا کر دیا بلکہ اس کو کیچ کی گدی پر لا بٹھایا۔ اس پر مکران کے ذکری نہایت سیخ پا ہوئے۔ شے عمر کے چھوٹے بھائی شکر اللہ نے بغاوت کر دی اور شے عمر کو علاقہ بدر کر دیا۔ جب نصیر خان کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور ایک بھاری لشکر لے کر خود حملہ آور ہوا۔ شکر اللہ کو شکست ہوئی اور ایک دفعہ پھر شے عمر کو اقتدار سونپ دیا گیا لیکن آئے دن کی شورشوں سے میر نصیر ان تنگ آ چکا تھا' اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ مکران پر مستقلاً اپنا اثر و رسوخ رکھا جائے۔ ایک معاہدے کی رو سے یہ طے پایا کہ مکران کے مالیات کا آدھا حصہ خوانین قلات کو دیا جائے گا' اس کے بدلے خوانین کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ فوجی طور پر مکران کے حکمرانوں کی بوقت ضرورت امداد کریں گے۔

جب پہلی افغان جنگ چھڑی تو عسکری تقاضوں کی وجہ سے ۷۹۔۱۸۷۸ء میں برطانوی سامراج نے مکران پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ میجر لیچ نے قلات سے حاجی عبدالنبی کو ہدایت کی کہ وہ مکران جا کر حالات کا جائزہ لے۔ پھر جب ہند اور یورپ کے درمیان مواصلات کا سلسلہ شروع کرنے کا مسئلہ اٹھا تو میجر گولڈ سمتھ نے ساحلی علاقوں کا دورہ کیا۔ ٹیلی گراف لائن بچھا دی گئی تو ۱۸۶۳ء میں ایک اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مستقلاً گوادر میں تعینات کر دیا گیا۔

اس اثناء میں یہ محسوس کیا گیا کہ ایران آہستہ آہستہ اس علاقے میں اپنے پاؤں پھیلا رہا ہے چنانچہ برطانیہ نے ہمیشہ کے لیے

اس مسئلے کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کافی ردوکد اور گفت وشنید کے بعد جنرل گولڈسمتھ کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور ۲۴ ستمبر ۱۸۷۲ء میں کیپٹن لووٹ کا تیار کردہ سرحدی نقشہ ہردوفریقین نے منظور کرلیا۔

اس کے بعد جو حالات پیدا ہوئے انہیں کسی صورت میں بھی تسلی بخش نہیں کہا جاسکتا۔ مکران اندرونی یورشوں اور محلاتی سازشوں کا شکار نظر آتا ہے۔ ۱۸۷۷ء میں جب سر چارلس میک گریگر کا مکران سے گزر ہوا تو اسے یہ خبر ملی کہ آزاد خان والی خاران میر گجان حاکم پنجگور پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے۔ ان مخدوش حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میر فوزو خان نے پنجگور پر حملہ کردیا اور میر گجان اس حملے میں مارا گیا۔ حالات کچھ ایسی نازک صورت اختیار کر گئے کہ ۸۴۔ ۱۸۸۳ء میں سر رابرٹ سنڈیمن کو خود آنا پڑا اور بڑی مشکل سے اس نے انتظامیہ کو ازسرنو منظم کیا۔ اس نے ایک طرف رند اور سند قبائل کے اختلافات کو ختم کیا اور دوسری طرف سلطان مسقط کے ساتھ جو اس وقت گوادر پر قابض تھا' سمجھوتہ کرادیا۔ اس علاقے کے مخصوص حالات کے پیش نظر سر رابرٹ سنڈیمن کو تین دفعہ آنا پڑا۔ آخری مرتبہ ۱۸۹۲ء میں جب وہ واپس جا رہا تھا تو بیلا کے مقام پر فوت ہوگیا۔ ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۳ء تک مکران میں مقامی سرداروں اور برطانوی افسروں کے درمیان آنکھ مچولی' ہوتی رہی حتیٰ کہ ۱۹۰۷ء میں لارڈ کرزن ازخود مکران آیا اور پسنی کی بندرگاہ پر خیمہ زن ہوا۔ پنجگور میں مستقلاً ایک اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ تعینات کردیا گیا۔ مکران لیویز بھی اسی سال کھڑی کی گئی جس کا بنیادی کام علاقے میں امن وامان قائم رکھنا تھا۔



بلوچ رسم ورواج

بلوچی تہذیب اور کلچر نے خاصی حد تک اپنے خدوخال برقرار رکھے ہیں' کیونکہ عہد حاضر کی تہذیب ابھی تک ان سنگلاخ چٹانوں کو سرنہیں کرسکی۔ وہی پرانا لباس' دس گز کی پگڑی' ایک تھان کی شلوار' چار گز کا کرتا' وہی مخصوص غذا' ستووؤں کی پوٹلی' پانی کی چھاگل اور حسب توفیق چاول۔ وہی دشت نوردی' وہی خار مغیلاں۔ موسم نامہربان' معیشت' دم توڑتی ہوئی۔ غربت' ہاتھ جوڑتی ہوئی۔ ہمت' سنگ توڑتی ہوئی۔ غیرت' نقش چھوڑتی ہوئی۔

عورت کا مقام

بلوچستان میں عورت کو پاؤں کی جوتی تو تصور نہیں کیا جاتا' لیکن سر کا تاج بھی نہیں سمجھا جاتا۔ کوئی ایک آدھ تاج ہو تو انسان پہن بھی لے۔ جہاں تین چار تاج ہر گھر میں بیک وقت جگمگا رہے ہوں تو امتیاز برتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال' بلوچ معاشرے میں عورت کا ایک خاص مقام ہے۔ اگر دو قبائل میں جنگ شروع ہو جائے تو عورت کی مداخلت پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عورت خون بخشوانے کے لیے ''میڑ'' کے طور پر چلی جائے تو اس کے احترام میں خون تک معاف کر دیا جاتا ہے۔

بلوچوں میں دستور ہے کہ وہ غیر بلوچوں میں اپنی عورتوں کا رشتہ نہیں کرتے۔ ایک روایت کے مطابق جب بلوچ ایران میں بستے تھے تو والی کرمان نے بلوچوں سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے یہ خیال کیا کہ ان سے رشتے ناتے کیے جائیں' تاکہ اس کی سیاسی حیثیت مستحکم ہو' چنانچہ والی کرمان نے بلوچوں کے چوالیس فرقوں میں سے ہر ایک سے ایک ایک رشتہ طلب کیا۔ یہ مرحلہ بلوچوں کے لیے نہایت کٹھن تھا۔ اگر ایک طرف غیرت تھی تو دوسری طرف قہر سلطانی۔ ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' والا معاملہ تھا' چنانچہ انہوں نے ہر قبیلے سے ایک ایک نوعمر لڑکے کو زنانہ لباس پہنا کر حاکم وقت کے سامنے پیش کر دیا اور پیشتر اس کے کہ راز فاش ہوتا' یہ مکران بھاگ آئے۔

عام طور پر بلوچوں میں پردے کا رواج نہیں ہے۔ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن بلوچ ضابطہ اخلاق بہت سخت ہے اگر کوئی عورت اس آزادی کا غلط استعمال کرے تو پھر ''سیاہ کاری'' کی سزا موت ہے۔ ایک خاوند کے

لیے یہ اعلان کرنا کافی تھا کہ اس کی عورت "سیاہ کار" ہے۔ اس کے بعد اس کو قبائلی قانون کے تحت حق پہنچتا تھا کہ وہ ہر دو زن و مرد کو قتل کردے۔ اس قبائلی قانون کا بعض بے ضمیر لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کردیا اور محض اپنے دشمن کو ٹھکانے لگانے کے لیے یا بیوی سے چھٹکارا پانے کے لیے بے گناہ عورت پر "سیاہ کاری" کا الزام لگانا شروع کردیا۔ حکومت نے اس رواج کو ایک قانون کے ذریعے ختم کردیا ہے۔

مہمان نوازی

بلوچوں میں مہمان کی خاطر مدارات نہ صرف عام ہے' بلکہ عین جزو ایمان ہے۔ میزبان' مہمان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرتا ہے۔ بہر حال' عزیز از جان مہمان' بلائے جان اس وقت بنتا ہے جب قیام کی مدت طول پکڑ جائے۔ ہر بلوچ حسب استطاعت مہمان کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ سالم دنبہ ذبح کر کے اس کی سجی بنائی جاتی ہے۔ دستور کے مطابق کوئی بلوچ مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا تاکہ مہمان اس کی موجودگی میں کوئی حجاب یا تکلف محسوس نہ کرے۔ دستر خوان چننے کے بعد میزبان مہمان کو دعوت کام و دہن دے کر خود چلا جاتا ہے۔ اگر مہمان زیادہ ہوں تو پھر ان کے خورد و نوش کا بار تمام گاؤں والے مل کر برداشت کرتے ہیں۔

حق ہمسایہ

بلوچ معاشرے میں ہمسائے کے حقوق کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور پناہ میں آئے ہوئے شخص کی حفاظت ایک ایسا فرض ہے جو ہر بلوچ مرتے دم تک ادا کرتا ہے۔ بسا اوقات اس فرض کی تکمیل میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے' لیکن رسم زندہ رکھی جاتی ہے۔ چونکہ ہر بلوچ بنیادی طور پر غیور ہے' اس لیے پناہ لینے کی نوبت کم آتی ہے۔ بلوچ شعرا نے ان میں رومانوی رنگ بھر کے مزید کشش پیدا کردی۔ مسماۃ گوہر جس کے حسن کے چرچے بلوچستان مست آنکھوں والی ہرنیوں تک پہنچ چکے تھے' میر گوہرام خان لشاری کی ہمسائیگی چھوڑ کر میر چاکر خاں رند کی پناہ میں آگئی۔ یہ مالدار عورت تھی اور اونٹوں کے بے شمار گلے اس کی ذاتی ملکیت تھے۔ کچھ تو اس بت کافر سے بچھڑنے کا غم' کچھ سیم وزر سے محرومی کا دکھ۔ کچھ اپنے قبیلے کی تذلیل پر برہم۔ میر گوہرام خان نے بدلہ لینے کی ٹھانی اور ایک دن گوہر کی اونٹنیاں ہانک کر لے گیا۔

جب یہ خبر میر چاکر خان تک پہنچی تو وہ غصے سے بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرزنے لگا اور فوراً قبیلے کے سرداروں کو مشورہ کے لیے طلب کیا۔ میر بیورغ نے جو ایک جہاندیدہ سردار تھا' رائے دی کہ اس واقعے کو رندوں کے وقار کا مسئلہ نہ بنایا جائے بلکہ اسے رہزنی کا

ایک عام واقعہ تصور کیا جائے۔ رنداس واقعے کو کیسے فراموش کرتے؟ چنانچہ اس گرم بحث میں کسی نے بیورغ رند کو طعنہ دیا۔ بیورغ دشمن کے تیروں سے سہم گیا ہے۔ وہ نیزوں کی انی اور خنجر کی دھار سے خائف ہے۔ تلواروں نے اسے خوفزدہ کر دیا ہے۔ اے بیورغ! ڈرمت۔ جہاں ہم تلوار کے جوہر دکھلائیں گے' وہاں تجھے تیروں کی زد سے بھی بچائیں گے۔

میر بیورغ کی غیرت کے لیے یہ الفاظ تازیانہ تھے۔ ہر دو قبائل آپس میں ٹکرا گئے اور تیس برس تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ سمی نامی ایک عورت سے منسوب ہے۔ سمی ایک بیوہ عورت تھی جو پہلے تو بیورغ کی ''باہوٹ'' بنی' لیکن بعد میں گورکشیر قبیلے کے سردار دوداخان کی پناہ میں آ گئی۔ دودا قبیلے کا نوعمر سردار تھا اور ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ دودا ابھی تک زندگی کی لذتوں سے پوری طرح آشنا بھی نہ ہوا تھا کہ خبر آئی کہ راہزن سمی کی گائیں لے گئے ہیں۔ دودا خواب میں مدہوش ہے کہ اس کی ماں اس کو جھنجوڑ کر بیدار کرتی ہے اور سرزنش کرتی ہے۔

جو بہادر کسی کو پناہ دیتے ہیں' وہ دوپہر کو یوں غفلت کی نیند نہیں سوتے۔ پھر کہا ''میں نے تجھے نو ماہ تک پیٹ میں رکھا۔ تین سال تک تجھے دودھ پلایا۔ اس کے عوض تیرے ذمے یہ فرض سونپتی ہوں یا تو سمی کی گائیں صحیح سلامت واپس لے آ' یا پھر جان قربان کر دے۔

یہ الفاظ سن کر دودا پھڑک اٹھتا ہے۔ تلوار نیام سے نکال کر دشمنوں کی صفوں میں جا گھستا ہے اور لڑتے لڑتے مارا جاتا ہے۔

پابندی عہد

پرانے زمانے میں کسی شخص کی شخصیت کو جانچنے کا واحد معیار یہ تھا کہ وہ اپنا قول نبھانے میں کس حد تک ثابت قدم رہتا ہے۔ بلوچ سرداروں نے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں' لیکن اپنے مسلک سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔ رند سردار میر چاکر خاں نے عہد کیا تھا کہ زندگی بھر جھوٹ نہ بولے گا۔ جمعرات کو کوئی شخص اس سے جو چیز بھی مانگے گا وہ دے دے گا۔ میران نے عہد کیا تھا کہ وہ جس بلوچ عورت کے سر پر پانی کا مشکیزہ دیکھے گا' اس کو ایک کنیز ضرور دے گا۔ میر جاڑو نے عہد کیا تھا کہ جو شخص اس کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگائے گا وہ اسے قتل کر دے گا۔ میر ہیبت خان نے قسم کھائی تھی کہ جس شخص کا اونٹ اس کے گلے میں آ ملے گا وہ اس کو واپس نہیں کرے گا۔ ان اقوال کے پس منظر سے اتنا عزم و ثبات نہیں ٹپکتا جتنی انانیت اور جہالت جھلکتی ہے لیکن بلوچ تاریخ بتلاتی ہے کہ انہوں نے ان اقوال کو پوری طرح نبھایا۔ شاہ مرید اپنی چہیتی محبوبہ حانی تک سے دست کش ہو گیا۔ میر جاڑو نے اپنے بیٹے کو پاس عہد کی خاطر ہلاک کر ڈالا۔

کینہ توزی

انتقام ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر بلوچ کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ انتقام کی بھٹی میں بعض دفعہ افراد کی جگہ قبائل کود پڑتے ہیں۔ خاک اور خون کے اس کھیل میں وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اندھے جذبات جب بھڑکتے ہیں تو فہم و ادراک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ سوچ، تحمل اور رواداری کی قوتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بچے ماؤں کے سامنے بلک بلک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ بیویاں ڈوبتی ہوئی نظروں سے اپنے سہاگ لٹتے ہوئے دیکھتی رہتی ہیں، لیکن کچھ کر نہیں سکتیں۔ ان کے ارد گرد روایات اور بے بسی کے گہرے سمندر حائل ہوتے ہیں، کیونکہ انتقام نہ لینا ایک طرح کی بزدلی اور کمزوری تصور کی جاتی ہے۔ اس معاشرے میں صرف گردن اونچی کر کے زندہ رہا جا سکتا ہے، جھکی ہوئی گردن کے مقدر میں صرف ٹھوکریں ہوتی ہیں۔ مشہور بلوچی شاعر بالاچ کا یہ شعر بلوچوں میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔

دیر ہاں خون اوبلو چھانی
چھ رو بے دائیں لغو رانی

ترجمہ: بلوچ، خون کا بدلہ اس لیے نہیں چھوڑ سکتا کہ واقعے کو گزرے ہوئے مدت ہو گئی ہے یا بدلہ لینے والا کمزور اور کمسن ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، دودا رہزنوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی بالاچ اس وقت کمسن تھا۔ اس نے بچپن ہی میں عہد کیا تھا کہ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ ضرور لے گا، چنانچہ بڑا ہو کر اس نے اپنا عہد نبھایا اور دشمن کے قبیلے کے چھیاسٹھ آدمیوں کو قتل کیا۔

بالاچ شاعر بھی تھا۔ اس کی شاعری عوامی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ بالاچ کہتا ہے۔ ”میں اپنے دشمنوں اور دودا پر ظلم کرنے والوں کے ساتھ وہ سلوک کروں گا جو باز کبوتروں کے ساتھ کرتا ہے، جو بادِ سموم چھوٹے چشمے کے ساتھ کرتی ہے، جس طرح سور فصلوں کو تباہ کر ڈالتا ہے، جیسے بکری ہری بھری کونپلوں کو چٹ کر جاتی ہے، جو سلوک بھیڑیا بوتے (اونٹ کا بچہ) کے ساتھ کرتا ہے یا جیسے مچھیرے مچھلی کے ساتھ کرتے ہیں“... بالاچ ایک اور جگہ دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”دشمن کے ساتھ ہماری صلح اس وقت ہوگی جب گز کے درخت کو کانٹے لگ جائیں گے، سانپوں کے پاؤں نکل آئیں گے، کوے دودھ دینا شروع کر دیں گے، ہاتھ کی ہتھیلی پر بال اگ آئیں گے، کشتیاں زمین پر چلنا شروع کر دیں گی، جنگلی شیر پالتو بن جائیں گے۔

توہمات

روزِ اول سے اقوام اور افراد توہمات کے اسیر رہے ہیں۔ بلوچ قبائل میں بھی مختلف قسم کے توہمات موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص سفر پر جا رہا ہو تو اس کو پیچھے سے بلانا یا آواز دینا بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مسافر سفر پر جانے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سفر کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک جوتی کا دوسری جوتی پر آنا سفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آنکھ کا پھڑکنا کسی عزیز سے ملنے کی نوید دیتا ہے۔ ہتھیلی پر خارش آمدِ سیم و زر سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح بار بار ہچکی کا آنا بھی آمدِ دولت تصور کیا جاتا ہے۔

جس طرح پرندوں میں الو نحوست کی علامت ہے' اسی طرح بلوچوں میں گیانچ نامی پرندے سے سعادت اور نحوست کے درواہوتے ہیں۔ اگر سفر پر جاتے ہوئے آغازِ سفر میں یہ پرندہ دائیں جانب اڑتا ہوا نظر آئے تو اسے نیک شگون تصور کیا جاتا ہے' اگر اس کے برعکس یہ بائیں جانب نظر آئے تو تباہی و بربادی کی علامت ہوتا ہے۔

شانے کی ہڈی دیکھ کر مستقبل کی پیشگوئی کرنا

جس طرح ماہرینِ علمِ نجوم ستاروں کی گردش سے مستقبل کے دریچوں میں جھانکتے ہیں' اسی طرح روایات کے مطابق بلوچ ماہرین بھیڑ یا بکری کے شانے کی ہڈی کی لکیریں دیکھ کر تندرستی' بیماری' رزم و بزم اور موسمی حالات کے تغیر و تبدل کے متعلق پیشگوئیاں کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ روایت کچھ اس طرح ہے۔

ایک ماہر شخص نے سفر کے دوران میں شانے کی ہڈی دیکھی تو بید مجنوں کی طرح لرزنے لگا اور ہڈی فوراً پھینک دی۔ ایک دوسرے شخص نے جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس سے بہتر سوجھ بوجھ رکھتا تھا' اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ پہلے آدمی نے بتایا کہ شانے کی ہڈی کی لکیریں ظاہر کرتی ہیں کہ اگر وہ سفر پر روانہ ہو گیا تو اس کی موت یقینی ہے اور اگر ارادہ سفر ترک کر کے واپس چلا جائے تو اپنی بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا.... دوسرے ماہر نے شانے کی ہڈی اٹھائی' گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے آٹے کی تھیلی میں انبان (سانپ) گھسا ہوا ہے' اگر تم سفر جاری رکھو گے تو لامحالہ آٹا نکالنے کے لیے تھیلی میں ہاتھ ڈالو گے اور سانپ تمہیں کاٹ لے گا اور اگر گھر واپس لوٹو گے تو تمہاری بیوی کو یہی عمل دہرانا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ اس کا انجام بھی تم سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ تھیلی کا منہ کھول دو اور اس بلائے ناگہانی سے نجات پاؤ۔ چنانچہ جب آٹے کی تھیلی کا منہ کھولا گیا تو اس میں سے انبان نکلا جس کو فوراً مار دیا گیا۔

وزدی (چوری) اور رسم حلف

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے' بلوچستان میں وزدی کی واردات بہت کم ہوتی ہے۔ بالفرض کہیں چوری یا راہزنی کی واردات ہو جائے تو اس کی جانچ پڑتال نہایت عجیب طریقوں سے کی جاتی ہے۔ اگر مشتبہ شخص کے خلاف عینی شہادت نہ ہو تو اسے حلف دے کر تسلی کی جاتی ہے۔ بعض قبائل کے رسم و رواج کے مطابق ملزم کو آگ اور پانی میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کو بلوچی میں ''آس'' اور ''آف'' کہتے ہیں۔ ملزم کو اس بات کا اختیار دیا جاتا ہے کہ ان دو میں سے اپنی مرضی کا حلف اٹھالے۔ اگر ملزم آگ کا حلف پسند کرتا ہے تو اس کو دہکتے ہوئے انگاروں پر چلنے کے لیے کہا جاتا ہے' لیکن اگر آگ کے حلف سے گریزاں ہو تو ایک مخصوص مدت تک پانی میں غوطہ لگانا پڑتا ہے۔

آگ کے ذریعے حلف دو طریقوں سے لیا جاتا ہے۔ ایک کھائی میں لکڑیاں ڈال کر آگ لگادی جاتی ہے۔ جب لکڑیاں جل کر سرخ انگاروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو ملزم سے کہا جاتا ہے کہ ننگے پاؤں انگاروں پر چلے۔ اس موقع پر ایک ملا آگ کو قسم دیتا ہے کہ اگر ملزم بے گناہ ہے تو اس کو خدا کے نام پر محفوظ رکھے اور اگر گنہگار ہے تو فی النار کر دے۔ زندگی اور موت کے اس کھیل میں چند منصف مقرر کیے جاتے ہیں جن کی نگرانی میں تمام کارروائی ہوتی ہے اور وہ بعد میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ روایت کے مطابق اگر ملزم بے گناہ ہو تو آگ' ہر چند کہ گلزار تو نہیں بنتی' لیکن اسے بے قرار بھی نہیں کرتی اور اگر گنہگار ہو تو پھر اسے جہنم کے سفر کا تردد نہیں کرنا پڑتا.... اسی طرح پانی میں ملزم کو ایک خاص عرصے تک ڈبکی لگانی پڑتی ہے یا کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر سکے نکالنے پڑتے ہیں... تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ اب یہ رسومات قصہ پارینہ بن گئی ہیں۔

شادی بیاہ کی رسومات

شادی کے سلسلے میں چیدہ بلوچ اور براہوی رسومات تقریباً ایک سی ہیں' البتہ فروعات میں کچھ فرق ہے۔ اپنے قبیلے سے باہر شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے' لیکن اگر کوئی مناسب بر قبیلے میں نہ ملے تو بامر مجبوری دوسرے قبیلے میں رشتے ناتے کر لیے جاتے ہیں۔

میڑ

پہلے مرحلے میں ایک وفد بنایا جاتا ہے جس کو بلوچ اصلاح میں ''میڑ'' بولتے ہیں۔ یہ وفد لڑکے کے قریبی رشتے داروں پر مشتمل

ہوتا ہے اور یہ لوگ ''میٹر'' کی صورت میں لڑکی کے گھر جا کر اس کے باپ سے رشتہ مانگتے ہیں۔ اگر اگر لڑکی والے اصولی طور پر رضامندی ظاہر کر دیں تو پھر تفصیلات طے کی جاتی ہیں۔ یہ شرائط حق مہر زر ولور وغیرہ کے متعلق ہوتی ہیں زر ولور کے طور پر اکثر بھاری رقم کا مطالبہ ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں میں شاید اس کا کوئی جواز ہو لیکن آج کل ایک عام بلوچ اس کے بوجھ تلے تمام عمر دبا رہتا ہے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ زر ولور اکٹھا کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔

ابتدائی گفت وشنید کے بعد لڑکے کی ماں دیگر خواتین کے ہمراہ لڑکی کے گھر جاتی ہے اور دلہن کے سر پر سبز رنگ کی چادر جسے ''جھی'' کہتے ہیں ڈال دیتی ہے۔ رشتے کے طے ہو جانے کا اعلان بندوق کے فائر سے کیا جاتا ہے۔

شادی کی تاریخ سے سات یوم قبل دلہن کو گھر کے ایک مخصوص حصے میں رکھا جاتا ہے جسے بلوچی میں ''ڈری'' کہا جاتا ہے۔ دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ آنے والے حسین دنوں کے خواب دیکھتی ہے اور اس کی کنواری سہیلیاں بھی حسرت سے دلہن کو دیکھتی ہیں اور کبھی یاس سے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو ٹٹولتی ہیں۔ بظاہر طرب ونشاط کی ایک محفل جمی ہوتی ہے جہاں رات بھر عورتیں دف کی تھاپ پر ''ہالو ہلو'' اور ''لیلڑو ولاڑو'' کی تال پر طربیہ گیت گاتی ہیں... رات کے سکوت کو چیرتی ہوئی یہ آوازیں کانوں میں عجب سا رس گھولتی ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہیں چاندی کے نازک برتن ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں یا پہاڑوں کی گود میں بہتی ہوئی ندی دھیمے سروں میں گنگنا رہی ہو' یا کسی مہوش کے دل کی دھڑکن محبوب کے لمس سے شرما رہی ہو۔

براہوی رسومات بھی خاصی دلچسپ ہیں... مقررہ تاریخ پر بارات بڑی سج دھج کے ساتھ دلہن کے گاؤں میں آتی ہے۔ باراتی رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ اونٹوں کے بھی ہار سنگھار کئے جاتے ہیں۔ دولہا کے اونٹ کی آرائش وزیبائش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اونٹ کے گلے اور پاؤں میں گھنٹیاں اور گھنگھرو باندھے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ بارات کی دعوت کا انتظام دلہن والے کرتے ہیں' لیکن اس کا بل دولہا کی جیب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ صرف جلانے کی لکڑیوں کا خرچ دلہن کے والدین کے ذمے ہوتا ہے۔

بارات اکثر دوپہر کو گاؤں میں داخل ہوتی ہے۔ جونہی بارات گاؤں کے نزدیک پہنچتی ہے تو گاؤں والے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ نوجوان دولہا کے گرد رقص کرتے ہوئے گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ عورتیں باہر ناچتی تو نہیں ہیں' لیکن گانے کی حد تک مردوں کا ساتھ دیتی ہیں۔ جب بارات دلہن کے گھر کے قریب اپنی مقرر کردہ جگہ پر پہنچتی ہے تو دلہن کی والدہ' بہنیں' الہڑ دوشیزاؤں کا لشکر لیے آ پہنچتی ہیں۔ اب چھیڑ چھاڑ شروع ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں نمک ملا آٹا ہاتھوں میں لے دولہا کی ماں اور بہنوں پر حملہ آور ہوتی ہیں ... غضب کا رن پڑتا ہے۔ منت سماجت کی جاتی ہے۔ ہاتھ جوڑے جاتے ہیں۔ نذر نیاز دی جاتی ہے۔ مکر وفن کو بروئے کار لانا

پڑتا ہے۔فریب وعدہ فردا کے جال پھیلائے جاتے ہیں تب کہیں جا کر ان حسین بھڑوں کے رنگین چنگل سے جان بچتی ہے۔

رات کی مہندی کے وقت سے لے کر نکاح خوانی تک کی درمیانی مدت کے لیے ایک ہمہ صفت آدمی کو دولہا کا مصاحب خاص بنایا جاتا ہے.... اس کو براہوی اصطلاح میں ''جانی'' بولتے ہیں۔وہ ہر وقت دولہا کے ساتھ رہتا ہے اور اگر دولہا کے پاس اسلحہ ہو تو اس کی بھی حفاظت کرتا ہے... چونکہ براہوی اصطلاح میں دولہا کو بادشاہ کہا جاتا ہے'اس لیے متذکرہ شخص وزارت کا قلمدان سنبھال لیتا ہے۔مہندی کی رسم کے وقت بھی جانی دولہا کے پاس ہوتا ہے۔مہندی دلہن کی قریبی رشتے دار خواتین لگاتی ہیں اور مہندی کے برتن میں جانی حسب توفیق چاندی کے روپے ڈال دیتا ہے۔مخصوص رقم کی قید نہیں ہے'صرف شرط یہ ہے کہ روپے جفت ہوں' طاق نہ ہوں۔

شام کو غسل اور تخت نشینی کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔غسل کے لیے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔دولہا نہایت تزک واحتشام سے مقررہ جگہ پر پہنچتا ہے۔اس وقت اس کے نوجوان دوست اور اس کے رشتے دار اس کے اردگرد تلواریں تانیں پہرہ دیتے ہیں... لوڑی (مراثی) تیل' صابن' عطر وغیرہ تیار کر کے لگاتا ہے اور دولہا کو غسل کراتا ہے۔غسل کے بعد دولہا کو نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔اس موقع پر چند عورتیں طربیہ گیت گاتی ہیں۔

غسل سے فراغت کے بعد نکاح خوانی کی رسم شروع ہوتی ہے۔نکاح اس جگہ پڑھایا جاتا ہے جہاں دولہا اور دلہن کو تین راتیں گزارنی ہوتی ہیں۔اس مخصوص جگہ کو ''کوٹھو'' کہا جاتا ہے۔

جب دولہا بصد ناز کوٹھو کے قریب پہنچتا ہے تو دلہن والے اس کی طرف اون کا بنا ہوا خوبصورت وزنی پھول پھینکتے ہیں جس کو دبوچنا جانی کی ذمے داری ہوتا ہے۔جانی پھول کو کوٹھو کے خیمے کے پاس ایک لکڑی پر لٹکا دیتا ہے۔اس کو فتح ونصرت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔جانی کو پھول دبوچنے میں خاصی ہشیاری دکھلانی پڑتی ہے' کیونکہ ناکامی کی صورت میں ہر طرف سے اس پر طنز وتشنیع کے تیر برسنا شروع ہو جاتے ہیں اور چھوٹے بچے تالیاں پیٹ پیٹ کر اس کی رسوائی کی تشہیر کرتے ہیں۔

اونی پھول علامت ہے اس بات کی کہ ہم نے پھول جیسی نرم ونازک اور کومل دلہن تمہارے قدموں میں پھینک دی ہے... دولہا کے کوٹھو میں بیٹھتے ہی رنگا رنگ تقاریب کا آغاز ہوتا ہے۔لوڑی ڈھول پر تھاپ دیتا ہے۔نفیری' اپنی مدھر تانیں فضا میں بکھیرتی ہے اور بلوچی رقص شروع ہو جاتا ہے۔

رسم نکاح خوانی

اب اصل کام شروع ہوتا ہے۔ نکاح سے قبل چونکہ دلہن کی رضامندی ضروری ہوتی ہے' اس لیے دولہا کی طرف سے دو حاضر جواب' زبان دراز قاصد (ربالو) مقرر کئے جاتے ہیں جن کا فرض یہ ہوتا ہے کہ دلہن کے گھر جا کر اطلاع دیں کہ اب نکاح خوانی شروع ہونے والی ہے' اس لیے دلہن کو بھی وہاں لایا جائے۔ جب ربالو وہاں پہنچتے ہیں تو ان کی مڈبھیڑ دو بوڑھی عورتوں سے ہوتی ہے۔ اس موقع پر نہایت عمدہ اور اچھوتی قسم کی نوک جھونک ہوتی ہے۔ اسے من وعن بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا... سوال و جواب کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

ایک نک چڑی حرافہ بڑی رعونت سے پوچھتی ہے ''تم لوگ کون ہو'' کیا ڈھونڈتے ہو؟ وہ کونسی چیز ہے جس نے تمہاری یہ بری حالت بنا دی ہے؟ کیوں در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہو''... قاصدوں میں جو زیادہ خرانٹ اور چرب زبان ہوتا ہے' جواباً کہتا ہے۔

''ہم بادشاہ سلامت کے قاصدان خاص ہیں۔ اور انہی کے حکم کے تحت ان کے وزیر باتدبیر نے ہمیں بھیجا ہے اور تمہیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے ہاں ان کی رانی 'لعل' ہے' وہ آپ ہمارے حوالے کر دیں تاکہ بادشاہ سلامت تک پہنچائی جاسکے۔''

اس نادر شاہی فرمان کا عورتوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا اور وہ ہنس کر کہتی ہیں... ''ہم کسی بادشاہ کو نہیں جانتیں اور نہ ہی ہم نے اس کو دیکھا ہے' البتہ ہمارے بچوں نے جو شام کو کھیل کر گھر واپس آئے' ہمیں اطلاع دی ہے کہ چند مفلوک الحال گداگر چیتھڑوں میں ملبوس' گاؤں کے باہر ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ لولے ہیں اور کچھ لنگڑے ہیں۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر ہڈیاں چن چن کر کھا رہے ہیں اور جنگلی درختوں کے کڑوے پتوں کو چبا رہے ہیں... بھلا بادشاہ ایسے ہوتے ہیں؟ تم لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ دم دبا کر بھاگ جاؤ' نہیں تو ہماری بستی کے جوان تم لوگوں کا مار مار کر حلیہ بگاڑ دیں گے اور تمہیں ایسی عبرتناک سزا دی جائے گی کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔

اس ہرزہ سرائی پر ربالو پیچ پا ہو جاتے ہیں اور واپس جاتے جاتے یہ دھمکی بھی انہیں دے جاتے ہیں ''تمہاری یہ لن ترانیاں ہمارے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ تمہاری زبان درازی کی شکایت بادشاہ سلامت کے حضور میں کی جائے گی۔ اب تم عتاب شاہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

لیکن دلہن والے بھی باخبر ہوتے ہیں' اس لیے اس دھمکی سے مرنا تو در کنار ڈرتے بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ واپسی پر گاؤں کے بچے ان کو کنکر مارتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں... واپسی پر ربالو اپنی تضحیک اور تذلیل کو کڑوی دوا کی طرح نگل جاتے ہیں اور کوٹھو میں جا کر شیخی بگھارتے ہیں' خدائے بزرگ و برتر ہمارے بادشاہ سلامت کے جلال کو کبھی زوال نہ آنے دے۔ یہ وحشی لوگ ڈینگیں مارنے کے عادی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ حضور کا لعل (دلہن) ان کے پاس ہے اور یہ ایک دن ضرور عظمت شاہی کے معترف ہو کر لعل

آپ کی نذر کریں گے۔

چائے پانی پی کر یہ دوبارہ جاتے ہیں۔ یہ رسم تین مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ بال آخر خاصی بحث وتکرار کے بعد دلہن والے یہ پیغام دے کر قاصدوں کو واپس بھیج دیتے ہیں... ہم شریف النفس اور دیانتدار لوگ ہیں' اس لیے کسی کی حق تلفی کو اپنے اوپر حرام سمجھتے ہیں' لہٰذا تم لوٹ جاؤ اور دوبارہ مت آؤ۔ تمہارے لولے لنگڑے کا لعل تو کیا! اگر مثقال بھی ہمارے پاس ہوگا تو ہم بخوشی خود بخود واپس کر دیں گے۔

اس مژدہ جانفزا کے بعد رہا لو واپس لوٹ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد دلہن بھی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کوٹھو کے ایک الگ حصے میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔ یہ فاصلہ عموماً ڈیڑھ سو گز کا ہوتا ہے۔ اب نکاح کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ نکاح کے فوراً بعد دلہن والوں کی طرف سے ایک بڑے برتن میں دودھ پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے دولہا برتن میں سے چند گھونٹ لیتا ہے۔ اس کے بعد دلہن گھونگھٹ سے منہ نکال کر اپنے شیریں لب بھگوتی ہے.... باقی دودھ رقیبان خاص وعام کے حصے میں آتا ہے جو پیتے ہیں اور بدمزہ نہیں ہوتے۔

رات ڈھلے یہ رسومات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں' تب کہیں جا کر مشتاقان دید کی عید ہوتی ہے۔ سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک آ ملتے ہیں۔ دلوں کی ہر دھڑکن نوید وصل دیتی ہے۔ ہر کیفیت چشم شراب وصل محسوس ہوتی ہے.... اب بادشاہ سلامت تمام طبل وعلم کے مالک ومختار ہوتے ہیں۔ ان کی اقلیم میں کسی غیر کا گزر نہیں ہوسکتا۔ جو نادر شاہی فرمان چاہیں' صادر کر دیں۔ جو چنگیزی قانون سوچیں نافذ العمل کر دیں۔

سہاگ رات جہاں اپنے جلو میں خوشیوں کی بارات لاتی ہے' وہاں بعض اوقات حسرتوں کی سوغات بھی لے آتی ہے۔ اگر دولہا کے ذہن میں ذرا سا بھی شک پڑ جائے کہ دلہن باکرہ (کنواری) نہیں ہے تو پھر جس مہندی سے وہ ہاتھ رنگتا ہے وہ شگنوں کی مہندی نہیں ہوتی' بلکہ موج خون ہوتی ہے.... بہر حال' اگر امور سلطنت ٹھیک طرح سرانجام پا جائیں تو صبح کو بڑی بوڑھیاں اور دلہن کی سہیلیاں نو بیاہتا جوڑے کو مبارکباد دینے آتی ہیں اور گندم' جوار اور چاول کے دانے ان پر نثار کرتی ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ خدا ان کو صاحب اولاد کرے۔

طریق علاج

بلوچوں میں علاج کے طریقے بھی نرالے ہیں' کیونکہ ہر طرف ہسپتال ناپید' ڈاکٹر مفقود' دوائیں عنقا.... جس ڈاکٹر کے دل میں انگلستان بستا ہو' وہ ظاہر ہے بلوچستان کے نام ہی سے بدکے گا۔ جو نرس مریض کی بارک تک نہیں پہنچ پاتی وہ بھلا پدراک کیسے جائے

گی؟ جن ہسپتالوں کا لاہور اور کراچی میں بھی کال ہے' ان کا وجود پسنی اور گوادر میں محال ہے... اس لیے ہر چہ بادا باد کوئی جڑی بوٹیوں پر انحصار کر رہا ہے تو کوئی پیروں فقیروں کے اعتبار میں مر رہا ہے۔ بدقسمتی سے جہاں جہالت اور غربت ہمکنار ہوتی ہیں' وہاں تکالیف اور محرومیاں بھی بے شمار ہوتی ہیں۔ بیماری موت کا پروانہ لے کر آتی ہے۔ جاں بلب مریض کچھ تو مرض سے نڈھال ہوتا ہے' کچھ نذر و نیاز دے کر کنگال ہوتا ہے۔ ادھر بیماری آن گھیرتی ہے تو ادھر ملا اس کے گھر ڈیرا ڈال دیتا ہے۔ بکرے ذبح ہو رہے ہیں' بھوت پریت کو رام کرنے کے لیے دیگیں دم ہو رہی ہیں۔

علاج کے لیے ملا کسی مراثی یا سازندے کو ساز بجانے پر مامور کرتا ہے۔ جب مراثی تنبورے پر کوئی دھن چھیڑتا ہے تو ملا پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ عالم جذب میں ساز کے تال پر بے خودی میں رقص کرنے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ مریض کو دم بھی کرتا جاتا ہے۔ اس طرح مریض کو دو تین راتیں دم کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بلوچوں میں داغ کی رسم بھی عام تھی۔ نزلے درد سر اور اعصابی تناؤ کے لیے لوہے کی سلاخ گرم کر کے مریض کے جسم کے کسی حصے کو داغ دیا جاتا تھا' لیکن اب اس قسم کے علاج سے بلوچ اجتناب کرتے ہیں۔ بعض قبائل میں نمونیہ' یرقان اور بخار اتارنے کے لیے مریضوں کو جانوروں کی کھال پہنائی جاتی تھی۔ یرقان کے لیے بکری کی تازہ کھال موزوں خیال کی جاتی تھی۔ جبکہ نمونیہ کے لیے بھیڑ کی کھال کو استعمال کیا جاتا تھا۔

چھوٹے بچوں کے امراض کا علاج انہیں گائے کی اوجھڑی سے نکلنے والے مواد میں پوری طرح لتا کر کیا جاتا تھا۔ طفلک کو پورے بارہ گھنٹے اس کے اندر رکھا جاتا ہے۔ صرف آنکھیں' ناک اور منہ کھلے رہتے ہیں۔

براہوی قبائل میں خاصی حد تک جڑی بوٹیوں پر بھی انحصار کیا جاتا ہے۔ ان بوٹیوں کے مختلف نام ہیں... کول موز اور خسین جہر' قبض کشائی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح 'ماشے ٹو' بوٹی ضعف جگر کے لیے اکسیر تصور ہوتی ہے۔ حسین بھورا اور پسین پھلی ہر قسم کے بخار کے لیے مریض کو دی جاتی ہے۔

بجار یا پھوڑی کی رسم

بجار یا پھوڑی کے پس پردہ جو بنیادی جذبہ کارفرما ہوتا ہے' وہ امداد باہمی کا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جو بینک بیلنس کی کرامات سے ناآشنا ہو' جہاں ضروریات زندگی کی قلت ہو اور ذخیرہ اندوزی کی علت نہ ہو' جہاں انسانی اقدار ابھی تک پامال نہ ہوئی ہوں اور جہاں ضمیر آدمیت ہنوز زندہ ہو' وہاں ایک دوسرے کی امداد کرنا فرض ہی نہیں' قرض بھی سمجھا جاتا ہے... جشن مسرت ہو یا مرگ اندوہناک' قبیلے کے لوگ نہایت فراخدلی اور فیاضی کے ساتھ مالی امداد کی صورت میں اپنی عملی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں

...اگر کوئی غریب بلوچ شادی کرنا چاہتا ہے اور مروجہ لب یا زرولور دلہن کے والدین کو ادا نہیں کر سکتا یا اسے کوئی اور آفت ناگہانی آن گھیرتی ہے تو وہ خود یا اس کے عزیز و اقارب قبیلے کے لوگوں سے امداد طلب کرتے ہیں.... اس کو بلوچی میں بجار یا پھوڑی کہا جاتا ہے۔ استطاعت رکھنے والے لوگ حسب حیثیت نقد یا جنس کی صورت میں اس کی امداد کرتے ہیں۔ چونکہ کوئی شخص بلا ضرورت بجار نہیں کرتا' اس لیے نہ تو اس کو گدائے بے حیا سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی وہ فقیر بے نوا متصور ہوتا ہے... اس طرح عزت نفس بھی محفوظ رہتی ہے اور معاشی تقاضوں سے بھی نجات ملتی ہے۔ پھوری اور بجار میں فرق یہ ہے کہ "پھوری" حاصل کرنے کے لیے خود لوگوں کے پاس جانا پڑتا ہے' جبکہ قبیلے کے لوگ بجار خود بخود اپنے عزیز و اقارب یا سردار کو رضا کارانہ طور پر پیش کرتے ہیں۔ بجار شادی اور غمی دونوں مواقع پر پیش کی جاتی ہے.... اس میں دنبہ' بکری یا نقد رقم دی جاتی ہے۔



سکندر اعظم کے نقش قدم پر

لیکن خوشی کے جس سمندر کی طرف ہم آنکھیں بند کر کے دوڑ رہے تھے' وہ سراب نکلا۔ امید کا جو چراغ ہم نے بھولے سے جلا ڈالا تھا' اس کی تپش سے اپنا ہی وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ صور اسرافیل تو بے شک ہم نے سن لیا تھا' لیکن مکران سے نکلنے کے لیے کسی بال جبریل کی ضرورت تھی۔ اگر روایتی راستہ اختیار کیا جاتا تو وقت سفر ہی میں تین ماہ بیت جاتے۔ پھر رخت سفر کا مسئلہ بھی غور طلب تھا۔ مصائب کے خارزار میں بلند نگاہی اور سخن دلنواز صرف میر کارواں کا حصہ ہیں' گرد کارواں کو ان سے کچھ سروکار نہیں ہوتا' لہٰذا وہ بستر جو ہم نے نہایت عجلت میں گول کیا تھا' کھول دیا... اگلے چند روز صلاح مشورے میں گزر گئے۔ اس دوران میں کئی چھوٹی موٹی میٹنگز ہوئیں۔ چند قراردادیں بھی متفقہ طور پر پاس کی گئیں۔ جغرافیہ کو تاریخ کے آئینے میں دیکھا' اپنے مخدوش حالات کو مخصوص واقعات کی کسوٹی پر پرکھا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ براستہ پسنی کراچی پہنچا جائے۔

راستے کا تعین ہم نے بڑی سوچ بچار کے بعد کیا تھا اور اس میں بڑی مصلحت کارفرما تھی۔ جس راستے نے سکندر اعظم اور سائرس کے قدم چومے تھے ان راہوں پر چلنے کا تصور ہی ایک نشاط انگیز کیفیت رکھتا تھا۔ اگر انسان زندگی میں خود عظیم نہ بن سکے تو عظمت کی گواہی دینا بھی ایک قسم کی بڑائی ہے اور یہ وہ نکتہ ہے:

سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

شاہنامہ پڑھ کر قاری اس مخمصے میں پڑ جاتا ہے کہ ایران کا کڑیل جرنیل رستم عظیم تھا یا ارض طوس کا خمیدہ پشت بوڑھا جس کی تیس سال کی عرق ریزی نے اسے شہرت دوام بخشی' خوبصورتی وارث شاہ کے کلام میں ہے یا ہیر رانجھے کے اجسام میں تھی۔

اب ہم سفر کے لیے پوری طرح تیار تھے' صرف ایک چھوٹی سی رکاوٹ باقی تھی اور وہ یہ کہ پسنی تک کوئی باقاعدہ ٹرانسپورٹ نہ چلتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اسی میل کا فاصلہ اونٹ پر بیٹھ کر تو طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پیدل چلنا بھی بظاہر مضحکہ خیز سی بات تھی۔ اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ قدرت نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ وہی ڈاکٹر جو سر درد اور بے خوابی کا علاج کرنے میں ناکام ہو گیا تھا' خضر راہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر ریاض اپنی نئی نویلی سرکاری گاڑی میں ایک مریض کا علاج کرنے پسنی جا رہا تھا۔ پسنی میں اس وقت کوئی ڈاکٹر نہ تھا اور باشندگان پسنی کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ یا تو تربت سے زر کثیر خرچ کر کے ڈاکٹر منگوائیں یا پھر نقد جان جان

آفریں کے سپرد کردیں۔ تین دن کے کٹھن سفر کے بعد مریض کا کوئی قریبی رشتے دار تربت پہنچا اور اس نے ڈاکٹر کے پاؤں میں پگڑی کے ساتھ ساتھ اپنا بٹوا بھی پھینک دیا۔ ڈاکٹر بھی آخر انسان تھا' اس کا دل کیسے نہ پسیجتا' فوراً تیار ہو گیا۔

ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا' جیپ میں اپنا مختصر سا سامان رکھا اور چل پڑے۔ ہر چند کہ گاڑی نئی تھی' ڈاکٹر کے اعصاب خاصے مضبوط تھے اور مریض کے رشتے دار کی جلد از جلد پہنچنے کی خواہش بھی کروٹ پہ کروٹ لے رہی تھی' لیکن گاڑی کی رفتار دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی تھکا ماندہ مسافر خارزار ہستی میں پا پیادہ چل رہا ہو۔ ہر گام پہ اندھے موڑ تھے۔ ہر سانس پر نشیب و فراز تھے۔ اگر پل میں گاڑی سر میہوڑائے رکوع کی حالت میں چل رہی ہے تو پل میں کسی سرکش گھوڑے کی طرح الف ہو گئی ہے۔ اگر ایک لمحہ کسی رقاصہ کی طرح اپنے دائیں طرف جھکی ہے تو دوسری لمحے کسی بازی گر کی طرح تنگ سڑک کے رسے پر جھول رہی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف زرد رنگ کی بھربھری پہاڑیاں کھڑی تھی۔ یہاں بھی میلوں آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ جیسے جیسے ہم پسنی کے نزدیک پہنچ رہے تھے پتھروں کی جگہ ریت کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ جب گاڑی لڑکھڑاتی ہوئی آخری پہاڑی کے چنگل سے آزاد ہوئی تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے شروع ہوئے۔ پسنی ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیاں بحیرہ عرب تک جا پہنچتی ہیں۔ حد نگاہ تک نیلگوں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سفید بادبانوں والی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اس کے سینے پر راج ہنسوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ ماہی گیر گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ تمام فضا میں ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ ماحول پر ایک اجنبی خوف سوار تھا۔ ہم نے سامان اتار کر اپنے کمرے میں رکھا۔ ڈاکٹر ریاض نے چوکیدار کو بلا کر چائے بنانے کے لیے کہا۔ ملک صاحب چونکہ اپنی کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے اس لیے ڈاکٹر مجھے ساتھ لے کر مریض دیکھنے چلا گیا۔

بڑا دردناک منظر تھا۔ چودہ سال کا خوبصورت لڑکا موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھوں سے بے بسی جھلک رہی تھی۔ مامتا کی ماری ماں پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر ریاض کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر! میرے اکلوتے بیٹے کو بچا لو۔ میری زندگی میرے چاند کو دے دو۔ خدا کے لیے کچھ کرو نہیں تو...'' اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں کی ندی اس کے چہرے کی جھریوں سے بہتی ہوئی اس کے دوپٹے تک آن پہنچی تھی۔ غریب باپ پر سکتہ سا طاری تھا۔ الفاظ اس کے حلق تک آتے آتے اٹک جاتے۔ ڈاکٹر نصف گھنٹے تک بچے کا معائنہ کرتا رہا۔ مختلف آلات سے اس کے ٹخنے اور کہنی کی ہڈیاں ٹھونکتا رہا اور پھر یکے بعد دیگرے دو انجکشن لگا دیے۔ اہل خانہ کو جب وہ ضروری ہدایات دے کر باہر نکلا تو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''کوئی امید ہے؟'' ''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ خاصا خطرناک مرض ہے۔ مریض ڈیلیریم میں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا

''اگر مجھے پہلے دن ہی اطلاع مل جاتی تو مریض کو بچایا جا سکتا تھا'' جہاں تین دن صرف قاصد کے پہنچنے میں لگ جائیں وہاں پہلے دن اطلاع کیسے پہنچتی؟ موت کے فرشتے نے ایسے گھر کو تاکا تھا جس کے مکین پہلے ہی زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں بیکسوں نے کس جتن سے ڈاکٹر کی فیس اور دیگر اخراجات برداشت کیے ہوں گے۔

ہم نے ریسٹ ہاؤس واپس آ کر کپڑے بدلے اور ابھی چائے پی رہے تھے کہ مریض کا باپ ہانپتا ہوا آیا اور ڈاکٹر سے کہنے لگا کہ لڑکے کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر جوتے پہنے اور اپنا بیگ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا: ''تم ہو آؤ'' دراصل اس رقت انگیز منظر کی تاب لانا اب میرے بس میں نہ تھا۔ اب کے ڈاکٹر خاصی دیر بعد آیا۔ کہنے لگا۔ ''لڑکا کوما میں چلا گیا ہے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ اسے کراچی لے جائیں۔'' پھر خود ہی آنکھوں کو ملتا ہوا بولا ''شاید اس کی نوبت نہ آ سکے۔''

سب کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی۔ چوکیدار نے میز پر کھانا چن دیا تھا' لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔ مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ آنکھیں بند تھیں' لیکن ذہن بیدار تھا۔ نصب شب کے قریب زور کی دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر بتی جلائی۔ لڑکے کا والد پھر آیا تھا۔ اب کے ڈاکٹر بغیر کچھ بولے اس کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میں نے بے تابانہ پوچھا۔

''جو ہونا تھا' سو ہو کر رہا۔''

Inevitable has happened ڈاکٹر انگریزی میں بولا اور جوتے اتار کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ میری نیند اڑ چکی تھی۔ بستر پر سونا دوبھر ہو گیا تو میں جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔ پورے چاند کی رات تھی۔ سوگوار چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کی موجیں کف اڑاتی ہوئی ریسٹ ہاؤس تک آتیں اور پھر واپس لوٹ جاتیں۔ جانے کب تک میں ریت پر بیٹھا انگلیوں سے بے ہنگم سی لکیریں کھینچتا رہا۔ جب میں سنبھلا تو سورج سمندر کی لہروں پر سے پھسلتا ہوا ابھر رہا تھا۔

جہاز جانے میں ابھی ایک دن باقی تھا۔ ڈاکٹر دوسرے دن ناشتہ کر کے واپس تربت چلا گیا تو ملک صاحب اور میں شہر دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ ایرین نے جس علاقے کے خدوخال کا تئیس سو سال پرانا نقشہ کھینچا تھا' اس نے وضع داری میں اپنی ہیئت کو جوں کا توں رکھا تھا۔ ریت کی عمودی دیواریں جنہوں نے سکندر کی فوج کو ہلکان کر دیا تھا' اب بھی تن کر کھڑی ہوئی تھیں۔ حشرات الارض جنہیں دیکھتے ہی سپاہیوں کے چہرے زرد پڑ جاتے' اب بھی آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے۔ ویرانی' جو سکندر کی روح تک جا پہنچی تھی اب بھی اس علاقے پر حکمرانی کرتی تھی' خوراک کی کمی کا مسئلہ جو ہزاروں سال پہلے پیدا ہوا تھا اب ماشاء اللہ پل کر جوان ہو گیا

تھا۔تمام شہر کی آبادی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ مکانوں کے اندر' دکانوں کے باہر' گلیوں کے بیچوں بیچ' سڑک کے دائیں بائیں سوائے ریت کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ ڈاک خانہ جو غالباً سر رابرٹ سنڈیمان نے بنوایا تھا' صرف جلی حروف میں لکھی ہوئی تختی سے پہچانا جاسکتا تھا۔ وہ سکول جو بچوں کی تعلیم کے لیے بنا تھا' اسے اپنی تحویل میں لینے کے لیے محکمہ آثار قدیمہ والے بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ...وہ ہسپتال جس کا نام کبھی اہل دل نے دار الشفا تجویز کیا تھا' اب دار القضا بنا ہوا تھا۔

دن کسی طرح کٹ گیا' چونکہ دوسرے دن ہمیں پی آئی اے کے فوکر سے کراچی جانا تھا' اس لیے جلد ہی سو گئے۔ صبح کاذب کے آثار پوری طرح مٹ بھی نہ پائے تھے کہ ایجنٹ اپنی مریل سی گاڑی لے کر آ گیا۔ ہوائی اڈہ پسنی سے دس میل کے فاصلے پر تھا' کیونکہ دس میل سے کم فاصلے پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جو ریت کے تسلط سے بچی ہوئی ہو۔ پی آئی اے نے حکومت کے اشارے پر ہفتے میں دو پروازوں کا اہتمام کر دیا.... چونکہ سودا گھاٹے کا تھا' اس لیے انہوں نے بھی پرواز کا وقت وہ مقرر کیا تھا جس سے الو بھی بے آرام ہونا پسند نہیں کرتے۔ جب گاڑی کے ہارن نے مسلسل ڈکرانا شروع کیا تو ہم بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے' یوں لگتا تھا کہ ایجنٹ گاڑی پر نہیں' بلکہ ہارن پر بیٹھ کر وہاں تک پہنچا تھا۔ ہم نے اندر سے بہت کہا کہ بابا سن لیا ہے۔ اب بس کرو اور تیار ہونے دو' لیکن مکھی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اسے غالباً دیگر مسافروں کو بھی اٹھانا تھا اس لیے ہارن سے چمٹا رہا۔ جب تک ہم تیار ہو کر باہر نہیں نکلے' وہ ساز دل آزار بجتا رہا۔

اس دنیا میں ہر حقیقت کسی خیال کی پیداوار ہے۔ جب خیال نقطہ عروج پر پہنچتا ہے تو اکثر انسان کی مساعی سے ٹھوس حقیقت میں ڈھل جاتا ہے۔ گویا خیال نقطہ آغاز ہے اور حقیقت حرف انجام.... لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ گویا خیال نقطہ آغاز ہے اور حقیقت حرف انجام... لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ حقیقت خیال میں بدل جاتی ہے۔ اس کے تار و پود اس طرح بکھرتے ہیں کہ خیال بھی خواب معلوم ہوتا ہے۔ اسی قسم کی ایک ڈوبتی ہوئی حقیقت پسنی ایئرپورٹ ہے۔ ایک نیم پختہ کمرے میں چند ڈھیلی چولوں والی کرسیاں' ایک صوفی منش میز جس کی چوتھی ٹانگ کے متعلق اگلے وقتوں میں کئی بجھارتیں ڈالی جاسکتی تھیں۔ ایک ٹرانسسٹر نما آلہ جس کا پائلٹ کے ساتھ رابطہ اکثر جہاز اترنے کے بعد ہی قائم ہوتا۔ حد نگاہ تک پہاڑیاں اور ان کے پہلو میں مٹی کی ایک سیدھی لکیر جس کو ''رن وے'' کہا جاتا ہے اور بس... سادگی اگر نعمت ہے تو پسنی ایئرپورٹ اس نعمت سے مالا مال تھی۔ بچت اگر ضرورت وقت تھی تو یہ حدود وقت سے بڑی آگے نکل چکی تھی۔ بہر حال' ہمیں نہ تو ایئرپورٹ کے حسن سے کچھ سروکار تھا نہ اس کے لوازمات سے کچھ پرخاش۔ ہمیں تو صرف اس جہاز کا انتظار تھا جو ہمیں جیتے جی ایک دفعہ مقام سنگ وخشت سے جہان رنگ وبو میں لے جاسکے۔ لیکن

اس بدقسمتی کا کیا علاج جو ایئرپورٹ تک ہمارا پیچھا کرتی ہوئی آن پہنچی تھی.... چند گھنٹوں کے جاں گسل انتظار کے بعد پتہ چلا کہ سمندر نے چند دن پہلے موج میں آ کر کہیں سر اٹھایا تھا جس سے رن وے بھی بالمشافہ سرشار ہوا تھا۔ اس لیے جہاز لینڈ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ ملک صاحب نے قہر آلود نظروں سے مکھی کو گھورا۔ مکھی نے بے بسی سے کندھے اچکائے اور مریل گاڑی واپس پسنی کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی چل پڑی... ''کمبخت نے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیا'' میں نے کہا۔ ''سوچا تھا کہ ایئرپورٹ ریسٹورنٹ پر ناشتہ کر لیں گے۔'' ''سوچنا چھوڑ دو'' ملک صاحب کہنے لگے ''زندگی آرام سے کٹ جائے گی۔ دکھ درد کے تمام جوالا مکھی اسی آتش فشاں سے پھوٹتے ہیں' اسی کی برکت سے آرزوئیں خاک میں ملتی ہیں۔ اسی کی حرکت سے قلزم خون متلاطم ہوتا ہے۔'' ملک صاحب کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا' اس لیے میں بھی مکھی کی طرح سیٹ پر دب کر بیٹھ گیا۔

جب ہم واپس ریسٹ ہاؤس پہنچے تو سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔ چوکیدار باہر ہی کھڑا تھا۔ گاڑی رکی تو اس نے ہمارا سامان اتار کر نیچے زمین پر رکھ دیا۔ ''جہاز اتر نہیں سکا'' ملک صاحب نے اپنے واپس آنے کی وضاحت کرنا چاہی۔ ''اکثر ایسا ہی ہوتا ہے'' وہ کہنے لگا۔ اس لیے میں نے احتیاطاً کمرہ کھلا رکھا ہوا ہے۔ کمرہ تو کھلا ہوا تھا لیکن ہمیں اپنے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ ہم برے پھنسے تھے۔ واپس جانے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ویسے بھی واپس جانا امید کی موت تھی۔ جب امید مر جائے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ تمام نفوس کا رشتہ صرف اسی دھاگے سے بندھا ہوتا ہے۔ اگر یہ دھاگا ٹوٹ جائے یا توڑ دیا جائے تو نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے اس ڈوری کا سرا زخمی ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ ہم ایک دفعہ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ کہنے لگے ''کیوں نہ گوادر سے جہاز پکڑا جائے؟'' ملک صاحب ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے تھے۔ جہاز پکڑنے کے بہانے انہوں نے میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ میری گوادر سے جذباتی وابستگی کا انہیں بخوبی علم تھا اور کم از کم جیتے جی اس خیال پر مجھ سے کسی منفی ردعمل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے فرط شوق سے ملک صاحب کی طرف دیکھا اور عین اس وقت جب میرے جذبات میں اک آگ سی لگی تھی' ملک صاحب نے اس پر تھوڑی سی اوس اس خیال سے ڈال دی مبادا آتش فشاں سے کہیں وجود ہی پگھل نہ جائے۔ کہنے لگے۔ ''لیکن ٹرانسپورٹ کا بندوبست کہاں سے ہوگا۔''

''ارے ہاں ٹرانسپورٹ کا بندوبست کہاں سے ہوگا۔'' وارفتگی میں یہ کربناک حقیقت میرے ذہن سے یکسر نکل گئی تھی۔ ملک صاحب کہنے لگے: ''کیوں نہ کسٹم والوں سے جیپ منگوائیں''... کسٹم والوں سے جیپ مانگنا اسی طرح تھا جس طرح آدمی تاریخ پر نظر ڈالے بغیر کوہ طور پر جا کھڑا ہو اور تجلیات کی خواہش شروع کر دے لیکن یہ تو لازم نہیں تھا کہ:

سب کو ملے ایک سا جواب

لہٰذا سیر کو وہ طور میں قطعاً کوئی حرج نہ تھا۔ چنانچہ جب ہم اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم کے دفتر بظاہر 'کرٹسی کال' کرنے لگے اور چائے کے دوران میں ملک صاحب حرف مدعا زبان پر لانے کے لیے کوئی تمہید اٹھانے ہی والے تھے کہ احمد حسین شاہ کہنے لگے۔ ''ملک صاحب میری خواہش تھی کہ آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھاتے۔ چونکہ میں آج ایک ضروری کام سے گوادر جا رہا ہوں' اس لیے معذرت خواہ ہوں۔'' چائے کی پیالی ملک صاحب کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ اگر انہیں اپنے جذبات پر قابو پانے کا ملکہ حاصل نہ ہوتا تو ضرور کہہ بیٹھتے شاہ بادشاہ! اک واری فیر کہہ (شاہ صاحب ایک دفعہ پھر کہیں) لیکن مسرت کی جو لہر مدوجزر کی طرح ملک صاحب کے چہرے پر ابھری تھی' اسے انہوں نے چائے کے گھونٹ کے ساتھ ہی حلق سے نیچے اتار لیا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ ''شوکت! کیسا حسین اتفاق ہے کہ ہم بھی آج ہی گوادر جا رہے ہیں۔ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہی باعث ثواب ہے چہ جائیکہ انسان ڈیڑھ سو میل تک ان کا ہم رکاب رہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج کا سفر اس گناہگار کی نجات کا عنوان بنے گا۔'' اس کے بعد جو انہوں نے آنکھیں بند کر کے خشوع و خضوع سے سر جھکایا تو ایک لمحے کے لیے ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے تمام کائنات تسبیح پڑھ رہی ہے۔ اب اگر احمد حسین شاہ یہ پوچھ بیٹھتے کہ صاحب آپ گوادر تو جا رہے ہیں' لیکن آپ نے سواری کا کیا بندوبست کیا ہے تو یقیناً ڈاکٹر ریاض کو ایک دفعہ پھر طلب کرنے کی نوبت آ جاتی۔ لیکن شاید ملک صاحب کے عارفانہ کلام سے شاہ صاحب بھی مسحور ہو گئے تھے۔ کہنے لگے ''چشم ما روشن دل ما شاد! میری اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ ایسے ''برائٹ'' لوگوں کے ساتھ سفر کروں۔ میں آج کا سفر آپ لوگوں کی نذر کرتا ہوں۔''

سفر تو غالباً شاہ صاحب نے ملک صاحب کی نذر کر دیا تھا' اس لیے میرے حصے میں صرف سامان سفر آیا اور اس سلسلے میں انہوں نے کسی بخل سے کام نہ لیا تھا' بلکہ اپنے ڈرائیور کا سامان بھی مجھے ہی سونپ دیا... تفصیل اس اجمال کی یوں ہے۔ جیپ کی اگلی سیٹ پر ایک تو ڈرائیور تھا جسے بہر طور گاڑی چلانا تھا۔ ایک شاہ صاحب خود تھے جنہیں گاڑی میں پٹرول ڈلوانا تھا اور تیسرے ملک صاحب تھے جن کی بزرگی مجھے فارسی کا یہ مشہور مقولہ ''برادر خورد مباش'' یاد کرانے پر تلی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر میں بیٹھا تھا' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ میری معیت میں بہت کچھ تھا۔ شاہ صاحب کا پاندان' خاصدان' اگالدان اور اس قبیل کے دیگر نہ جانے کتنے اسباب میرے پہلو میں براجمان تھے۔ شاہ صاحب کا بستر' ان کے ڈرائیور کا بستر اور دو تین ٹرنک میرے دونوں طرف سنتریوں کی طرح تنے کھڑے تھے۔ پشت پر ملک صاحب نے اپنا سامان غالباً اس نقطہ نگاہ سے رکھ چھوڑا تھا مبادا میں گھبرا کر

چلتی جیپ سے چھلانگ نہ لگادوں۔ اس پر میرا اپنا سامان مستزاد۔

گاڑی شاہ صاحب کی طرف عمر کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں انشاء اللہ خاں کا وہ شعر:

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی

پڑھنا پڑتا ہے۔ جب تک گاڑی کھڑی رہی' میرے اور اشیائے متذکرہ کے درمیان ایک قسم کا شریفانہ سمجھوتہ رہا۔ یعنی دونوں عدم تشدد کی پالیسی پر گامزن رہے' لیکن جونہی گاڑی نے پھٹ پھٹا کر ریت پر پھسلنا شروع کیا تو معاہدہ کی دھجیاں بکھرنا شروع ہو گئیں۔ جیسا کہ اکثر جنگ میں ہوتا ہے پہلے انفرادی طور پر بہادری کے جوہر دکھائے جاتے ہیں اور پھر گھمسان کا رن پڑتا ہے' یہاں بھی ابتدا کچھ اسی طرح ہوئی۔ سب سے پہلے مرادآبادی پاندان نے میرے پاؤں پر اچھل کر میری غیرت کو للکارا۔ میں نے اس نازیبا حرکت کو اس کی ظرافت طبع پر محمول کیا اور کوئی راست اقدام نہ کیا' اب جو ایک جھٹکا اور لگا تو خاصدان اچھل کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا' ہر چند کہ یہ حرکت خاصی اوچھی تھی اور میری قمیص میں گلکاری کے کئی منطقے ابھر آئے تھے' لیکن میں نے اس کو بھی عقیدت کے پھول سمجھ کر قبول کر لیا۔ باقی حضرات نے جو دیکھا کہ آدمی شریف ہے' یا الفاظ دیگر گاؤدی ہے' تو وہ بھی اپنے تیر سنبھالے میدان کارزار میں اتر آئے۔ اب جو گھمسان کا رن پڑا تو پانی پت بازیچہ اطفال نظر آنے لگا۔ کہیں کوئی صندوق میری بغل میں انگلیاں چبھائے دن کو تارے دکھا رہا ہے تو کہیں کوئی بستر سر پر مگدر برسا رہا ہے۔ میں کہاں تک مدافعت کرتا؟ اگر ایک طرف سے صندوقوں کو تھامتا تو دوسری طرف سے بستر بند یلغار شروع کر دیتے' اور جو بستروں کے آگے ہاتھ جوڑتا تو صندوق برسر پیکار ہو جاتے۔ میرے صرف ہاتھ آزاد تھے کیونکہ پاؤں میں شاہ صاحب کی چھوٹی امت نے بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ گلیوز کو بونوں نے غالباً اتنا بے بس نہ کیا ہوگا جتنا زچ مجھے یہ بے جان مخلوق کر رہی تھی۔ میں بھی ہمت ہارنے والا نہ تھا' برابر مدافعت کر رہا تھا' لیکن میری ہمت اس وقت جواب دے گئی جب پیچھے سے ملک صاحب کے سامان نے میری گردن کے کس بل نکالنے شروع کر دیئے۔ میں نے بڑی بے بسی سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بے اختیار میری زبان سے نکلا:

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

فریاد غالباً کچھ اونچے سروں میں نکلی تھی۔ شاہ صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا' کہنے لگے: شعر پڑھنے کا یہ کون سا موقع ہے؟ اتنے میں ملک صاحب بھی اپنی گردن پھیر چکے تھے۔ ہنس کر کہنے لگے۔ ''آپ نہیں سمجھ پائیں گے۔ یہ اپنے خوابوں کے جزیرے گوادر جا رہا ہے' اس لیے ابھی سے من میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔'' اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بھی بادل نخواستہ اس میں

شرکت کرنا پڑی۔ بعض قہقہے کتنے اضطراری ہوتے ہیں' بعض ہنسیاں کتنی کھوکھلی ہوتی ہیں' اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی علم افلاطون کی ضرورت نہیں ہوتی' تجربات اور حوادث کے جہنم زار سے گزرنا پڑتا ہے۔

سفر کسی طور کٹنا تھا' کٹ گیا۔ کہتے ہیں ہر کالے بادل کے حاشیے چاندی کے تاروں سے مزین ہوتے ہیں۔ تکلیف کی جو کالی گھٹا برسنا تھی برس چکی تھی' اب تو کسی قوس قزح کے نکھرنے کا انتظار تھا۔ شاہ صاحب کی ہم عمر گاڑی نے' جو پہلے ہی پتھریلے راستوں پر چل چل کر ہلکان ہو رہی تھی' جب ریت پر گھسٹنا شروع کر دیا تو ملک صاحب نے مجھے گوادر پہنچنے کی مبارکباد دی۔ کہنے لگے "باہر دیکھو' کیا سماں ہے! ہم گوادر کے مضافات میں پہنچ چکے ہیں۔" میں باہر کیسے دیکھتا' ہر طرف سامان کے حصار کھڑے تھے جن میں گھرے ہوئے باہر دیکھنا تو درکنار' سانس لینا بھی دشوار تھا۔ میں نے کہا "آپ کے سامان سے نظر نہیں ہٹتی' نظارے ہم کیا دیکھیں۔" شاہ صاحب نے اپنی ملائم اور لچکدار گردن ایک دفعہ پھر حسب ضرورت میری طرف پھیری اور کہنے لگے۔ "عزیز من! تمہارا شعری ذوق قابل رشک ہے۔ آج اس کٹھن سفر کو خوشگوار بنانے میں تمہارے برجستہ اشعار کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ مجھے علم نہ تھا کہ ضابطہ و تعزیر کی سنگلاخ چٹانوں کے پیچھے دریائے سخن بہہ رہا ہے۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اپنے ماتھے کی شکنوں کو شہادت کی انگلی سے کریدتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "کیا یہ شعر تمہاری اپنی تخلیق ہے۔" غالباً مصرع اتنا برجستہ نہیں تھا جتنا برجستہ جواب ملک صاحب نے داغ دیا۔ کہنے لگے۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ شعر تو درکنار یہ ساری زندگی ایک سطر نثر بھی صحیح اردو میں نہیں لکھ سکا۔ یہ شعر جو اس نے ابھی پڑھا ہے' غالباً کسی ہندوستانی فلم کے بول ہیں۔ اکثر صبح کو اپنی بھدی آواز میں انہیں گنگنا کے میری نیند خراب کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرانے لگے۔ مضمون ہر دو اصحاب نے ایک ہی باندھا تھا' صرف ادائیگی کا فرق تھا۔ جو بات شاہ صاحب نے اپنی نستعلیق زبان میں اشارے کنائے میں کہی تھی' اس کی ادائیگی کا پھاوڑا ملک صاحب نے مجھے براہ راست کھینچ مارا تھا۔

آخر گاڑی ناظم صاحب کے مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ اب مزید صبر کا یارا نہ تھا۔ جذبہ بے اختیار شوق نے ہر سانس کو دم شمشیر بنا ڈالا تھا۔ لہٰذا جیپ کے سینے سے باہر نکلنے کے لیے ایک ہی جست کافی تھی۔ میں سامان کے کوہستان کو پھلانگتا' مراد آبادی ظروف کو فٹ بال بناتا اور ملک صاحب کے کندھوں سے پھسلتا' باہر لڑھک گیا۔ آنکھیں پٹپٹا کے میں نے اپنے چار سو دیکھا' کیا ہم واقعی گوادر پہنچ گئے ہیں؟ کیا یہی تھا میرے سپنوں کا جزیرہ؟ کیا یہی تھی وہ چاند کی سرزمین؟ کیا یہی دریدہ لباس والے اس کے مکین ہیں؟ کہاں گئے وہ ناریل کے جھنڈ جن کی کچی سوندھی خوشبو سونگھنے کے لیے میرے نتھنے پھڑک رہے تھے؟ کدھر گئے وہ غزالان چمن

جنہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے ہزاروں دل دھڑک رہے تھے؟ یہ کیا فریب ہستی ہے؟ کہاں گئیں میری نیندیں' کدھر گئے میرے خواب؟ یہ ٹھوکر میں نے پہلی دفعہ نہیں کھائی تھی۔ جذبات کو یہ دھچکا بھی آخری بار نہیں لگا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی! تمام فضا میں مچھلی کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی جس سے جی متلانے لگا اور دماغ کی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ حبس سے ہر وقت جسم سے پسینہ پھوٹتا رہتا اور جب نم آلود ہوا چلتی تو لباس چپچپا ہو کر جسم سے چپک جاتا۔ پسنی کی طرح یہاں بھی ریت کے حصار کھڑے تھے۔ میلوں تک ہریالی کا نام ونشان نہ تھا۔ سمندر سے اٹھتی ہوئی دھند مجھے اپنے ذہن پر برستی ہوئی محسوس ہوئی تو میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے مکان میں داخل ہو گیا۔

جب انسان حسین تصورات کے طلسم کدے سے نکل کر حقائق کی دنیا کی طرف لوٹتا ہے تو کئی ناگوار حقیقتیں سر اٹھاتی ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس گرد سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا جو دوران سفر تہہ در تہہ ہمارے جسم پر چڑھ آئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ نہانے سے کچھ تو طبیعت سنبھل جائے گی' میں نے اردلی سے کہا کہ نہانے کے لیے پانی لے آئے۔ اردلی کہنے لگا "صاحب! نہانے کے لیے پانی نہیں ہے۔ میں گیلا تولیہ لے آتا ہوں' آپ جسم پر پھیر لیں' گرد اتر جائے گی۔" "کیا مطلب؟ میں نے جھنجھلا کر اردلی کو گھورا۔ دراصل اب طبیعت کسی مذاق کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ "مطلب بالکل واضح ہے۔" اردلی کی وضاحت سے پہلے ہی شاہ صاحب بول پڑے۔ "یہ پسماندہ علاقہ اس قسم کی عیاشی کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ یہاں لوگ پانی پینے کو ترستے ہیں' آپ نہانے کی سوچ رہے ہیں۔ سارے علاقے کے لیے یہاں سے چار کوس دور ایک تالاب ہے جو اکثر بارشوں کی کمی سے خشک رہتا ہے۔" "تو لوگ کنویں کیوں نہیں کھودتے؟ ملک صاحب کہنے لگے۔" "کنویں تو یہاں چند ہیں" شاہ صاحب بولے "لیکن ان کا پانی اس قدر نمکین ہے کہ انسان چھوڑ جانور تک نہیں پی سکتے اور اگر کوئی بھولے سے نہا لے تو پھر اس کے جڑے ہوئے بالوں کو کوئی آہن گر ہی کھول سکتا ہے۔" شاہ صاحب کی اس وضاحت کے بعد نہانے کے خیال کو ہم نے بحیرہ عرب میں پھینک دیا اور اپنی قناعت کو صرف ایک گلاس پانی تک محدود رکھا۔ لیکن کیا خبر تھی کہ یہ جرعہ آب بھی ایک نئے باب کی تمہید بنے گا۔ ہم جس تیزی سے گلاس ہونٹوں تک لے گئے تھے' اسی سرعت سے اسے واپس میز تک لے آئے... میں نے کہا "خانساماں سہواً نیم گرم نمکین پانی غرارے کرنے کے لیے لے آیا ہے۔" ملک صاحب کہنے لگے "تمہارے ہوش جواب دے گئے ہیں۔ جس سیال کو تم نیم گرم نمکین سمجھ رہے ہو وہ دراصل سکنجبین ہے جس میں خانساماں شکر ڈالنا بھول گیا ہے۔"

شاہ صاحب نے' جو بڑی انہماک سے ہماری گفتگو سن رہے تھے' ایک دفعہ پھر امپائری کے فرائض اپنے آپ کو سونپ دیئے اور ہم

دونوں کو کلین بولڈ کرتے ہوئے بولے۔

"عزیزان نیک نام! یہ گرم سیال جو ابھی آپ لوگوں نے نوک زبان پر رکھا ہے نہ تو غرارے کرنے کا پانی ہے اور نہ اس میں کچھ لیموں کارستانی ہے۔ یہ آب حیات ہے، کیونکہ زندگی کے سوتے اسی کے دم سے پھوٹتے ہیں۔ رگوں میں خون اسی کی برکت سے گردش کرتا ہے اور دل کی دھڑکن اسی سے جاری رہتی ہے۔" زور خطابت سے شاہ صاحب کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی تھی۔ فرط جذبات سے کوئی ایک آدھ آنسو بھی ان کی بائیں آنکھ کے کونے سے جھانک رہا تھا۔ جی تو ہمارا بھی چاہتا تھا کہ شاہ صاحب کی اس پر درد تقریر سے براہ راست متاثر ہوں، لیکن ان پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اگر کوئی آنسو تھا بھی تو وہ کبھی کا ہم پی چکے تھے، اس لیے خالی "ہاں" "ہوں" سے داد فصاحت دیتے رہے۔

بایں ہمہ گوادر کی جغرافیائی اہمیت مسلمہ ہے اور اس کے متعلق پہلا تاثر کسی صورت میں بھی آخری تاثر نہیں رہتا۔ گرم پانیوں تک پہنچنے کا جو خواب زاران روس نے دیکھا تھا، اس کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کے لیے ان کے جانشین آج افغانستان میں موجود ہیں۔ ان کی حریص نگاہیں بحیرہ عرب میں جذب ہوتے ہوئے خشکی کے اس ٹکڑے پر لگی ہوئی ہیں۔ گوادر جس کا پرانا نام برنا تھا کراچی کے شمال مغرب میں ۲۸۷ میل کے فاصلہ پر ہے۔ گوادر بہت پرانا شہر ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک گنبد دریافت ہوا جس پر ۱۴۶۸ کی تاریخ درج ہے۔ لیکن سولھویں صدی میں پرتگالیوں کی آمد پر یہ شہر پردہ تاریخ پر ابھرتا ہے۔ پرتگالی اسے گراول کہتے تھے۔

مینول فاریا سوزا اپنی کتاب History of Portugese doings in the East میں لکھتا ہے کہ تیرھویں صدی میں یہ شہر بلیدیوں کے قبضے میں آ گیا۔ بلیدی زیادہ دیر تک اسے اپنے قبضے میں نہ رکھ سکے اور نادر شاہ کے جرنیل تاکی خاں کی وفات کے بعد ۱۷۳۹ء میں یہ گچکیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ میر نصیر خاں اول کے آئے دن کے حملوں سے بچنے کے لیے گچکیوں نے اس کے مالیات کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔ ایک حصہ گچکیوں کو ملتا اور دوسرا قلات کے خزانے میں جاتا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری ربع میں اس پر سلطان مسقط قابض ہو گیا۔ سید سعید ۱۷۸۳ء میں مسقط کی گدی پر بیٹھا تو اس کی حاکمانہ نگاہ سب سے پہلے اپنے حقیقی بھائی سید سلطان کی طرف اٹھی۔ سید سلطان جان بچا کر گوادر بھاگ آیا اور میر نصیر خاں سے مدد طلب کی۔ میر نصیر خاں نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلات کے حصے کی مالیہ کی رقم اس کو دے دی۔ چودہ سال جلاوطن رہنے کے بعد قسمت نے یاوری کی اور ۱۷۹۷ء میں سلطنت مسقط اس کے قبضے میں آ گئی۔ ۱۸۰۴ء میں اس کی وفات کے بعد ایک بلیدی سردار میر دوستین نے اس پر قبضہ کر لیا، لیکن فوراً

ہی مسقط سے ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے میر دوستین کو شکست دے کر سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

عام تاثر یہ ہے کہ خوانین قلات نے گوادر کے ملکیتی حقوق مستقلاً مسقط کو منتقل کر دیے تھے۔ خوانین قلات اور اہل مکران نے اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس بات کا ثبوت میر مظہر کولوائی کی اس ڈائری سے ملتا ہے جو اس نے مرتے وقت اپنے بیٹے کے لیے چھوڑی۔ وہ لکھتا ہے۔ "اگر کوئی شخص تم سے یہ دریافت کرے کہ گوادر کیچ کا ایک حصہ تھا تو یہ مسقط کے بوسعید کے پاس کیسے چلا گیا تو اسے بتلاؤ کہ سید سلطان جو کہ سلاطین مسقط کا جد امجد تھا اپنے رشتے داروں سے لڑ کر زک (کولواہ کا ایک گاؤں) چلا آیا اور پھر داد کریم میرواری کی معیت میں وہ خاران گیا اور میر جہانگیر نوشیروانی سے مدد طلب کی۔ میر جہانگیر کی سفارش پر میر نصیر خاں نے اسے پناہ دی اور امداد کے طور پر گوادر کے مالیے سے حاصل شدہ رقم اس کو بخش دی اور اس طرح گوادر اس کو عاریتہً دے"

دیا۔ اس ضمن میں میر نصیر خاں نے جو فرمان جاری کیا وہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "رابہ آریت امانتی دادا" اور ساتھ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جونہی وہ مسقط کھوئی ہوئی گدی دوبارہ حاصل کر لے تو گوادر سے دستبردار ہو جائے۔ لیکن اس نے آج تک وعدہ ایفا نہیں کیا۔ اس امر کی تصدیق میر عبدالکریم میرواری نے بھی کی ہے جو تاریخ، تحقیق اور شاعری کا رسیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ میر نصیر خاں نے بگی شہ عمر کو ہدایت کی کہ وہ سید سلطان کا خاص خیال رکھے۔

بگیوں کا اصرار ہے کہ ہر چند یہ علاقہ سید سلطان کو دے دیا گیا تھا، لیکن اس کے مالیے کی رقم انہیں ملتی تھی۔ اس وقت مالیے کی کل رقم سات ہزار ڈالر بنتی تھی جس میں سے تین ہزار ڈالر انہیں ملتے تھے۔ اتنی ہی رقم ریاست قلات کے کھاتے میں جمع ہو جاتی تھی لیکن رہتی سلاطین مسقط کے پاس ہی تھی اور ایک ہزار ڈالر کی رقم انتظامی امور پر خرچ ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ بی بی مریم کے وقت تک جاری رہا۔ مریم ایک بلیدی عورت تھی جس نے بگی خاندان کے ایک مرد سے شادی کر لی۔ کرنل راس نے ۱۸۶۸ء میں لکھا کہ یہ رقم اس کو سلطان مسقط بطور خیرات دیتا تھا۔ راس کی تحقیق حقیقت سے بعید نظر آتی ہے۔ سلطان مسقط کو کیا پڑی تھی کہ اتنے دور دراز علاقے میں اس قدر زر کثیر ایک بیوہ پر خرچ کرتا۔ مقامی مورخ حاجی عبدالنبی نے ۱۸۳۹ء میں لکھا کہ گوادر اور چاہ بہار کی بندرگاہیں بگیوں اور بروہیوں کی ملکیت تھیں۔ میر نصیر خاں نے بروہیوں کا حصہ مروتاً سید سلطان کو دے رکھا تھا کیونکہ وہ غریب الوطن ہو کر گوادر میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا۔

میر نصیر خاں کے جانشیں نااہل تھے۔ وہ گوادر کو تو کیا سنبھالتے ریاست قلات کے ایک بڑے حصے سے بھی محروم ہو گئے۔ میر نصیر

خاں دوم (۱۸۵۷ء۔۱۸۴۰ء) نے اس علاقے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے شہ غازی ولی محمد کی نگرانی میں ایک لشکر بھیجا سلطان مسقط نے مقابلہ کرنے کی بجائے حکمت عملی سے کام لیا اور تحفے کے طور پر پندرہ حبشی غلام' پانچ لونڈیاں اور ایک مرصع تلوار خان کے لیے بھجوائی۔ خان خداداد کے وقت میں اس کے نائب فقیر محمد نے ۱۸۶۱ء میں گوادر کا محاصرہ کر لیا اور پھر تاوان لے کر ہی ٹلا۔ میر خداداد خاں نے اس کے بعد ایک اور مہم بھی روانہ کی' لیکن نوشیروانیوں کی گڑبڑ کی وجہ سے اسے فوج کو واپس بلانا پڑا۔ ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۷۹ء تک یہاں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

سکندر اعظم کی فوج کا بھی اس مقام سے کسی نہ کسی صورت میں رابطہ رہا ہوگا' کیونکہ یہاں سے پندرہ میل دور گز کے علاقے میں خوبصورت یونانی خدوخال کی عورتیں آج بھی نظر آتی ہیں۔ شہر کے جنوب مشرقی جانب اس لائٹ ہاؤس کے آثار ہیں جو کبھی جہازوں کو سمت متعین کرنے میں مدد دیتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں گرم پانی کا ایک چشمہ بھی ہے جو جلدی بیماریوں کے لیے مشہور ہے۔ شہر کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ جس تجارت پر کسی زمانے میں ہندوؤں کا کنٹرول تھا' اب اسماعیلیوں کے قبضے میں ہے۔ کراچی کے ایک ممتاز صنعتکار عیسیٰ جعفر نے یہاں مچھلی اور جھینگوں کو منجمد کر کے ڈبوں میں بند کرنے کا ایک کارخانہ لگایا ہوا ہے۔ اس کارخانے کو چلانے کے لیے تازہ پانی موٹر لانچوں کے ذریعے کراچی سے آتا ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر' ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور کسٹم کے عملے کا کوڈ مقرر ہے۔... انہیں تین سے لے کر ایک ٹین تک یومیہ پانی سپلائی کیا جاتا ہے۔ اسماعیلیوں نے اپنا بہت بڑا جماعت خانہ بنا رکھا ہے جہاں پر وہ نہ صرف عبادت کرتے ہیں بلکہ اجتماعی نوعیت کے معاشرتی اور تجارتی امور بھی نبٹاتے ہیں۔

ناظم ہاؤس دیدنی ہے۔ ساحل پر کھڑی ہوئی اس عمارت کی بالائی منزل کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہیں۔ شام کے وقت برآمدے میں بیٹھ کر بحیرہ عرب کا نظارہ کرنا کیف و سرور کی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جسے الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ جب منہ موجی سمندر اپنی سرکش کف آلود موجیں ساحل کی طرف پھینکتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کسی دخانی جہاز میں بیٹھا ہوا ہچکولے کھا رہا ہو۔ جب لہریں ایک دل آویز موسیقیت کے ساتھ مکان کی دیواروں سے آ ٹکراتی ہیں تو ہر طرف جلترنگ سے بج اٹھتے ہیں۔ کوئی مضطرب روح کو لوریاں دینے لگتا ہے۔ ایک عجیب سا نقشہ حواس پر چھا جاتا ہے۔

سچائی کی تلاش میں کوئی اندھیری گپھاؤں میں بیٹھ کر برسہا برس تپسیا کرتا رہا۔ کوئی برگد کی شاخ کے نیچے بیٹھا بیٹھا خود شاخ برگد بن گیا تو کسی نے انا الحق میں حق کو تلاش کیا۔ یہ تگ و دو کبھی ظاہر تک محدود رہی تو کبھی باطن پر مرکوز۔ کتاب کے چکر سے نکلی تو جام و مینا سے جا ٹکرائی۔ فلسفہ' منطق' حکمت اس کی تلاش میں سر پٹختے رہے' لیکن قدرت کے ان لطیف اشاروں کی طرف کوئی نگاہ نہ اٹھی۔ وہ سطح

آب پر مچلتی، پھسلتی، چھلکتی موجیں، وہ زلف محبوب کی طرح ڈولتے ہوئے بادل، وہ قطار اندر قطار اٹکھیلیاں کرتے ہوئے سمندری پرندے، وہ مستی کی شراب پئے ہوئے سیج موج تک ابھرتی ہوئی رنگا رنگ مچھلیاں، وہ ڈوبتے سورج کا نیلے پانیوں کے آئینے پر ترمزی، نارنجی، عنابی اور زعفرانی رنگ بکھیرنا، وہ رنگوں کے حسین امتزاج سے شفق کے گلاب کھلنا۔ ان لافانی لمحوں میں آدمی اپنی ساری تھکن، کوفت اور پریشانیاں بھول جاتا ہے، روح کی ساری کثافت دھل جاتی ہے۔

صبح سویرے مچھیرے اپنے جال لے کر مچھلیاں پکڑنے کھلے سمندر میں نکل جاتے ہیں۔ نامہربان موسم، نامساعد حالات، بے رحم طوفان، کوئی رکاوٹ بھی تلاش معاش میں مزاحم نہیں ہوتی۔

گوادر کو "اسمگلروں کی جنت" بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں سے نہ صرف پاکستانی باشندے غیر قانونی طور پر موٹر لانچوں کے ذریعے باہر بھیجے جاتے ہیں، بلکہ بدیسی مال بھی خاصی تعداد میں سمگل ہوتا ہے۔ ریڈیو، گھڑیاں، کپڑا، سگریٹ، شراب اور دیگر اشیاء کراچی کی مارکیٹ میں انہی راستوں سے ہو کر پہنچتی ہیں۔ یہاں بندرگاہ پر ہفتے میں دو مرتبہ جہاز لنگر انداز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ موٹر لانچوں کے ذریعے بھی بدیسی سامان آتا ہے۔ اس کار خیر میں سمگلروں کے علاوہ سرکاری ملازم بھی حسب توفیق اور حسب حیثیت حصہ لیتے ہیں۔ ایک دفعہ کراچی کی کسٹم انٹیلی جنس نے عین اس وقت چھاپہ مارا جب یار لوگ سامان کو کشتیوں کے ذریعے جہاز سے اتار کر بندرگاہ پر لا رہے تھے۔ گھبراہٹ میں انہوں نے سارا سامان سمندر میں پھینک دیا۔ جب مدہوش موجیں ساحل سے ٹکرائیں تو لوگوں کو ہر طرف وہسکی کے کریٹ تیرتے ہوئے نظر آئے۔ بوسٹن کی چائے پارٹی کے بعد غالباً یہ دوسری ڈرنک پارٹی تھی جو مچھلیوں کے اعزاز میں دی گئی۔

ہر چند کہ گوادر ایئر پورٹ اپنی خواہر خوردپسنی کی طرح ناپختہ نہیں تھی اور اس میں پکے رن وے کی پیوندکاری کی گئی تھی اور سمندری دست برد سے بھی خاصی حد تک محفوظ تھی، لیکن یہاں بھی ایک نئی افتاد پڑی۔ سمندر جو بلاواسطہ ایئر پورٹ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا تھا، بالواسطہ متاثر کر رہا تھا۔ صبح کے وقت دھند کی دبیز چادر سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور جہاز کی آمد تک برقرار رہتی۔ طیارہ فضا میں دو چار چکر لگا کر واپس لوٹ جاتا۔ یہ تماشہ بعض اوقات تو کئی روز تک ہوتا رہتا جہاز ہفتے میں دو بار آتا تھا۔ ہمیں گوادر آئے ایک ہفتہ ہو چلا تھا لیکن کراچی پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ جس بے صبری کا ہم نے شروع میں مظاہرہ کیا تھا، اس میں اب ایک ٹھہراؤ پیدا ہو چلا تھا۔ خوگر رنج، ہو جانے سے ہر مشکل آسان ہو گئی تھی۔ بس ایک ہوس گل کا کھٹکا دل سے نکل جانے کی دیر تھی، اس کے بعد آرام ہی آرام تھا، لیکن۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

فلک کج رفتار کو ہماری یہ ادا بھی نہ بھائی اور ایک دن تلملا کر سورج نے آنکھ دکھائی تو روشنی کی تیز شعاعوں نے دھند کو دھنک کر رکھ دیا۔

جب جہاز رن وے سے اٹھا تو ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم کشش ثقل سے آزاد ہو گئے ہوں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم نے مکران چھوڑ دیا ہے۔ مسرت کی لہریں تمام وجود کو سرشار کئے دیتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے صدیوں کا سنگ گراں کسی طلسماتی ہاتھ نے ہمارے وجود سے اتار پھینکا ہے۔ میں نے ملک صاحب کی طرف دیکھا جو غالباً شیشوں سے نیچے جھانک رہے تھے۔ شاید گوادر کو الوداع کہہ رہے تھے۔ جہاز سمندر کے کنارے پرواز کر رہا تھا۔ اگر اپنے بائیں طرف دیکھتے تو وہی چٹیل میدان اور اگر تھوڑی سی گردن پھیر کر دائیں جانب دیکھتے تو حد نگاہ تک ٹھاٹھیں مارتا سمندر.... البتہ جہاز کا اندرونی ماحول کوئی خاص سازگار نہیں تھا۔ یعنی

وہ الگ باندھ کے رکھا تھا جو مال اچھا تھا

وہ چیز مفقود تھی جو راکھ کے ڈھیر کو اکسیر بناتی ہے جس کی وزدیدہ نگاہی ہر پیمان وفا کی گھات میں رہتی ہے۔ ہوائی کمپنی نے اس میدان میں بھی اپنے بخل کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا اور حتی المقدور ہر اس چیز سے اجتناب برتا تھا جو خوشگوار سفر کے زمرے میں آتی ہے۔ جس شے کے بغیر تصویر کائنات کا رنگ نہیں نکھرتا' اس کی عدم موجودگی میں جہاز کے محدود ماحول کا سنگین ہونا قدرتی امر تھا۔ پی آئی اے کی لغت میں ''کوسٹل فلائٹس'' کے لیے ایئر ہوسٹس کا لفظ غالباً شمر ممنوعہ کے باب میں آتا تھا' اس لیے ایک ایسے صاحب کو مہمان نوازی کے فرائض سونپے گئے تھے جن کے چہرے سے بیزاری صاف جھلکتی تھی۔ موصوف کچھ اس قسم کا تاثر دے رہے تھے جیسے مسافروں کا بوجھ جہاز کی بجائے خود انہوں نے اپنے ناتواں کندھوں پر سہار رکھا ہو۔ سٹیوارڈ بیچارہ ایک لحاظ سے حق بجانب بھی تھا' چند مچھیروں اور حقیر سرکاری ملازموں کے لیے سحر خیزی بھلا کہاں کی شرافت ہے؟

جب جہاز کراچی اترا تو سورج خاصا چڑھ چکا تھا۔ سوچا تھا چند دن عروس البلاد میں گزاریں گے۔ ایک عرصہ سے تفریح کا مفہوم ہی ذہن سے نکل چکا تھا' لیکن یہ حسرت بھی حالات کے بوجھ سے جانبر نہ ہو سکی۔ پہلے ہی کئی دن پسنی اور گوادر کی نذر ہو گئے تھے' مزید وقت ضائع کرنا قرین مصلحت نہ تھا' لہٰذا ہم جو ایئرپورٹ سے نکلے تو سیدھے ریلوے سٹیشن جا پہنچے... گاڑی جیسے ہماری ہی منتظر تھی جوں ہی ہم نے ٹکٹ لے کر ڈبے میں قدم رکھا' گارڈ نے سیٹی بجا دی۔ اس دفعہ ماحول کچھ بدلا ہوا تھا یعنی جنگل کے قانون کی عملداری نہیں تھی۔ چونکہ کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا اس لیے ہر مسافر اپنی سیٹ پر سکڑا بیٹھا تھا۔ تمام مسافروں نے کچھ ایسی چپ سادھ رکھی تھی جیسے

کسی کی تعزیت پر جمع ہوں۔ کمرے میں داخل ہو کر جب ملک صاحب نے اپنی وزنی آواز میں "السلام علیکم" کہا تو تمام مسافروں نے ہڑبڑا کر احتجاجاً خشمگیں نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ ان کے سرزنش کرتے ہوئے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ ملک صاحب کی یہ حرکت آداب محفل کے خلاف تھی۔ گو کل چار مسافر ڈبے میں بیٹھے تھے' لیکن ہماری آمد سے فضا زیادہ ہی بوجھل ہو گئی تھی۔ ایک صاحب جن کی جسامت دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ ہوا کا کوئی جھونکا آئے گا اور یہ پتنگ کی طرح اڑ کر ڈبے سے فضا میں ڈول جائیں گے' کچھ ایسی بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے جیسے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں نہیں' کسی تنور میں بیٹھے ہوں' ایک اور مسافر جو شکل وصورت سے کوئی سمگلر لگتا تھا' گردن جھکائے شہادت کی انگلی سے ماتھے پر بار بار دائرے بنا رہا تھا۔ باقی دو اصحاب نے اپنے آپ کو ڈبے کی فضا سے مکمل طور پر لاتعلق کر لیا تھا اور مسلسل بے مقصد کھڑکی سے باہر گھورے جا رہے تھے۔ ہم نے اپنا سامان سیٹوں کے نیچے درست کیا اور بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تو ہم بھی اس خاموشی کے سمندر میں ڈوبے رہے لیکن تابکے... ملک صاحب کہنے لگے۔ "جانتے ہو شہر خموشاں کسے کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو ازسرِ نو قاعدہ تختی اور قلم دوات لے آتا ہوں" "اس کی ضرورت نہیں" ملک صاحب بولے" اکتساب علم کے لیے عمر کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ ویسے بعض لوگ پڑھ لکھ کر بھی جاہل رہتے ہیں۔ ویسے تو بعض لوگ انسانیت کے دائرے سے بھی خارج کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔

آخری فقرے کی چبھن غالباً کچھ زیادہ تند تھی۔ چاروں اصحاب نے جلتی ہوئی نظروں سے ہمیں گھورا' لیکن ہم بظاہر ان سے غافل تھے۔ گاڑی حیدر آباد کے قریب پہنچ چکی تھی۔ لیکن ڈبے کا اکتا دینے والا سکوت ہنوز قائم تھا۔ اتنے میں ڈائننگ کار کا بیرا آ گیا اور ہر مسافر سے فرداً فرداً کھانے کا پوچھنے لگا۔ ملک صاحب کہنے لگے۔ "چلو ڈائننگ کار میں چلتے ہیں' یہاں کھانے کا خاک مزہ آئے گا!" چونکہ ایک عرصہ سے خاک پھانکتے آ رہے تھے اس لیے ملک صاحب کا لذت طعام کا داعی ہونا ایک خوش آئند بات تھی۔ ہم اٹھ کر ڈائننگ کار میں جا بیٹھے۔

گردش روزگار کیا کیا انقلاب لائی ہے' سعی پیہم نے کیا کیا گل کھلائے ہیں! جہد مسلسل سے انسان نے ویرانوں کو گلزار بنا ڈالا ہے' کوشش ناتمام نے ہر شے میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی ہے' روح انقلاب سے ذرے آفتاب ہو گئے ہیں' زمانہ بدل گیا' انسان بدل گئے' ملکیں بدل گئے' مکان بدل گئے' ہر چیز نے نیا روپ دھار لیا ہے' بایں ہمہ اگر کوئی چیز نہیں بدلی تو وہ ریلوے کے مسافروں کا کھانا ہے۔ اتنی قدامت' اتنی پختگی' اتنی ثابت قدمی تو اولیاء میں بھی نہیں ہوتی۔ ڈیل ڈول' رنگ روپ' ذائقہ' کوئی بھی تو ایسی شے نہیں ہے جس نے وقت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔ جب ویٹر آپ کے سامنے مینو رکھتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مغلیہ دور ایک

دفعہ پھر پلٹ آیا ہو اور آپ کی دعوت کا اہتمام محمد شاہ رنگیلا نے بہ نفس نفیس کرایا ہو... سفید براق وردیاں پہنے ہوئے دست بستہ مودب بیرے' قرینے سے لگے ہوئے برتن' سلیقے سے سجے ہوئے گلدستے' طریقے سے رکھے ہوئے چھری کانٹے' نفاست سے تہہ کیے ہوئے گلاسوں میں نیپکین اور ان پر مستزاد انگریزی اور دیسی کھانوں کو طویل فہرست۔ اپی ٹائیزر سوپ' کٹلس' جہانگیری پلاؤ' نور جہانی قورمہ' سلاد رشین اور امریکن سلادوں کا حسین امتزاج' سویٹ ڈش اور اس کے بعد یا سمین چائے یا پھر نازنین کافی' حسب ضرورت اور حسب حیثیت... لیکن کھانا چونکہ سرگشتہ خمار رسوم وقیود ہوتا ہے اس لیے سوپ کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی نے سالم پیاز جبڑوں میں دبا کر چلو بھر گرم پانی منہ میں ڈال کے چٹکی بھر نمک پھانک لیا ہو۔ اس کو اونین سوپ بولتے ہیں۔ جس پلیٹ میں چھلے ہوئے پیاز قطار اندر قطار رکھے ہوں اور اس پر ٹماٹر کی ایک ہلکی سی قاش سر انگشت حنائی کا تصور یاد دلاتی ہوئی اسے یہاں سلاد سمجھا جاتا ہے۔ اگر ابلے ہوئے آلو کو ہتھیلی پر مسل کر چوڑائی کی نسبت لمبائی دگنی کر دی جائے تو وہ یہاں کٹلس بن جاتا ہے.... جس طرح جہانگیر کو نور جہاں سے والہانہ عشق تھا اور وہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوتے تھے' اسی طرح جہانگیر کی نشانی یعنی پلاؤ اور نور جہاں کی کہانی قورمہ بھی لازم وملزوم ہیں۔ پلاؤ کو حلق سے اتارنے کے لیے کم از کم قورمے کا آدھا گلاس درکار ہوتا ہے۔ پھر اس پلاؤ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر آپ کھاتے کھاتے اکتا جائیں تو باقی ماندہ سے آپ ایک آدھ پگڑی کو کلف بھی لگا سکتے ہیں۔ قورمہ بذات خود ایک بحر ذخار ہوتا ہے جس میں ڈوبنے پر بھی بیڑا پار نہیں ہوتا۔ خلیج فارس میں ڈبکی لگا کر صدف سے موتی نکالنا آسان ہے' لیکن قورمے کے تالاب میں بوٹی تلاش کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ جس طرح ہر سیپ میں موتی نہیں ہوتا' اسی طرح جو چیز آپ کو قورمے میں نظر آجائے' ضروری نہیں کہ بوٹی ہو۔ یہ ہڈی ہو سکتی ہے' چھچھڑے ہو سکتے ہیں یا پھر ان دونوں اشیاء سے ملتی جلتی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اس ترغیب نما مدح سرائی سے اگر آپ کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوا ہو کہ ہم کسی اشتہاری کمپنی کے ایجنٹ ہیں یا خدانخواستہ ہم نے ریلوے والوں سے اس تعریف کا معاوضہ وصول کیا ہے تو اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیں' البتہ ایک آدھ مفت کھانے کی قسم ہم بھی نہیں کھا سکتے۔ جہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہو اور اک جہان اس میں ہاتھ رنگ رہا ہو' وہاں ایک آدھ کھانا تو کسی شمار میں نہیں آتا۔ چونکہ ہم کھانا کھا کر وہیں کرسیوں پر ڈھیر ہو گئے تھے' اس لیے خاصی دیر تک تماشائے اہل کرم دیکھتے رہے۔ پولیس والے آرہے ہیں تو مفت دعوت شیراز کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ کسٹم کا عملہ آتا ہے تو ڈائننگ کار کا تمام عملہ دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکر صاحب تشریف لاتے ہیں تو انہیں کھانے کی باقاعدہ سلامی دی جاتی ہے۔ آخر جب انجن ڈرائیور اور اس کے نائبین کے لیے بھی مفت کھانا گیا تو ملک صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ آسمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگے۔ "یا الٰہی!

یہ ماجرا کیا ہے؟" میں نے کہا "آپ کا آسمان کی طرف منہ کرنا برحق ہے لیکن جواب کے لیے آپ کو بہر حال اہل زمین سے رجوع کرنا پڑے گا۔" غالباً ہمارے کلمات ڈائننگ کار کے منیجر تک پہنچ گئے تھے' کیونکہ وہ قریبی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ آدمی سخن فہم تھا اٹھ کر ہماری میز پر آ گیا۔ جلد ہی ہم سے گھل مل گیا' اب چونکہ مسافروں کا زور ٹوٹ چکا تھا اس لیے ایسی باتیں کر سکتے تھے جو نا گفتنی ہوتی ہیں اور ان رازہائے سربستہ سے پردہ سرکا سکتے تھے جن کا سینے کے قبرستان میں دفن رہنا ہی بہتر ہوتا ہے.... ملک صاحب مسکرانے کر کہنے لگے۔ "منیجر صاحب! اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟" منیجر بھی کچھ کم زندہ دل نہیں تھا' کہنے لگا "جان تو آج کل مسافر ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں' اس لیے آپ اس فکر سے آزاد ہو جائیں اور بغیر کسی جھجک کے ارشاد فرمائیں" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد خود ہی بولا "ویسے میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ غالباً آپ اس ڈرامے کے متعلق جاننا چاہیں گے جو ڈائننگ کار میں ہوتا رہا ہے" پیشتر اس کے کہ متحیر ملک صاحب اسے خدا رسیدہ بزرگ کی سند عنایت فرماتے' میں نے کہا "آپ نے درست سمجھا ہے" کہنے لگے۔ عزیزو! یہ روزمرہ کا معمول ہے اور اس میں کوئی رمز نہاں ہے نہ کوئی بوالعجبی۔ آپ لوگ پتہ نہیں زندگی کے کس شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہیں تو کم از کم پولیس کے متعلق تو اپنی حیرت کا اظہار نہ کرتے۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر تو رکھا جا سکتا ہے لیکن اس خطہ زمین پر پولیس سے بگاڑ ممکن نہیں' منیجر کی تقریر جاری تھی کہ اتنے میں ایک بھاری مونچھوں والا حوالدار ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے ہم پر اچٹتی ہوئی مشکوک نگاہ ڈالی۔ منیجر کی آواز کی سرگم نے اس کے حلق کی سرنگ میں چند گرداب کھائے اور ڈوب گئی۔ اس نے اٹھ کر حوالدار کو سلام کیا۔ جواب میں حوالدار صاحب نے بھی غالباً مسکراہٹ کا کوئی شوشہ چھوڑا تھا' لیکن وہ مسکراہٹ مونچھوں کی دبیز تہوں کو پار نہ کر سکی اور زیر سطح ہی پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ جب حوالدار صاحب چلے گئے تو منیجر اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولا۔ "پولیس کے متعلق تو کچھ آپ کو آئیڈیا ہو ہی گیا ہوگا' باقی رہا کسٹم کا عملہ تو۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

کوئٹہ سے جب سپاری کراچی جائے گی تو اس کی حفاظت کسٹم کے عملے سے بہتر کون کرے گا۔ جہاں تک ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکروں کا تعلق ہے' تو یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ اگر ہم کھانے کا بل لینے سے گریز کرتے ہیں تو وہ بھی ان سواریوں سے چشم پوشی کرتے ہیں جو ہم رات کو ڈائننگ کار میں نصف کرائے پر بٹھا لیتے ہیں۔

"سبحان اللہ!" ملک صاحب اس عارفانہ کلام سے پھڑک اٹھے۔ "کیا بقائے باہمی کا زریں اصول اپنایا ہے۔"

میں نے کہا' بقائے باہمی سے زیادہ امداد باہمی کا اصول معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال آپ ہماری آخری الجھن بھی دور کر دیں کہ انجن

ڈرائیور اور اس کے دیگر عملے کو کس کھاتے میں مفت کھانا کھلایا جاتا ہے۔" منیجر کہنے لگا "ان کا تو ہمیں خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ڈرائیور لوگ کھانے کے معاملے میں خاصے حساس واقع ہوتے ہیں۔ ایک دن کھانا لیٹ پہنچا تھا تو کمبخت نے سٹیشن پر گاڑی کھڑی کرتے وقت اس زور سے بریک لگائی کہ تمام برتن چکنا چور ہو گئے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ملک صاحب سکوت توڑتے ہوئے بولے۔ "کانچ کے برتن بہت نازک ہوتے ہیں' انہیں سنبھال کر رکھنا چاہیے"... "احتیاط تو بہت کی جاتی ہے' لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں"... منیجر روح معانی سے سرشار ہو کر گنگنایا۔ چونکہ بات لطیف پیرائے کے گلزار سے نکل کر دقیق فلسفیانہ گھاوٴں کی طرف بڑھ رہی تھی' اس لیے میری مداخلت ناگزیر ہو گئی۔ میں نے کہا "منیجر صاحب! آپ نے جو ابھی ابھی اسرار نہانی کھولے ہیں' کیا آپ کو علم ہے کہ ان کا اجنبیوں پر انکشاف خاصا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے"... "خطرے کا احساس صرف اس وقت تک رہتا ہے جب تک آدمی کنارے پر کھڑا رہے۔" منیجر کہنے لگا "جو لوگ دریا میں اتر جاتے ہیں' وہ اندیشہ ہائے سود و زیاں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور بپھری ہوئی موجوں کے ساتھ ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں"... منیجر ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس کی نگاہیں ہمارے چہروں پر مرکوز ہو گئیں۔ کہنے لگا۔ "آپ کی اتنی عمر نہیں جتنا میرا تجربہ ہے۔ انسان شناسی میں یہ نگاہیں شاید ہی کبھی دھوکا کھا سکیں۔ خطرناک آدمی تو ہم ایک میل سے سونگھ لیتے ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ ہر جرم ثابت کرنے کے لیے موثر شہادت درکار ہوتی ہے جو اکثر دستیاب نہیں ہوتی۔"

خاصی دیر تک ہم خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ منیجر اس دوران از راہ مہمان نوازی کافی سے ہماری خاطر تواضع کرتا رہا چونکہ مہمان نوازی کی بھی اپنی حدیں ہوتی ہیں اور اصولاً ان حدود کے اندر رہ کر ہی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے' اس لیے ملک صاحب کافی کے آخری گھونٹوں کو شربت کے سے انداز میں پیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ منیجر ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا اور بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کر کے اس نے ہمیں رخصت کیا... جب ہم واپس ڈبے میں پہنچے تو ایک مسافر جا چکا تھا اور دوسرا جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ہم نے اپنے بستر کھول کر بچھائے اور بالائی نشستوں پر دراز ہو گئے۔ میں آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک دم کھٹکا ہوا۔ میں نے جو آنکھیں کھول کر دیکھا تو ملک صاحب چھلانگ لگا کر نیچے پہنچ چکے تھے۔ ملگجی اندھیرا اچھی روشنی میں ڈھل گیا تو میں نے دیکھا ملک صاحب کی انگلیاں "کال بیل" پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ریلوے کا اٹنڈنٹ دوڑتا ہوا آیا... "کوئی خدمت؟" اس نے اپنا سکہ بند فقرہ دہرایا... "خدمت نہیں' ایک درخواست ہے" ملک صاحب اپنی روایتی شگفتگی سے بولے۔ "فرمایئے!" اٹنڈنٹ بولا... "کیا ڈبے کا ٹمپریچر کنٹرول کرنے کا انتظام نہیں ہے؟ سردی سے خون خشک ہوا جاتا ہے"... "صاحب ٹمپریچر تو میں نے

کنٹرول کیا ہوا ہے" متحیر خدمت گار کہنے لگا "اس وقت درجہ حرارت بیاسی ڈگری سے کم نہ ہوگا"... پتنگ کی سی جسامت رکھنے والے مسافر نے اپنی چپ کا روزہ توڑتے ہوئے احتجاج کیا... ملک صاحب غالباً اسی لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ چہرے پر مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے بولے "کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ جو شخص ایک سو بیس ڈگری درجہ حرارت والے علاقے میں رہنے کا عادی ہو اور تازہ تازہ تربت سے آیا ہو وہ اس ماحول میں زندہ رہ سکتا ہے؟"... حیرت سے "چپ شاہ" کا منہ کھل گیا اور اس نے بڑی معذرت طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ خدمت گار نے ندامت سے اپنا سر جھکا لیا۔ ملک صاحب نے فخر سے گردن کو ذرا بلند کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کچھ ایسا تاثر دیا جیسے ماؤنٹ ایورسٹ انہوں نے تن تنہا فتح کر ڈالا ہو۔

جب ہم مچھ پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ ہماری آمد کی اطلاع بھی ہو چکی تھی اس لیے جب ہم نے سٹیشن ماسٹر سے رابطہ قائم کیا تو اس نے ریلوے کا اکلوتا ریسٹ ہاؤس ہماری نذر کر دیا۔ جیسا کہ ہر اکلوتی اولاد کا حال ہوتا ہے' ریسٹ ہاؤس نے بھی کچھ ایسی ہی روش اختیار کر رکھی تھی' والدین کا بے جا لاڈ پیار جو بگاڑ پیدا کرتا ہے' اس کے اثرات یہاں بھی مرتب ہو رہے تھے۔ ضد' ہٹ دھرمی کا اندازہ تو اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہنوز اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی ہم عصر عمارتیں خدا جانے کب کی پیوند خاک ہو چکی تھی اور ان کے کھنڈرات بھی اب اس قابل نہ تھے کہ عمارت کی عظمت کی نشاندہی کر سکتے۔ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا پلستر اور ہر طرف عنکبوت کے جالے اس کے لاابالی پن کے صاف آئینہ دار تھے۔ بہر حال' ہمارے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔ سر چھپانے کے لیے ایک کمرہ اور پیٹ بھرنے کے لیے دو وقت کا کھانا انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں' اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ضرورتیں یہاں پوری ہو سکتی تھیں... ویسے ریسٹ ہاؤس کا بیرونی ماحول کچھ ایسا ناخوشگوار بھی نہیں تھا۔ یہ ریلوے سٹیشن کے عقب میں ایک پہاڑی پر تن تنہا کھڑا تھا۔ اردگرد شہتوت کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ چند قدم پر ڈھلان تھی جس سے تین سو فٹ نیچے پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ ہم نے کمرے میں سامان رکھا۔ ضرورت کا تقریباً سارا فرنیچر کمرے میں موجود تھا۔ ہر چند کہ یہ فرنیچر کسی زمانے میں آنجہانی جارج سٹیفن کے ذاتی تصرف میں رہا ہو گا' لیکن ہمارے لیے یہ تاریخی نوادرات بھی کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ ریلوے قلی نے' جو ہمارا سامان لایا تھا' بستر کھول کر بچھا دیئے تو ہم کمرے کو بند کر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ملنے جیل کی طرف چل پڑے۔

مچھ جیل پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور پہلے ہی دن جیل کی سیر کرا ڈالی۔ سرہندی صاحب سندھ کے رہنے والے دبلے پتلے جسم اور باریک گردن کے شریف انسان تھے' لیکن تمام جیل ان کے ڈر سے کانپتی۔ جب انسپکشن پر جاتے تو ان کا نحیف سا جسم زاویہ قائمہ بناتا ہوا نظر آتا۔ گردن اس طرح تن جاتی جیسے کسی نے تازہ کلف لگائی ہو۔ حلق سے سیٹیاں سی بجنے لگتیں اور

سانس ایسی زور سے چلتی جیسے کسی مال گاڑی کا انجن پہاڑیوں میں شنٹنگ کر رہا ہو۔ سپاہی ادب سے سیدھے کھڑے ہو جاتے اور قیدیوں کو اتنی جرات نہ ہوتی کہ سر اوپر اٹھا کر قہر خداوندی کو ایک نظر دیکھ لیں۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں مچھ جیل میں سارے ملک کے اکھڑ اور سرکش قیدی لائے جاتے ہیں جن کے چند دنوں میں تمام کس بل نکل جاتے ہیں۔ بحیثیت انسان سرہندی صاحب بہت اچھے اور نیک آدمی تھے۔ ٹریننگ سے انہوں نے ہمیں پہلے ہی دن مبرا کر دیا۔ کہنے لگے "سائیں اگر اچھا سرٹیفکیٹ لینا ہے تو میری ایک بات مانو" ہم نے کہا۔ "ارشاد" کہنے لگے "میں اس تنہائی سے عاجز آ گیا ہوں میرے ساتھ تمام دن تاش کھیلا کرو۔ جیل ٹریننگ تو خیر ہوتی ہی رہتی تھی' تین ماہ کے قلیل عرصے میں ہم نے ہر قسم کے کھیل میں خوب مہارت حاصل کر لی۔

یہاں بھی ہم علی الصبح اٹھتے۔ کوئی نصف گھنٹے تک پہاڑی سے نیچے اتر کر ندی کے کنارے سیر کرتے۔ ملک صاحب چونکہ سیر کے زیادہ رسیا تھے' اس لیے اس شوق کی تکمیل میں اکثر مجھ سے آگے نکل جاتے۔ کہتے' تمہیں سیر کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ کیا کول ندی کی طرح لطف خرام لیتے ہو۔ صحت کا راز برسک واک میں ہے۔ برسک واک۔ سمجھے؟ اب اگر صحت کا راز تنفس کے بے ہنگم اتار چڑھاؤ میں نہاں ہے یا جسم کو عرق ریز کرنے میں مضمر' تو میں اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ میری نظر میں زندگی ترجیحات سے عبارت ہے۔ مسلک الگ الگ' روشیں جدا جدا' خواہش اپنی اپنی۔ حسن فطرت کو چند دن کو مستعار زندگی پر کیسے قربان کر دیا جاتا' چنانچہ میں تھوڑا سا چل کر کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا.... ہر چند مشاہدہ حق کی گفتگو خواص کا کام ہے' لیکن مشاہدات حسن کے لیے خاص و عام کی کوئی قید نہیں۔ یہ وہ خزانہ ہے جسے انسان جتنا چاہے حسب ظرف لوٹ سکتا ہے... گنگناتی ندی کا شفاف پانی' لہلہاتے کھیت' چہچہاتے طیور' سرسراتے ہوئے ناشپاتیوں کے سبز پیڑ' ہلکورے لیتی ہوئی باد نسیم اور رقص کرتے ہوئے لالہ و گل۔

ہماری واپسی تک چوکیدار ناشتہ لے آتا۔ ناشتے کا صحیح لطف کسی صحت افزا مقام ہی پر آتا ہے۔ چٹ کھایا' پٹ ہضم' صبح کی خنکی میں گرم چائے جسم کو عجیب فرحت بخشتی ہے۔ پھر اگر ایک آدھ سگریٹ کا کش لگا لیا جائے تو تصورات آدمی کو کوچہ جاناں تک بھی لے جا سکتے ہیں۔

جیل' ریسٹ ہاؤس سے ایک میل کے فاصلے پر تھی اور یہ فاصلہ ہم پیدل ہی طے کرتے۔ مچھ شہر میں کسی باقاعدہ سواری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ناہموار راستے' جگہ جگہ ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا' ڈھلانیں اور کھائیاں ہر جگہ رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ ہماری آمد سے قبل ہی سرہندی صاحب ہماری ٹریننگ کا پروگرام وضع کر رکھتے۔ کچھ دیر تو ہم جیل مینوئل کی ورق گردانی کرتے' پھر ان کے ساتھ جیل کا ایک راؤنڈ لیتے اور اس کے بعد اصل ٹریننگ شروع ہوتی یعنی سرہندی صاحب کے ساتھ تاش کی بازیاں۔

سرہندی صاحب کا بنگلہ جیل کے بائیں جانب ایک پہاڑی پر الگ تھلگ بنایا گیا تھا۔ عمارت اگرچہ نئی نہ تھی لیکن مشقتیوں کی ایک فوج ہر وقت اس کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف رہتی۔ لان میں ڈھاکہ گراس نفاست سے کاٹی گئی تھی۔ خوبصورت پھولوں کی کیاریاں ہر آنے والے کا دامن نگاہ تھامتیں۔ انگور کی بیلیں مستی کے عالم میں ہر وقت جھومتی رہتیں۔ دوپہر کا کھانا ہم موصوف کے ساتھ ہی کھاتے اتنے بڑے جہازی بنگلے میں وہ تنہا رہتے کیونکہ ان کے بچے اندرون سندھ مختلف سکولوں میں پڑھتے تھے اور بیگم بھی زمینوں کی نگرانی کے لیے وہیں ٹک گئی تھیں۔ بنگلے سے ملحق کوارٹر میں ان کا نوکر اور اس کی نئی نویلی بیوی رہتے۔ نوکر کا اصل نام جانے کیا تھا' لیکن سرہندی صاحب اس کو اپنے مخصوص لہجہ میں ''چھتاں'' کہہ کر پکارتے۔ یہ لہجہ راگوں کی زبان میں جوگ کے زیادہ قریب تھا۔ کھانا بڑا لذیذ ہوتا کیونکہ چھتاں کی بیوی اسے اپنے ان ہاتھوں سے پکاتی جن پر ابھی تک مہندی کے نشان پوری طرح مٹنے بھی نہ پائے تھے۔ دونوں میاں بیوی کی عمروں میں نمایاں تفاوت تھا۔ چھتاں کو دیکھ کر ایسے گمان ہوتا جیسے صحرائے سندھ کی تمام تر ویرانی سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی ہو۔ اس کے برعکس اس کی بیوی ''گلابی'' اپنے اندر ہزار صحراؤں کی گرمی سمیٹے ہوئے تھی۔ جب وہ ڈولتی لچکتی ہوئی کمرے میں آ کر کھانا پروستی تو ایک لمحے کے لیے ایسے محسوس ہوتا جیسے سورج سوا نیزے پر آن کھڑا ہوا اور یہی وہ موقع ہوتا جب ملک صاحب' سرہندی صاحب کو چھیڑتے۔ ''اب پتہ چلا ہے کہ آپ بچوں کو کیوں اپنے پاس نہیں رکھتے۔'' سرہندی صاحب مسکرا کر احتجاج کرتے۔ ''سائیں! اچھا گال کریندس'' (سائیں کیا بات کرتے ہو)۔ دراصل ایک طرح سے موصوف کا احتجاج درست تھا۔ آنجناب جذبات کا وہ بحر منجمد بن چکے تھے جس سے ٹکرا کر سورج کی کرنیں تو کیا خود سورج بھی ندامت محسوس کرتا۔ گلابی کا انگ انگ بولتا ہوا نظر آتا۔ سراپا ساز' مجسم احتجاج۔ اگر دیواروں کے کان ہوتے ہیں تو اعضا کو زبان بھی مل سکتی ہے۔ اس کی جوانی اس شوریدہ سر ندی کی مانند تھی جس کے آگے بہت بڑا گلیشیر آ گیا ہو اور جو راہ فرار نہ پا کر کف اڑاتی ہوئی پتھروں سے سر ٹکرا رہی ہو... گلابی کے اندر جو جوانی کا الاؤ دہک رہا تھا اس کی تپش سے اس کے رخسار ہر وقت تمتماتے رہتے... آنکھوں کے شفق رنگ ڈورے کھنچے کھنچے سے نظر آتے... اور جسم کا رواں رواں پارے کی طرح تھر تھراتا رہتا... ایک دن جو وہ چائے رکھ کر ہٹی تو ملک صاحب کہنے لگے ''اس قسم کی بے جوڑ شادیوں کا انجام کیا ہوتا ہوگا؟''

''کیا مطلب؟'' سرہندی صاحب نے وضاحت چاہی... ''مطلب بالکل واضح ہے۔'' ملک کہنے لگے ''اگر آپ کسی پرانے ریڑھے کے آگے اچھی نسل کی گھوڑی باندھ دیں تو چند روز ہی میں ریڑھے کی چولیں ڈھیلی پڑ جائیں گی اور پہیے اکھڑنا شروع ہو جائیں گے۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے بھی میاں بیوی میں کچھ موزونیت ہونی چاہیے نہیں تو کسی نہ کسی حادثے کا امکان ہر وقت

موجود رہتا ہے اور اسی وجہ سے معاشرتی المیے جنم لیتے ہیں... معاشرتی المیوں کو معاشی المیوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔'' سرہندی صاحب کہنے لگے ''غریب والدین کو لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے سے پہلے کئی جانسوز مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' پھر اگر جوان مرد کی جیب میں چار پیسے ہوں تو اس کی نگاہیں بھی چاروں طرف گھومتی رہتی ہیں۔'' پھر خود ہی کہنے لگے ''ویسے چھتاں میں کیا کمی ہے؟'' کیا ہوا جو اس کی عمر گلابی سے بہت بڑی ہے۔ اس کی آمدنی ایک شہری بابو کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اچھی خاصی تنخواہ لیتا ہے پھر ہر ملاقاتی اس کو کچھ نہ کچھ بخشش دے جاتا ہے۔ سال بھر کی گندم اور چاول میرے ذمے ہیں اور دو وقت کا کھانا مفت... گلابی' اس کے والدین' سب کی کفالت یہ کرتا ہے... ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے۔ غمی خوشی میں ہاتھ بٹاتا ہے... پھر سب سے بڑی بات یہ ہے'' سرہندی صاحب سر کھجاتے ہوئے بولے'' کہ یہ مقدر کے کھیل ہیں۔ سب رشتے ناتے اوپر طے پاتے ہیں۔ انسانی کاوش تو محض ایک بہانہ بن جاتی ہے'' ہر چند کہ ملک صاحب نے ایک تلخ حقیقت کی نشاندہی کی تھی لیکن سرہندی صاحب کا استدلال اور منطق بظاہر بڑے جاندار تھے۔ وڈیروں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا یہ مخصوص ہتھیار ہے۔ دین اور دولت کو ملا کر جو سفوف تیار کیا جاتا ہے' اس کی ایک چٹکی ہی سے دل اور دماغ کے ہر گوشے پر دھندی چھا جاتی ہے۔

ایک دن علی الصبح ہی اودے اودے بادلوں نے آسمان پر چھتری سی تان دی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ملک صاحب کسی کام سے کوئٹہ گئے ہوئے تھے' اس لیے اس موسم میں بستر سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پہلے تو سوچا کہ ٹریننگ کا پروگرام گول کر دیا جائے' آخر ایک دن نہ جانے سے کیا فرق پڑ جائے گا لیکن جب بے مقصد' چھت کی کڑیاں گنتے گنتے بیزار ہو گیا اور کروٹیں بدلتے بدلتے چارپائی چرمرانے لگی تو اس تنہائی کی نسبت بارش میں بھیگ جانا کہیں بہتر محسوس ہوا۔ جب میں کمرے سے باہر نکلا تو دن کے بارہ بج چکے تھے لیکن ایسے پتہ چلتا تھا کہ شام ہوا چاہتی ہے۔ اودھے بادلوں کا رنگ اب گہرا سرمئی ہو گیا تھا اور گھٹا آسمان سے اتر کر وادی کو گھیرتے ہوئے پہاڑوں سے بغلگیر ہو رہی تھی' تیز ہوا چل رہی تھی۔ بجائے جیل جانے کے میرے قدم خود بخود سرہندی صاحب کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ وہ ابھی تک خلاف توقع واپس نہیں ہوئے تھے' مجھے چھتاں نے بتایا کہ چند قیدیوں میں جھگڑا ہو گیا ہے' اس لیے صاحب دیر سے آئیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کھانا کھا کر آرام کریں۔ کھانا بہت مزیدار تھا۔ موسم کی مناسبت سے گلابی نے آج ہر چیز میں جان ڈال دی تھی۔ سالم کریلوں میں بھرا ہوا قیمہ تھا۔ دیسی گھی میں بھنے ہوئے تیتر تھے۔ خالص مکھن میں تلے ہوئے پراٹھے تھے۔ حیدر آبادی سرکے میں رچا ہوا آم کا اچار تھا۔ شہد اور بالائی کی آمیزش سے تیار کئے ہوئے شاہی ٹکڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ کھانا جب اتنا مزیدار ہو اور موسم اس قدر معصیت آفرین تو بھوک کچھ زیادہ ہی چمک اٹھتی ہے۔ ویسے بھی سرہندی صاحب

کا انتظار کرنا عبث تھا۔ کھانے کے معاملے میں وہ خاصے محتاط تھے۔ یہ کہنا تو شاید مبالغہ آرائی ہو کہ ان کی خوراک ایک تیتر کے برابر تھی' لیکن جس طرح ایک ابلے ہوئے آلو کو وہ پلیٹ میں ڈال کر اور ہاتھ میں چھری کانٹا پکڑ کر جدوجہد کرتے تھے'اس سے تو یہی تاثر ابھرتا تھا کہ موصوف تزکیہ نفس کی آخری منزل پہ ہیں... چونکہ خاندانی مہمان نواز تھے'اس لیے ان کا دسترخوان انواع واقسام کے کھانوں سے سجا رہتا۔ میں کھانا کھا کر ستانے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔ غالباً ایک گھنٹے تک سویا رہا۔ میں شاید کچھ دیر اور سوتا کہ آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ تندوتیز ہوا کے جھونکے نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے اور انگور کی چند بیلیں کھڑکی کے اندر تاک جھانک کرنے لگیں۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تو میں چادر لپیٹ کر باہر نکل آیا۔ تیز ہوا میں انگور کی مہک تھی' اجالا تاریکی کے گرداب میں دم توڑ رہا تھا' آوارہ بادلوں کے قافلے وادی کی گود میں خیمہ زن ہو رہے تھے۔ نیچے قصبے کے مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں بادلوں میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ چرواہے خراب موسم کے پیش نظر اپنی بھیڑ بکریوں کو ہانک کر اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا' صرف تیز ہوا جب پہاڑوں سے ٹکرا کر پلٹتی تو فضا میں سیٹیاں سی بجنے لگتیں۔

بے مقصد چلتے چلتے جب میں قریبی چوٹی پر پہنچا تو میرے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ سامنے وادی کی طرف جھولتی ہوئی چوٹی پر پاؤں لٹکائے گلابی بیٹھی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور سیاہ زلفیں' ایسے خم کھا رہی تھیں جیسے کالی گھٹا سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہو۔ اس پھیلتی ہوئی تاریکی میں اس کا چہرہ اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے مایوسی کے اندھیروں میں بعض اوقات امید کا چاند جھلملا اٹھتا ہے۔ وہ سخت ٹھنڈ کے باوجود بغیر کوئی چادر لیے بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ میں گلاب کے چند پھول پکڑ رکھے تھے جو غالباً بنگلے میں سے توڑ کر لائی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ کلیاں توڑتی اور پھر انہیں نیچے گہری وادی میں پھینک دیتی' لیکن وادی میں گرنے سے پہلے ہی ہوا کے جھونکے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیتے۔ وہ میری آمد سے بے خبر معلوم ہوتی تھی۔ قدموں کی چاپ بھی جب اس کے انہماک کو نہ توڑ سکی تو میں آہستہ سے کھنکارا۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرا دی۔ کتنی ویران تھی وہ مسکراہٹ! وہ اداسی جو اس کی آنکھوں سے جھلکتی رہتی اب ہونٹوں تک آن پہنچی تھی۔ ''کیا کر رہی ہو یہاں؟'' ''تمہیں کیا نظر آتا ہے؟'' اسے غالباً میرا سرزنش کرتا ہوا لہجہ اچھا نہ لگا تھا۔ ''مجھے تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس طرح بیٹھے بیٹھے تمہیں نمونیا ہو جائے گا یا پھر بے خودی کے عالم میں ذرا سا ڈولو گی تو ہزاروں فٹ نیچے کھائی تک پہنچتے پہنچتے شناخت کی منزل سے بھی گزر جاؤ گی'' ''تو پھر کیا ہوگا؟'' اب کے وہ مسکرائی نہ تھی صرف اس کے ہونٹوں کی کلیاں تھوڑی سی سکڑی تھیں... ''تو پھر کیا ہوگا؟'' یہی سوال میں نے اپنے آپ سے کر ڈالا۔ کیا وادی میں اترتی ہوئی

گھٹائیں پگھل جائیں گی؟ کیا سرپٹ دوڑتا ہوا راہوار ہوا لڑکھڑا کر گر پڑے گا؟ کیا ہر صبح انگڑائی لے کر چٹکتی ہوئی کلیاں شبنمی غسل ترک کر دیں گی؟ تنے ہوئے صنوبر و شمشاد کی کمر غم سے خم کھا جائے گی؟ یوکلپٹس کی شاخ پر بیٹھی ہوئی بلبل کے نغمے دم توڑ دیں گے؟ تو پھر کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں ہوگا' نادان لڑکی! کدھر گئے وہ یونانی اصنام جن کے لیے ہفت اقلیم کے سپاہی خاک و خون کی سلگتی ہوئی بھٹی میں کود گئے تھے۔ کہاں گئے وہ غزالان عرب جن کے لیے ردائے عقل کی دھجیاں صحرائے نجد میں اڑتی پھریں۔ تو تو ایک غریب دہقان کی بیٹی ہے جس کی ہر صبح شام کی فکر میں گھل جاتی ہے اور پھر کسی شام کی بھی صبح نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لمحے کے لیے ... صرف ایک لمحے کے لیے... درد کی کوئی لہر کسی چہرے پر ابھرے۔ تمہارے خاوند کی بوڑھی ہڈیاں تمہارے حنائی تصور سے چیخ اٹھیں اور ویران آنکھوں سے نکلا ہوا کوئی گدلا آنسو وقت کے سمندر میں جذب ہو جائے.... اور بس۔ اس لیے اٹھو اور سیدھے قدموں سے گھر لوٹ جاؤ... اس نے غالباً میرے چہرے کے تاثرات جان لیے تھے اس لیے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''چلو گھر چلتے ہیں۔'' وہ آخری پھول کو وادی میں پھینکتے ہوئی بولی۔

جب ہم بنگلے میں پہنچے تو شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ باورچی خانے کی بتی جل رہی تھی۔ چھتاں غالباً کھانا پکا رہا تھا۔ سرہندی صاحب ہنوز جیل میں تھے۔ میں نے ان کا مزید انتظار کرنا بیکار سمجھا اور با دل نخواستہ ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا۔

جیل کی دنیا

آپ جانتے ہیں جیل کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ جہان رنگ و بو سے یکسر مختلف یہ وہ دنیا ہے جس کا کوئی رنگ ہوتا ہے نہ کوئی روپ۔ اس میں نہ سیب کے پھولوں کی چاندنی چٹکتی ہے نہ خوبانیوں کے پیڑ کا کندن دمکتا ہے۔ اس کی کوئی شام زلف محبوب کی خوشبو اپنے ساتھ نہیں لاتی۔ کسی صبح کا آغاز کنج لب سے نہیں ہوتا.... اس دنیا میں امیدوں کی کوئی بارش نہیں ہوتی۔ خوشی کی کوئی قوس قزح نہیں نکھرتی۔ جذبات کے سمندر میں کوئی مد و جزر نہیں ابھرتا۔ حسین خیالات کے طلسم کدے میں کوئی بدر منیر قدم نہیں رکھتا۔

یہ یادوں کی دنیا ہے جس میں ڈوبتی ہوئی امیدوں کے مدھم چراغ جلتے رہتے ہیں۔ یہ ان آرزوؤں کی دنیا ہے جو لب پر آنے سے پہلے ہی سینے کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہیں۔ دبی دبی آہیں' جھکی جھکی نظریں' گھٹی گھٹی دھڑکنیں' سنولائے ہوئے چہرے' کملائی ہوئی جوانیاں' بجھتی ہوئی ذہانت' ڈوبتی ہوئی صداقت' منزل کا پتہ نہ نشان منزل کی خبر... کاروان حیات تنگناؤں' مہیب گھاٹیوں سے گزرتا ہوا اور جرس کارواں کی آواز کانوں میں زہر گھولتی ہوئی۔ ہر جیل میں قریب قریب ایک جیسا ماحول ہوتا ہے' غذا لباس اور رہائش میں یکسانیت۔ کھانے کے لیے کھڑی دال' جلی سڑی روٹیاں' پہننے کے لیے جیل کی سلاخوں سے ملتا جلتا لباس اور سونے

کے لیے ازلی بساند میں رچے بسے کمرے منطقہ حارہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں سخت گرم چارپائی کے جھنجھٹ سے آزاد بستر کی فکر سے مبرا روشنی سے بے نیاز خودداری اور عزت نفس کی جیتی جاگتی تصویر۔ نہ محبوب سے شکوہ کرنے کی ضرورت نہ منت دربان۔

وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

اس ماحول کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ بہت جلد قیدی کی شخصیت میں رچ بس جاتا ہے۔ اس کی تاریکیاں اس کی روح کی پستیوں تک جا پہنچتی ہیں اور جب وہ قید کاٹ کر باہر کی دنیا میں آتا ہے تو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ غلاظت اور تعفن کے بھبکے اس کے جسم سے اڑ اڑ کر حساس نتھنوں تک پہنچتے ہیں تو شرفا کنی کترا کر گزر جاتے ہیں۔ مائیں بچوں کی انگلیاں پکڑ کر فوراً گھر کے اندر گھس جاتی ہیں اور پنگھٹ پر کنواریاں فوراً اپنے پلو نیچے گرالیتی ہیں... جرم کیا ہے؟ مجرم کون ہے؟ سزا کسے کہتے ہیں ... سوال یہ نہیں کہ انسان جرم کیوں کرتا ہے؟ کن حالات میں کرتا ہے؟ سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اسے سزا کیوں ملتی ہے کتنی ملتی ہے ... غور طلب مسئلہ وہ اثرات ہیں جو اس شخص کی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ جو اس خاندان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک مجرم قید کاٹنے کے بعد بھی مجرم رہتا ہے.... دور سے دیکھنے پر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کسی سنگ تراش نے پتھروں کو تراش خراش کر ایک چھوٹی سی چاردیواری کھڑی کر کے اسے آہنی دروازہ لگا دیا ہو۔ اندر جانے پر جیل کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسران بالا کے دفاتر ملازمان زیریں کے کوارٹر قیدیوں کے لیے آہنی ضابطوں کے چارٹر بارکیں جن میں قیدیوں کی ٹانگیں پسارنے کی فراغت نہیں ہوتی۔ کوٹھڑیاں جن میں سوچ پر بھی پہرہ ہوتا ہے۔ کال کوٹھڑیاں جن سے طائر جاں کی ڈوبتی ہوئی صدا آتی ہے۔ ہر وقت پر درد قرآن خوانی ہر لحظہ ندامت کے اشکوں کی روانی یاد ماضی زندگی میں زہر گھولتی ہوئی کشتی وجود فنا کی موجوں میں ڈولتی ہوئی... جب موت اور زیست میں ایک جست کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو درمیانی لمحات بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں کوئی حرص نہیں رہتی کوئی ہوس نہیں ہوتی کوئی شوق نہیں رہتا من و تو کے فاصلے مٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گزرتا ہوا ہر لمحہ رہزن تمکین و ہوش ہوتا ہے۔ گھڑیال کی صدا دل پر ہتھوڑے برساتی ہے اور قدموں کی آہٹ سے روح کی طنابیں کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں... انسان کی ساری زندگی میں صرف یہ لمحات اس کے اپنے ہوتے ہیں باقی کوئی لمحہ اس کا اپنا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ جیل میں کئی عمارتیں ہیں۔ ہسپتال جس میں بیمار کم اور زخمی زیادہ ہوتے ہیں۔ فیکٹریاں جن میں بنی ہوئی دریاں ابھی تک عامتہ الناس تک نہیں پہنچ سکیں۔ لنگر جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ وسیع میدان جن میں مجرموں کو مشقت کرائی جاتی ہے۔

تنگ کوٹھڑیاں جن میں خطرناک مجرموں کو رکھا جاتا ہے۔ جیل میں ہر قسم کے قیدی آتے ہیں۔ اخلاقی قیدی' جنہوں نے زندگی میں گھناؤنے جرم کئے ہوتے ہیں۔ سیاسی قیدی جن کا جیل میں آنا ان کے لیے اتنا ہی سودمند ہوتا ہے جتنا انہیں بھیجنے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ قید دراصل ایک قسم کی سرمایہ کاری ہے۔ جب سیاستدانوں کی شہرت کا آفتاب گہنانا شروع ہوتا ہے تو چند دن کی جیل ایک ایسی ضرورت ہوتی ہے جسے صرف ایک لیڈر ہی سمجھ سکتا ہے۔ آرام دہ کمرے' مناسب خوراک اور اس درمیانی وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک آدھ زنداں نامے کی تالیف۔ اگر اس عرصے میں رہا ہو گئے تو ''ہم خرما و ہم ثواب'' اور اگر خداوندان وقت نے عجلت نہ دکھائی تو ابن الوقت نے فوراً اپنی گردن خم کر دی... صلح نامہ... معافی نامہ یا پھر ذیابیطس کا موذی مرض جو ہر اصلی سیاستدان کا موروثی حق ہے۔

اس کے علاوہ بعض ایسے قیدی بھی ہوتے ہیں جو کسی وقتی اشتعال میں آ کر جرم کر بیٹھتے ہیں اور پھر ساری زندگی پچھتاتے ہیں ... قیدیوں کی ایک قسم اور بھی ہے جنہیں ''حادثاتی قیدی'' کہا جا سکتا ہے۔ جب میں مچھ میں تھا تو ان سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ لاہور کی ہیرا منڈی سے آئے تھے اور ہر وقت ناساعد حالات کا رونا روتے تھے۔ جب جنرل موسیٰ خاں مغربی پاکستان کے گورنر تھے تو انہوں نے خطرناک غنڈوں کو پکڑنے کا حکم جاری کیا۔ پولیس نے لگے ہاتھوں ہیرا منڈی سے چند دلالوں کو بھی پکڑ کر مچھ میں بھیج دیا ... کہاں پائل کی مدھر جھنکار' کہاں حوالدار پینڈے خاں کے کرخت ڈکار' کہاں گھنگھروں کی چھن چھن' کہاں مدقوق کھانسی کی ٹھن ٹھن' کہاں بازار حسن کے لذیذ سری پائے اور روغنی نان' کہاں جیل کی ان گلی دال اور ادھ جلی روٹیوں کا دان!... یہ چند ہی دنوں میں ہتھیار پھینک بیٹھے۔ ایک دن ایک دلال رو رو کر کہنے لگا ''صاحب! پولیس نے ہم پر بڑا ظلم کیا ہے' اصل غنڈوں کو تو پکڑا نہیں' ہم غریبوں کو جہنم رسید کر دیا۔ آپ ہی انصاف فرمائیں۔ ہم کیسے غنڈہ گردی کر سکتے ہیں۔ ہم تو ''بزنس مین'' ہیں۔ کون ''بزنس مین'' چاہے گا کہ اس کا کاروبار تباہ ہو جائے؟''

بیک ٹو مکران

تین ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ پھر واپس مکران جانے کا حکم صادر ہوا۔ اب زیر تربیت رہنا زیادہ عرصہ نصیب نہ ہوا۔ سیکرٹریٹ والوں نے رحم کھا کر ہماری ٹریننگ ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور ڈی سی صاحب نے مجھے پنجگور جانے کا مشورہ دیا۔

تربت اور پنجگور میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ پنجگور میں تنہائی زیادہ تھی۔ صبح کو جو ریسٹ ہاؤس کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھتا تو دن ڈھلنے تک بس سوائے سوچ کے اور کوئی کام نہ ہوتا۔ پنجگور میں چونکہ موسم غنیمت تھا اس لیے دن کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مکران ضلع بہت وسیع اور عریض ہے۔ اس کا ایک کونا ناگ سے شروع ہوتا ہے تو شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ گوادر اور جیونی سے ہوتا ہوا بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ گودار کسی زمانے میں سلطان مسقط کے تسلط میں تھا لیکن ملک فیروز خاں نون کے عہد حکومت میں حکومت پاکستان نے اس کو خرید لیا۔ اس وقت کافی ہندو تاجر یہاں آباد تھے جو بعد میں بوریا بستر سمیٹ کر چلتے بنے۔ مکران کی ریاست پہلے ریاست قلات کا ایک حصہ تھی اور خان آف قلات کی عملداری میں تھی۔ نواب بائی خاں مرحوم' خان کی فوج میں رسالدار تھے۔ قیام پاکستان کے وقت جب ریاستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جس ملک میں چاہیں ضم ہو جائیں یا خود مختار رہیں تو خان قلات کے قدم ڈگمگانے لگے... یہ بات نوزائیدہ مملکت کے لیے کوئی نیک فال نہ تھی؛ چنانچہ ایک حسین شام کو رسالدار بائی خاں مرحوم کو ایوان گورنر جنرل میں کراچی طلب کیا گیا اور جب بائی خاں قصر گورنر جنرل سے باہر نکلا تو وہ رسالدار نہ تھا' بلکہ نواب مکران تھا۔ واپس آ کر نواب بائی خاں نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ ریاست مکران کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر دیا۔ اب خان قلات کے پاس جو "سینڈوچ" ہو چکا تھا سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ حقیقت تسلیم کر لے۔

ہر چند مکران بلوچستان کا ایک حصہ ہے' لیکن رسم و رواج اور عادات کے اعتبار سے باقی بلوچستان سے خاصہ مختلف ہے۔ کھجور اور مچھلی مکرانیوں کی اصل خوراک ہے جبکہ دیگر علاقوں میں گندم کھائی جاتی ہے۔

اخلاقیات کے لحاظ سے بھی ہر دو خطوں میں نمایاں فرق ہے۔ مچھلی اور کھجور کا جو اثر مزاج طبیعت پر ہوتا ہے' وہ جو اور ستو کے استعمال سے قطعی مختلف ہے۔ چہرے کے خدوخال اور رنگ میں نمایاں فرق ہے۔ مکرانیوں کا رنگ گندمی یا سیاہی مائل ہوتا ہے جبکہ باقی قلات کے باشندگان کا رنگ نسبتاً سفید ہے۔ مکران میں بلوچی بولی جاتی ہے' لیکن قلات کے باقی حصوں میں بروہی اور سندھی مروج ہے۔

مکران ضلع کی درآمدات برآمدات میں سمگلنگ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ نہ صرف بدیسی مال گوادر کے راستے کراچی اور کوئٹہ کی مارکیٹوں میں پہنچتا ہے' بلکہ پاکستان کے باشندوں کی نمایاں تعداد ہر ماہ خفیہ راستوں سے غیر قانونی طور پر باہر جاتی ہے۔ اس کے لیے بڑی منظم جماعتیں کام کرتی ہیں جن کے بیشتر ہیڈ کوارٹر کوئٹہ میں قائم ہیں۔ ان افراد کی بیشتر تعداد پنجاب اور صوبہ سرحد سے آتی ہے۔ یہ لوگ طے شدہ پروگرام کے تحت کوئٹہ پہنچتے ہیں جہاں ایجنٹ ان سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ہر آدمی چار صد روپیہ ایجنٹ کے حوالے کرتا ہے۔ اس رقم میں ایجنٹ کا کمشن' ان کا کرایہ' راستے میں مختلف محکموں کا ٹیکس' موٹر لانچ کا کرایہ' کھانے پینے کا سامان (جو اکثر بھنے ہوئے چنے ہوتے ہیں) شامل ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی میں ان لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹرکوں میں گھسیڑا جاتا

ہے۔قریب قریب سو آدمی ایک ٹرک میں بٹھائے جاتے ہیں۔ پھر ٹرک نہایت تیزی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں مخصوص اشارے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کسٹم اور دیگر محکمے چشم پوشی کرتے ہیں۔صبح ہونے سے قبل ٹرک خفیہ جگہوں پر چھپ جاتے ہیں اور پھر رات کے وقت سفر جاری رہتا ہے۔تربت پہنچ کر ان لوگوں کو مقامی ٹرکوں میں بٹھادیا جاتا ہے جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے تیار کھڑے ہوتے ہیں۔بس کی نسبت دگنا کرایہ چارج کرتے ہیں۔یہ ٹرک گوادر کے راستے ''پیشکان'' پہنچتے ہیں جہاں موٹر لانچیں تیار کھڑی ہوتی ہیں۔یہ لانچیں تین چار سو آدمی بٹھاتی ہیں اور پھر ان کو ابوظہبی' دوبئی اور قطر کی ریاستوں کی حدود میں مختلف مقامات پر اتار دیتی ہیں۔اس کے بعد یا قسمت یا نصیب۔اگر پکڑے گئے تو جیل کی ہوا کھا کر اور ملک کے نام کو چار چاند لگا کر دھکے کھاتے ہوئے واپس ملک آن پہنچے اور اگر مقامی حکام سے ساز باز کر کے کام بن گیا تو پھر جہاں سینگ سمائے وہیں کے ہو رہے۔سفر کی صعوبتیں مسافروں کی جان ہلکان کر دیتی ہیں۔اکثر راستے میں بیمار پڑ جاتے ہیں اور بعض تو منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں' لیکن اس کے باوجود ہر ماہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ایک دفعہ چند سو پاکستانی موٹر لانچ میں بیٹھے ہوئے دوبئی جا رہے تھے کہ راستے میں موٹر لانچ والوں کو اطلاع ملی کہ کسٹم کا عملہ ان کا تعاقب کر رہا ہے' چنانچہ انہوں نے ایک ٹاپو پر سب مسافروں کو اتار دیا اور کہا ان پہاڑوں کے پیچھے دوبئی ہے۔لاعلم لوگ جب ٹاپو کی طرف بڑھے تو آگے دلدل تھی۔چنانچہ کئی آدمی اس میں پھنس گئے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔انہی دنوں کا ذکر ہے میں پنجگور میں تھا کہ ڈی سی صاحب کا وائرلیس پیغام آیا کہ فوراً تربت پہنچو۔ڈی سی صاحب کسی میٹنگ کے سلسلے میں خضدار گئے تھے اور چونکہ ہیڈ کوارٹر پر کوئی آدمی نہ تھا' اس لیے مجھے وہاں فوری طور پر پہنچنا تھا۔بس چلنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔اتفاقاً ایک انجینئر صاحب کی جیپ تربت جا رہی تھی۔میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ جب ہم ''بال گتر'' کھانے کے لیے رکے تو مجھے اطلاع ملی کہ چار ٹرک چار سو پٹھانوں کو لے کر تربت پہنچ گئے ہیں۔میں نے مزید تفصیلات معلوم کیں اور پھر ہم ان کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ہوشاب کے قریب ایک تنگنائے ہے۔جب ہم وہاں پہنچے تو یہ چاروں ٹرک واپس آ رہے تھے۔میں نے جیپ راستے میں کھڑی کر لی۔اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دس بارہ مشٹنڈے ٹرکوں سے نیچے اتر آئے اور خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے میری طرف بڑھے۔''خو' ٹرک کیوں روکی ہے؟'' ایک پٹھان دھاڑا۔ ''آدمی کہاں اتارے ہیں؟'' میں نے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا... ''کون سا آدمی؟''... پٹھانوں نے متعجب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا... ''راستہ خالی کرو''... ایک پٹھان نیفے سے پستول نکالتے ہوئے بولا... معاملہ بڑا نازک تھا۔ذرا سی لغزش سے تمام کام بگڑ سکتا تھا۔ہم کل تین آدمی تھے اور ہمارے پاس بارہ بور کی صرف ایک بندوق تھی جبکہ قریب قریب تمام پٹھان مسلح تھے۔

مقابلہ کسی صورت میں ممکن نہ تھا۔ مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا تھا... اس گرمی کے موسم میں بھی ایس ڈی او کی بتیسی بج رہی تھی ... "رک جاؤ!" میں حواس مجتمع کرتے ہوئے کڑکا۔ "میں یہاں کا ناظم ہوں اور تمہیں سارے ضلع کی پولیس نے گھیر لیا ہے۔ میں صرف بطور ہراول دستہ یہاں آیا ہوں" یہ تمام باتیں میں نے کچھ اس بے ساختگی سے کہیں کہ پٹھان تذبذب میں پڑ گئے۔ میں اسی نفسیاتی لمحے کے انتظار میں تھا۔ "دیکھو اگر تم سچ سچ بتا دو کہ آدمی کہاں اتارے ہیں تو تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے"... "قرآن شریف کی قسم ہم نے کوئی آدمی بھی نہیں اتارا"۔ ایک پٹھان تڑاخ سے قسم اٹھا گیا۔ میں نے ٹرکوں پر چڑھ کر جائزہ لیا تو ہر طرف بھنے ہوئے چنے اور روٹی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے پوچھا... اس کا جواب ان کے پاس نہ تھا اس اثناء میں پیچھے سے ایک بس آ گئی جس پر پولیس کے چند مسلح سپاہی بیٹھے تھے۔ میں نے ان کو اتار لیا۔ اس کے بعد ضروری تھا کہ عدم تشدد کی پالیسی کو خیر باد کہا جائے' چنانچہ ایک گھنٹہ کی مسلسل جھاڑ پھونک کے بعد انہوں نے بتلا دیا کہ تربت سے پانچ میل ادھر انہوں نے مسافروں کو اتارا ہے۔ میں نے تربت پہنچتے ہی تھانیدار کو طلب کیا۔ رات ہو چکی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ چار سو آدمی غیر قانونی طور پر بارڈر پار کرنا چاہتے ہیں اور اور اس وقت تربت کے گردونواح میں ہیں تو اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہوئی جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا... جناب میں ابھی ان کو ۱۳ امیگریشن ایکٹ میں گرفتار کر کے لے آتا ہوں۔ رات کافی ہو چکی تھی اور میں بھی تھک چکا تھا اس لیے سو گیا۔

صبح چوکیدار نے بتایا کہ تھانیدار صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا بھیج دو... تھانیدار صاحب نے پہلے تو مجھے ٹھک سے سلیوٹ مارا۔ اور اس کے بعد جو اس نے کہا مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا... "جناب! آپ سے کسی نے مذاق کیا ہے"... 'کیسا مذاق؟ میں نے تمام رات ان لوگوں کی تلاش کی ہے۔ دس میل کے علاقے میں ایک ایک بوٹا جھاڑ مارا ہے لیکن کوئی آدمی نہیں دیکھا" میں نے مزید استفسار مناسب نہ سمجھا...

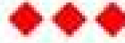
"گاڑی تیار کراؤ۔ میں خود جاؤں گا"۔ میں نے حکم دیا۔

نصف گھنٹے کی تلاش کے بعد میں نے تمام لوگوں کو ندی کے کنارے روٹیاں پکاتے ہوئے پکڑ لیا۔ تھانیدار کی حالت قابل رحم تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ایجنٹ آگے بڑھے اور اپنے "آزمودہ نسخے" آزمانے شروع کئے۔ جب ان کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور ان کی گرفتاری کا حکم دیا تو تھانیدار نے پہلی دفعہ زبان کھولی "جناب! یہ اپنے ملک کے اندر ہیں میں ان کو کس جرم میں گرفتار کروں؟"

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ان کو ۴۰ فارسٹ ایکٹ میں گرفتار کرو۔"

واپس آ کر میں نے کمشنر صاحب کو وائرلیس پر اطلاع دی اور دوسرے دن سب کو ٹرکوں پر بٹھا کر واپس بھیج دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ساری رات تھانیدار صاحب پٹھانوں کو گوادر بھیجنے کے لیے ٹرک ڈھونڈتے رہے تھے لیکن شومئ قسمت سے کوئی ٹرک دستیاب نہ ہوا۔

اس واقعے کے چند یوم بعد مجھے بطور اسسٹنٹ کمشنر مستونگ تعینات کر دیا گیا۔



قیام مستونگ

مستونگ آ کر ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ تربت میں کام نہ ہونے کا جتنا شکوہ تھا یہاں اتنی ہی کام کی زیادتی کی شکایت رہی۔ اگر وہاں کسی سے ملاقات عید کے چاند کی یاد دلاتی تھی' تو یہاں ہر گھڑی' ہر لحظہ ہر آن یہ چاند چمکتے اور گہناتے رہتے۔ ہر وقت ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔ جغرافیائی لحاظ سے ہر دو علاقوں میں بعد المشرقین تھا۔ وہاں اگر ہر وقت دھول اڑتی تھی تو یہاں ہر جگہ پھول کھلتے تھے۔ تمام فضا ان کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکی رہتی۔ جب سیب کے درخت سپید پھولوں کی بے داغ چادر اوڑھتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے جلتے ہوئے زخموں پر شبنم چھڑک دی ہو۔ جب خوبانیوں اور شفتالوؤں کے پیڑوں سے مہکی ہوئی خوشبو وادی کا طواف کرتی تو سلگتی ہوئی یادوں کے قافلے ٹھہرتے ہوئے محسوس ہوتے۔ جب شہتوت کے درختوں پر ہنستے' کھیلتے' پھدکتے بچے آپس میں انکھیلیاں کرتے نظر آتے تو بے اختیار عمر رفتہ کو آواز دینے کو جی چاہتا۔ بادام' پستہ اور اخروٹ کے درخت یہاں خودرو جھاڑیوں کی طرح اگتے ہیں۔ رہائش کے لیے وزیراعظم ہاؤس کے برعکس یہاں ایک پیارا سا خوبصورت بنگلہ تھا جس میں سیب کے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیاں کسی نوخیز حسینہ کی طرح لچکتی ڈولتی رہتیں۔ زرد آلوؤں کے پیڑوں سے امڈتی ہوئی خوشبو کسی صحت مند خیال کی طرح دماغ کو تروتازہ رکھتی ہے۔ وادی کے پس منظر میں چلتن پہاڑ کسی سنتری کی طرح ایستادہ تھا۔ یہاں کاریزوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ ٹھنڈا میٹھا اور شفاف پانی چھوٹے چھوٹے کھالوں میں بہتا ہوا تقریباً ہر گھر پر دستک دے کر گزرتا ہے۔

فطرت کے ساتھ یہ گہرے روابط پہلے ہی دن استوار نہیں ہو گئے تھے بلکہ اس میں کچھ وقت لگا۔ شروع میں نہ صرف پے در پے مسائل مجھ پر مسلط ہوتے گئے' بلکہ قدم قدم پر شکوک و شبہات کی دیواریں کھڑی ہوتی نظر آئیں میری آمد سے قبل عمائدین شہر اور مقامی سردار کمشنر صاحب کے پاس گلہ کرنے پہنچ گئے... ''کیا آپ کو کوئی تجربہ کار افسر نہیں ملا جو آپ نے ایک نوعمر' ناتجربہ کار لڑکے کو اس اہم علاقے میں تعینات کر دیا ہے؟'' احتجاج کی یہ لے اپنے اندر چلتن پہاڑ جتنا وزن رکھتی تھی۔ کمشنر صاحب نے اسے وقتی طور پر مسترد کرتے ہوئے کہا ''میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ اسے ایک موقع دیں' اگر دس پندرہ یوم تک آپ کا نظریہ نہ بدلا تو میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔'' بات بظاہر معقول تھی' اس لیے لوگ اپنے وسوسوں کے ساتھ واپس لوٹ آئے... دراصل سادہ لوح بلوچ ایک لحاظ سے اس قسم کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب تھے' جہاں صدیوں سے روایات کے جال بچھے ہوں' برسوں سے

ایک خاص نظریے کے پرچارک ان کے اذہان میں شکوک وشبہات کا زہر ٹپکاتے رہے ہوں' وہاں اس قسم کے مطالبات ناگزیر ہوتے ہیں۔

مستونگ آ کر پہلا مسئلہ تو چارج لینے میں درپیش آیا۔ میرے پیشرو جو اتفاقاً پنجابی تھے اور صرف ڈیڑھ ماہ کے عرصے ہی میں برسوں کے فاصلے طے کر گئے تھے' چارج دینے سے گریزاں نظر آئے... موصوف تبادلہ رکوانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے' اس لیے حیلوں بہانوں سے مجھے ٹالتے رہے۔ کبھی کہتے کہ چارج ایسی چیز نہیں کہ ایک دن میں دے دیا جائے۔ کبھی فرماتے کہ ابھی فائلوں پر دستخط کرنا باقی ہیں اور کبھی اصرار کرتے کہ متعلقہ کلرک چھٹی پر گیا ہوا ہے' اس لیے چارج رپورٹ تیار نہیں ہو سکتی۔ ان کی یہ لن ترانیاں کوئی نئی بات نہ تھی۔ سروسز میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے' اس لیے میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور ایک دن جب ان کی جواب طلبی ہو گئی تو بادل نخواستہ چارج دے کر رخصت ہو گئے۔ اب اہل مستونگ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اجنبیت کی برف آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہوئی۔ شکوک کے بادل رفتہ رفتہ چھٹنے لگے۔ مختلف قبائل کے لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر ملاقات کے لیے آنا شروع ہوئے۔ زودرنج شاہنوانی آئے' مرنجان مرنج بنگل زئی آئے' تیز نظر مینگل آئے' خود سر زرکزئیوں سے ملاقاتیں ہوئی... مجبور محمد شاہیوں کے مطالبات کو سنا' مقہور کردوں کی گزارشات کو سنا۔ اپنے آپ میں گم لہڑیوں کو دیکھا' ہر وقت شرارت پر آمادہ شیخوں کو جانچا' ہمچو ما دیگرے نیست سمجھنے والے رئیسانیوں کو پرکھا... خان قلات کی تکریم کے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھا اور چالاک ہندو بنئے کی اصل خواہشات کو کریدا۔ قلات ڈویژن میں ہندوؤں کی ایک اچھی خاصی تعداد آباد ہے۔ تجارت پر ان کا مکمل کنٹرول ہے اور اکثر بلوچ ان کے دست نگر رہتے ہیں۔ جب ہندوؤں کا وفد مجھے ملنے آیا تو وفد کا لیڈر چودھری موہن لال اپنی خوبیوں کو گناتے ہوئے کہنے لگا "ناظم صاحب! آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ ہم لوگ حکومت پاکستان کے ہمیشہ وفادار رہے ہیں' لڑائی بھڑائی سے اجتناب کرتے ہیں' اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور ملکی سیاست میں بالکل حصہ نہیں لیتے۔" چودھری صاحب آپ کی لڑائی بھڑائی سے باز رہنے اور اپنے کام سے کام رکھنے والی باتیں تو سمجھ میں آئی ہیں' لیکن سیاست سے بالا رہنے والا دعویٰ کچھ کھٹکتا ہے۔ کیا آپ اس ملک کو اپنا ملک نہیں سمجھتے یا اپنے آپ کو دوسرے درجے کے شہری سمجھتے ہیں؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے آپ کی بات سن کر خوشی ہو گی تو آپ اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔ قانون کے دائرے میں رہ کر آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ دیگر شہریوں کی طرح آپ پر کوئی پابندی نہیں۔" "آپ پہلے افسر ہیں جو اس قسم کی باتیں بتا رہے ہیں" چودھری موہن لال کا لہجہ کچھ اور خوشامدانہ ہو گیا۔ "ہمیں تو آج تک یہی بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔"

بلوچ نفسیات

فطرت کے جو مجملہ مقاصد ہیں' ان کی نگہبانی مرد بلوچ کرتا ہے... صاف دل و پاکباز' سخت کوش و سخت جان' خطروں کی پروانہ کرنے والا' وہی بات جان جائے پر آن نہ جائے۔ مفلس و خوددار' حماقت کی حد تک غیرت مند' جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ اگر دل میں غبار ہے تو ہاتھ میں ہتھیار ہے' یہ نہیں کہ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام۔ جو سوچتا ہے منہ پر کہہ دیتا ہے۔ حماقت کی حد تک غیرت منداس طرح کہ ایک دفعہ خضدار میں ایک ریپ کیس ہو گیا جو عام حالات میں نہیں ہوتا۔ مقامی حکام نے مستغیثہ کی شلوار کیمیائی تجزیے کے لیے لاہور بھیج دی۔ بس پھر کیا تھا' تمام علاقے میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ہماری عزت پنجاب بھیج دی۔ یہ بات انہیں کس طرح گوارا ہوتی' نتیجہ فساد کی صورت میں نکلا اور بات مستقل عناد پر جا کر ختم ہوئی۔ مفلسی کا یہ عالم کہ نہ صرف شادی بیاہ' بلکہ گھر کا خرچ چلانے کے لیے بھی حکومت سے تقاوی لیں گے۔ ادھر حکام نے رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور تھوڑی سی سختی کی تو مقروض نے ستوؤں کی پوٹلی بغل میں دبائی' پانی کی چھاگل گلے میں لٹکائی' بندوق ہاتھ میں تھامی اور گھر والوں کو الوداع کہہ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد یا قسمت یا نصیب۔ موسم کی سختیاں جھیلتا رہے گا' بھوک کے ہاتھوں پیٹ پر پتھر باندھ لے گا' کسی مفرور گروہ سے مل جائے گا' لیکن پہاڑ سے نیچے نہیں اترے گا۔ معافی نہیں مانگے گا۔ چاہے قصوروار ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے جو سردار کی سوچ ہوگی وہی قبیلے کی سوچ ہوگی' جو اس کے اطوار ہوں گے وہی قبیلے کا شعار ہوں گے... ہر چند کہ ایک بلوچ کے پاس دل حق شناس ہے لیکن اکثر چند مفاد پرستوں کی انگیخت پر بیگانہ وفا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے فرضی قصوں اور کہانیوں سے دیگر ہم وطنوں کے متعلق کچھ ایسے نقشے کھینچے ہیں جو ظلم کی تعریف میں آتے ہیں۔ ایک نہایت منظم طریقے سے ان کے دلوں میں خوف و ہراس پھیلایا جاتا ہے۔ اس میں کچھ بلوچ سرداروں کے علاوہ مقامی سرکاری ملازموں کا بھی ہاتھ ہے۔ اس کا تلخ تجربہ ایک بار مجھے بھی ہوا۔ مستونگ میں شیخوں اور سارنگ زئیوں میں ایک عرصے سے عداوت چلی آتی تھی۔ ایک دن نفرت کا یہ جوالا مکھی پھٹ پڑا اور دونوں طرف سے کافی آدمی زخمی ہو گئے۔ شہر کے کئی دوسرے لوگوں نے بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی فریق سے متعلق کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں گروہوں کے مسلح آدمی ہر وقت ایک دوسرے کی تاک میں رہنے لگے۔ صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک بلوچ ڈی سی صاحب کو لکھا کہ ہر دو متحارب فریق کسی وقت بھی ایک دوسرے سے ٹکرا سکتے ہیں اور اس طرح شہر کی پرامن فضا میں زہر گھل جائے گا۔ چونکہ ہر دو فریق سردار دودا خان زرکزئی کے زیر اثر ہیں' اس لیے اسے کہا جائے کہ وہ خود مستونگ آ کر ان میں صلح کروا دے۔ ڈی سی صاحب جو بلوچ حقوق کے بہت بڑے داعی تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس کار خیر میں ایک لمحے کا توقف بھی

نہیں کریں گے' میری امیدوں کے برعکس انہوں نے مجھے لکھ بھیجا ''میں امید کرتا ہوں کہ تمہاری موجودگی میں کچھ نہیں ہوگا۔'' اس وقت تو بات خیر آئی گئی ہوگئی' لیکن جب میرا تبادلہ واپس پنجاب ہوگیا اور غالباً روانگی سے چند یوم قبل میں اور موصوف جناح روڈ کوئٹہ پر ٹہل رہے تھے کہ آپ فرمانے لگے ''یار! آج جبکہ تم واپس پنجاب جا رہے ہو تو جی چاہتا ہے کہ تم سے کھل کر باتیں کی جائیں۔'' ''فرمایئے میں گوش برآواز ہوں'' میں نے کہا۔ موصوف میرے ساتھ کچھ عرصے پہلے بطور ایس ڈی ایم کام کر چکے تھے' اس لیے حفظ مراتب کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت بے تکلفی بھی تھی۔ کہنے لگے ''تمہیں یاد ہے کچھ عرصہ قبل تم نے مجھے شیخوں اور سارنگ زئیوں کے جھگڑے کے متعلق لکھا تھا؟'' میں نے کہا ''یاد ہے!'' ''تم ابھی بچے ہو'' بلوچ صاحب مسکرائے۔ ''لڑنے دو کم بختوں کو۔ آدھے مر جائیں گے اور آدھے جیل چلے جائیں گے۔ اس طرح میرے سارے انتظامی مسائل حل ہو جائیں گے۔'' ''لیکن آپ تو... آپ تو... الفاظ میری زبان پر آتے آتے رک گئے۔ ''میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں' لیکن شاید تم میرا مسلک نہیں سمجھ سکے۔ آج جبکہ تم جا رہے ہو تو ہوسکتا ہے کہ بحیثیت دوست مجھے کچھ افسوس ہو' لیکن بحیثیت بلوچ میں بہت خوش ہوں۔ تم لوگ آ کر سروسز میں ہمارا حق مارتے ہو' اپنے آپ کو عوام میں مقبول کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ یہ باتیں ہمیں کس طرح گوارا ہوسکتی ہیں؟'' میں انہیں ان باتوں کا کیا جواب دیتا' خاموش ہوگیا۔

خیر یہ تو خواص کا معاملہ تھا اور ان کے ہتھکنڈوں کا ذکر جو یہ اپنے مخصوص انداز میں برتتے ہیں' لیکن دنیا میں کوئی ایسا زہر نہیں بنا' جس کا تریاق نہ ہو۔ نفرت کے زہر کا تریاق' ایثار اور محبت ہیں اور یہ وہ باتیں ہیں جن پر ایک عام بلوچ جان دیتا ہے۔ آپ ایک دفعہ پرخلوص ہاتھ سے ان کے دل کے دروازے پر دستک دیں' یہ دل و دماغ کے تمام دروازے کھول دیں گے اور دیدہ و دل فرش راہ کر دیں گے۔ ایک دفعہ ان کی خوشیوں کو اپنی خوشی سمجھیں' ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد جانیں' پھر دیکھیں یہ کیسے دیوانہ وار آپ کی طرف لپکتے ہیں۔ ان کا خلوص کسی طوائف کی اس چاہت کی طرح نہیں ہے' جسے سورج کی پہلی کرن ہی دھنک کر رکھ دیتی ہے۔ ان کا ایثار عصر حاضر کے ان جوانوں سے یکسر مختلف ہے' جنھوں نے ہاتھوں میں تیشے جوئے شیر کھودنے کے لیے نہیں بلکہ افسانہ فرہاد تازہ کرنے کے لیے پکڑ رکھے ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ قبائل کا کردار ایک ہی ہے لیکن اطوار مختلف ہے۔ منزل ایک ہے' لیکن راہیں جدا ہیں۔ نصب العین مشترک ہے' لیکن منصب الگ الگ ہیں۔ جس طرح ایک خاندان میں بڑا بھائی' بڑا بھائی ہوتا ہے اور برادر خورد! عم زاد نہ صرف عم زاد ہوتے ہیں بلکہ اکثر آمادہ فساد ہوتے ہیں' اسی طرح قبائل کی باہمی آویزش' شکر رنجیاں اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کی خواہش برقرار رہتی ہے۔ اگر

خطرہ باہر سے لاحق ہو تو یہ یکجا و یکجان۔ اگر مسئلہ قبائلی برتری کا ہو تو ایک دوسرے کے لیے بلائے جان۔ کوئی اپنی تعداد پہ نازاں ہے تو کوئی اپنے اجداد پہ فرحاں' کسی نے انتظامیہ سے ٹکر لینا اپنا شعار بنا رکھا ہے' تو کسی نے ہٹ دھرمی کو اپنا وقار سمجھ لیا ہے۔ کسی نے زندگی کو آلام بنا ڈالا ہے تو کسی نے ہر مصلحت کو دشنام بنا ڈالا ہے۔

قلات ڈویژن میں تعداد زرکزئیوں کی زیادہ ہے۔ لیکن استعداد مینگلوں کی مسلم ہے۔ چیف آف جھالاواں کے نام سے دودا خاں مشہور ہے لیکن چیف آف بلوچستان عطاء اللہ مینگل بنتا جا رہا ہے... باہمی اختلافات نے زرکزئیوں کو کافی زک پہنچائی ہے۔ دودا خان اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں کچھ ایسا پھنسا ہے کہ وقت کے پھندے اب کاٹے نہیں کٹتے.... اس کے اپنے ہی دست راست اب دست درازی پر اتر آئے ہیں۔ اس کا تفصیلاً ذکر بعد میں آئے گا ''ہر کہ در کان نمک رفت' نمک شد' نبی بخش زہری سے رفاقت نے دودا خان کو معاشی طور پر تو بے حد خوشحال کر دیا ہے' لیکن اس کی سرداری پر بڑی کاری ضرب لگی ہے۔ سخت کوشی اور عیش و عشرت ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ دودا خان نے دونوں کشتیوں پر پاؤں جمانے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے' چیف آف جھالاواں' جھالاواں سے الیکشن ہار گیا۔

زرکزئی جنگجو ہیں' خودسر ہیں' لیکن بے اثر ہیں۔ مینگلوں نے اگر جنگ کی ہے تو اپنوں اور غیروں میں تمیز کی ہے۔ زرکزئیوں نے چڑھتی ہیں ہوئی ندی کی طرح ہر چیز کو روند ڈالا ہے۔ سفر خان باغی نہ تھا' ڈاکو تھا جس کو محض پیسے سے غرض تھی۔ اس کی ابن الوقتی دولت کی طلب گار تھی۔ ہوس زر نے اس کی آنکھوں پر کچھ ایسی پٹی باندھی تھی کہ اس کچھ سجھائی نہ دیتا تھا اور اس کے لیے خشک و تر میں تمیز مشکل ہو گئی۔ جب قبیلے کے چیدہ افراد آپس میں ٹکرا جائیں تو ان کے لیے منزل کا تعین مشکل ہو جاتا ہے اور اگر منزل واضح نہ ہو تو ہر اٹھتا ہوا قدم پیچھے کی طرف پڑتا ہے۔

مینگلوں میں خوش قسمتی سے کوئی سفر خان پیدا نہیں ہوا جس کی حرص و آز کے متلاطم سمندر میں قبیلے کے وقار کا سفینہ ڈگمگانے لگے۔ یہاں علی محمد مینگل پیدا ہوا جس نے ہر شخص کو یہ بات ذہن نشین کرائی کہ سردار پیدا ہوتے ہیں گھڑے نہیں جاتے۔ سردار کرم خاں کا قتل کسی ذاتی پرخاش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ عطاء اللہ مینگل کی عظمت کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بنا۔ علی محمد مینگل نے کسی سفر خاں کی طرح سرداری کی خواہش ظاہر نہ کی بلکہ اپنے آپ کو اس کا ایک جاں نثار ساتھی سمجھتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلات کے افق پر مینگل ایک موثر طاقت بن کر ابھر آئے ہیں اور زرکزئی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں۔

ساراوان میں شہوانی بھی خاصی بڑی تعداد میں بستے ہیں لیکن سیاسی' سماجی اور معاشی طور پر کسی گنتی میں نہیں آتے۔ یہاں بھی اس

گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ نواب شہوانی کا دودا خان کے ساتھ مقابلہ کرنا یقیناً دودا سے زیادتی ہوگی۔ دودا خان ہنوز دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں! اس میں اس آگ کی تھوڑی سی تپش ابھی تک موجود ہے جس کے شعلوں کی حدت کبھی ایوان حکومت تک جا پہنچی تھی۔ نواب شہوانی اس مشت غبار کی مانند ہے جو تند و تیز ہواؤں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ کبھی گلشن میں کبھی صحرا میں۔ بے شمار پڑھے لکھے شہوانی خود تو سرداری کے امیدوار نہیں لیکن ایک بے اثر سردار کی قیادت کے بھی قائل نہیں۔ قبیلے کے لوگ تلاش معاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں تو سردار صاحب لومڑیوں اور خرگوشوں کے پیچھے تمام دن چھڑی لے کر ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ یہ فرصت کی باتیں ہیں۔ چھڑی اور کتوں سے جانوروں کو تو ہنکایا جا سکتا ہے' قبیلے کے مسائل حل نہیں کیے جا سکتے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ قلات ڈویژن کا سب سے مظلوم قبیلہ کون سا ہے تو بلا خوف تردید محمد شاہیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے سروں پر بیک وقت دو سرداروں کے سائے ہیں۔ ایک محمد زمان جو موروثی سردار ہے' ایک فقیر عمر جو طبعاً ہوشیار ہے۔ محمد زمان خوش شکل اور خوش پوش ہے لیکن مظلومیت کی کچھ ایسی افسردگی ہر وقت اس کے چہرے پر چھائی رہتی ہے کہ افسوس کے ساتھ بعض اوقات ہنسی بھی آ جاتی ہے۔

ایوب خاں کے زمانے میں ایک فوجی قافلے پر لک پاس میں فائرنگ ہوئی۔ اس سکھ کی طرح جس سے پولیس نے پوچھا تھا کہ قتل کس نے کیا ہے اور سردار جی نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا تھا کہ "ساڈے بغیر ایہہ کم کون کر سکدا اے؟" یہ کہیں بڑ مار بیٹھا کہ لک پاس فائرنگ میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ جب سردار بہادر خان بنگلزئی کے ساتھ یہ قید کاٹ کر جیل سے باہر آیا تو ماحول بدل چکا تھا... سرداری اس کے لیے ماضی کا ایک حسین خواب بن چکی تھی اور خلعت فاخرہ کو شیخ واصل کے ایک فقیر نے سمیٹ لیا تھا۔ محمد شاہی عجیب مخمصے میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک وہ سردار تھا جو اصلی تھا' لیکن غیر موثر تھا اور ایک وہ جو نقلی تھا' لیکن نہ صرف موثر تھا بلکہ ان کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر بھی رکھتا تھا۔ یہ چونکہ ارباب بست و کشاد کا منظور نظر تھا اس لیے مشکوک لوگوں کو کس جگہ بھی سکتا تھا۔

اگرچہ روایات سے انحراف ان کے قبائلی مسلک کے خلاف تھا لیکن جیتے جی اپنے آپ کو آگ میں جھونکنا بھی قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ یہ محمد زمان کو ملتے تو اس کی وفاداری کا دم بھرتے اور اگر فقیر عمر سے ملاقات ہوتی تو اس وفاداری میں استواری قائم نہ رہتی... محمد شاہیوں کی حالت بھیڑوں کے اس ریوڑ کی سی تھی جس کے دو گڈریے ہوں' ایک تو وہ جس کی آواز سے یہ مانوس تھے اور دوسرا وہ جس کے عصا سے بھی خائف تھے۔ ایک اگر ان کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا تو دوسرا اس دھڑکن کو بند کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ الغرض'

گومگو کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص دوسرے سے پوچھتا تھا کہ۔

جاؤں کدھر کو میں؟

عقیدت کے راستے عافیت کی منزل سے جدا تھے۔ بات سرداروں کی چل نکلی ہے تو آیئے سرداری نظام کا ذرا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں۔



سرداری نظام

بلوچستان میں دو قسم کے سردار ہیں' ایک تو وہ جنہیں سرداری ورثے میں ملتی ہے اور دوسرے وہ جنہیں بطور انعام اس سے نوازا جاتا ہے۔ اول الذکر پشت در پشت قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق سردار بنتے ہیں اور موخرالذکر انتظامی مصلحتوں کی مشین میں گھڑے جاتے ہیں۔ یہ حادثاتی پیداوار ہوتے ہیں اور اکثر کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سردار داخلی طور پر اپنے قبیلے کے سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قبیلے کے افراد کا مقدر بن جاتا ہے۔ خارجی طور پر ان کی وفاداریاں خان قلات سے وابستہ ہوتی تھیں۔

۱۸۷۶ء میں میر خداداد خاں کے عہد میں یہ طے پایا تھا کہ اگر سرداروں کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو گا تو اس کا فیصلہ حکومت برطانیہ کا نمائندہ سر رابرٹ سنڈیمن کروائے گا۔

قلات ڈویژن میں ویسے تو بے شمار قبیلے ہیں لیکن ان میں زیادہ مشہور اور با اثر مینگل' زرک زئی' شہوانی' لہڑی' بنگل زئی' رئیسانی اور محمد شاہی ہیں۔ ہر قبیلے کا اپنا اپنا مزاج ہے جو اس کے سرداروں کے عادات و اطوار سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق سب سے بڑا قبیلہ زرک زئی ہے جس کا سردار دودا خان زرکزئی ہے۔ مشکل سے چار فٹ قد' خمیدہ پشت' ابلتی ہوئی آنکھیں' عقابی ناک اور کھلتا ہوا رنگ۔ دودا خان' چیف آف جھالاوان' کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں جن عناصر سے دودا خان کا خمیر اٹھایا گیا تھا اس میں ضد' ہٹ دھرمی اور کینہ پروری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دودا خان بچپن میں بڑا پیارا اور خوبصورت بچہ تھا۔ والد کی موت کے بعد رسم و رواج کے مطابق اسے بڑا ہو کر سردار بننا تھا' لیکن مشرقی رسم و رواج کے کچھ اپنے بھی تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ دودا اپنے نگران چچا کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ جب اس کانٹے کی چبھن کچھ زیادہ بڑھی تو چچا جان نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنے بھائی کی آخری نشانی کو اگلے جہان پہنچانے کا ایک نادر طریقہ سوچا۔ زہری سے کوئٹہ جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ شتربان نے عین پہاڑوں کے درمیان جا کر اونٹنی کو اس زور سے پٹخنی دی کہ دودا خان ربڑ کے گیند کی طرح نشیبی پہاڑیوں سے لڑھکتا چلا گیا' لیکن قسمت کو اس بچے کی اتنی جلدی فراغت منظور نہ تھی۔ لاٹھی ٹوٹ گئی' لیکن سانپ زندہ رہا۔ زخمی سانپ' پھنکارتا ہوا.... دودا خان بڑا ہو کر سردار بنا۔ ایک با اثر اور فعال سردار جس نے اپنے مخالفین کو لوہے کے چنے چبوائے لیکن جب دودا خان کو دورایوبی میں قتل کے ایک مقدمے

میں جیل جانا پڑا تو لوہے میں وہ صلابت نہ رہی۔ اس آتش کے سرد پڑتے ہی کئی فتنوں نے سر اٹھایا۔ شاید آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کا محاورہ دودا خان کے لیے ہی زبان اردو نے وضع کیا۔ اس دوری نے کئی سوئے ہوئے فتنوں کو جگایا۔ رقابت کی وہ چنگاریاں جو وقت کی راکھ میں تقریباً دب چکی تھیں' پھر سے بھڑک اٹھیں۔ میر سفر خان اور اس کا بھائی جو کسی زمانے میں دودا خان کے دست راست ہوا کرتے تھے دست درازی پر اتر آئے اور حکومت سے سرداری کا مطالبہ کرنے لگے۔ حکومت شاید دودا خان سے اس حد تک ناراض نہیں ہوئی تھی یا پھر سردار کرم خان مینگل والے تجربے کی کڑواہٹ زبان سے نہ اتری تھی۔ جب ہر دو برادران کو اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہ آیا تو انہوں نے اس کی مہار پہاڑوں کی طرف موڑ دی۔

جب بلوچ رخت سفر باندھتا ہے تو سامان سفر چاولوں کی پوٹلی' پانی کی چھاگل اور بندوق پر مشتمل ہوتا ہے۔ سفر خان کے ساتھ اس کے کئی ہم خیال بھی شامل ہو گئے اور ایک ایک کر کے دودا خان کے ساتھی ٹھکانے لگنے لگے۔ ادھر سفر خان کسی روک ٹوک کے بغیر پہاڑوں میں مست مست ڈکرا رہا تھا تو ادھر دودا خان کسی زخمی درندے کی طرح جیل کی آہنی سلاخوں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ اسے سفر خان کی حرکات وسکنات کی ہر لحظہ اطلاع مل رہی تھی۔ کوئی شخص اس کی حیات میں سرداری کا دعویٰ کرے اس کو برداشت کرنا یقیناً اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ سوچ ہی اس کے لیے سوہان روح بنتی جا رہی تھی۔ شدت احساس کے اس جہنم میں زندہ رہنا دودا کے لیے مشکل ہو گیا اور پہلی مرتبہ خیال آیا کہ حکومت سے بات چیت شروع کرنی چاہیے۔ میر نبی بخش زہری جو اس وقت قومی اسمبلی کا ممبر تھا اور جس کی رسائی ایوان صدر تک تھی' دودا خان کا پیغام لے کر ایوب خان تک پہنچا کیونکہ میر سفر خان انتظامیہ کے لیے دردسر بنا ہوا تھا اس لیے حکمت عملی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ دودا خان کو رہا کر دیا جائے۔

جس دن میر نبی بخش زہری دودا خان کی رہائی کا پروانہ لے کر پہنچا اس روز اطلاع ملی کہ سفر خان پہاڑوں میں گھات لگائے چھپا بیٹھا ہے اور وہ ہر صورت میں دودا خان کا راستہ روکے گا۔ سفر خان سے زیادہ شاید ہی کوئی دودا خان کے مزاج سے واقف ہو۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اگر ایک دفعہ وہ اپنے قبیلے میں پہنچ گیا تو اس کے اثر ورسوخ کا محل از خود زمین بوس ہو جائے گا چنانچہ میر نبی بخش کو مشورہ دیا گیا کہ جب تک حفاظتی انتظامات مکمل نہیں کیے جاتے' دودا خان کا ایک دم باہر آنا مناسب نہ ہوگا۔

دودا خان جیل سے تو نکل آیا لیکن میدان کارزار میں نہ اتر سکا۔ اس کی راہ میں کئی انتظامی مصلحتیں حائل تھیں۔ انتظامیہ کی سوچ علاقے کے وسیع تر مفاد میں تھی۔ قیاس تھا کہ دودا خان کی رہائی کے بعد شاید سفر خان خائف ہو کر از خود ہتھیار ڈال دے گا یا گفت و شنید پر آمادہ ہو جائے اور اس طرح قبیلہ باہمی خونریز تصادم سے بچ جائے۔ لیکن یہ خیال خام تھا کیونکہ سفر خان انانیت کے اس موڑ پر

پہنچ چکا تھا جہاں سے پیچھے مڑنا تو درکنار مڑ کر دیکھنا بھی غیرت کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ علاقے کے تمام مفرور اور اشتہار مجرم ایک ایک کر کے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے تھے اور جس دن سے خدا بخش نیچاری اس کے ساتھ ملا تھا' ہر روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ اندرونی مخالفین کو ختم کر کے سفر خان کا حوصلہ بڑھ چکا تھا اور اس نے اکا دکا قافلے بھی لوٹنا شروع کر دیے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ کسی کمین گاہ میں گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور اکا دکا قافلے پر ٹوٹ پڑتے اور جب تک انتظامیہ کو اطلاع ملتی' یہ میلوں دور پہاڑوں میں نکل جاتے۔ ویسے بھی بلوچستان کی سنگلاخ چٹانوں میں تعاقب کوئی آسان کام نہیں۔ میلوں تک پانی کا نشان تک نہیں ملتا۔ بھاری ہتھیار از قسم مارٹر اور مشین گن کو اٹھا کر لے جانا انتہائی مشکل کام ہوتا ہے اور اس کے ساتھ رفتار بھی متاثر ہوتی ہے۔

دوداخان کی بے بسی کو سفر خان نے اس کی کمزوری پر محمول کیا اور اسے کھلم کھلا مقابلے کے پیغامات بھیجنے لگا اور جب انتظامیہ نے دیکھا کہ اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا چاہتا ہے' تو دوداخان کو اجازت دے دی۔

دوداخان نے زہری میں ایک لشکر جرار اکٹھا کیا اور ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت سفر خان کا تعاقب شروع کیا۔ شروع میں سفر خان مقابلے پر ڈٹ گیا' لیکن جب ایک ایک کر کے اس کے ساتھی لقمہ اجل بننے لگے تو اس نے وہ راہ اختیار کی جو یقیناً ایک بلوچ کے شایان شان نہیں... راہ فرار... دوداخان کا خمیر اس علاقے کی مٹی سے اٹھا تھا' وہ علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا پھر اسے حکومت کی اعانت بھی حاصل تھی۔ اس نے تین اطراف سے سفر خان کو گھیرے میں لے لیا۔ سفر خان کے غرور کا محل زمین بوس ہو چکا تھا۔ ایک باہمت بلوچ کی طرح مقابلہ کرنے کی بجائے وہ ایک بزدل ڈاکو کی طرح دم دبا کر بھاگا۔ اور وڈھ میں جا کر علی محمد مینگل سے پناہ طلب کی۔ کچھ تو رسم ورواج کی وجہ سے اور کچھ سیاسی رقابت کی بنا پر علی محمد مینگل اس کو پناہ دینے پر رضامند ہو گیا۔ دوداخان کی پیش قدمی جاری تھی کہ اسے علی محمد مینگل کا پیغام ملا کہ پیش قدمی روک دے کیونکہ مینگل' سفر خان کو پناہ دے چکے ہیں۔ دوداخان بہر حال مصر تھا کہ سفر خان کو اس کے حوالے کیا جائے کیونکہ وہ اس کا مجرم تھا۔ ویسے بھی معاہدے کی رو سے علی محمد مینگل سفر خان کو پناہ دینے کا حق نہ رکھتا تھا کیونکہ کسی زمانے میں یہ سفر خان کی طرح مفرور رہ چکا تھا اور نواب کالاباغ کی گورنری کے زمانے میں اس کے خلاف کئی آپریشنز ہو چکے تھے' لیکن بعد میں حکومت نے اسے اس شرط پر معاف کر دیا تھا کہ وڈھ میں ایک شریف شہری کی طرح زندگی بسر کرے گا اور کسی ڈاکو کی مدد نہیں کرے گا۔ قریب تھا کہ مینگل اور زرکزئی آپس میں ٹکرا جاتے اور بلوچستان کی تاریخ میں ایک اور خونی باب کا اضافہ ہو جاتا کہ انتظامیہ نے مداخلت کی اور اس طرح کامران دوداخان ناکام لوٹا۔

دوداخان اور عطاء اللہ مینگل کے تعلقات ایک عرصے سے ٹھیک نہ تھے۔ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود زرکزئی وہ اہمیت

حاصل نہ کر سکے جو عطاء اللہ اور اس کے قبیلے کا مقدر ہوئی۔ عطا اللہ کی گرفتاری کے بعد اس کے چچا کرم خان کو سردار بنانے کا جو تجربہ کیا گیا تھا اس سے عطاء اللہ کا خاصا امیج بن گیا تھا۔ ویسے بھی عطاء اللہ' دودا خان کی نسبت زیادہ پڑھا لکھا اور صاف گو ہے... خوددار' خود سر' خود پرست اور اکتا دینے والی حد تک ہٹ دھرم' جان جائے پہ آن نہ جائے۔ عطا اللہ مینگل' خیر بخش مری اور غوث بخش بزنجو ...بلوچستان کی تمام سیاست اس مثلث کے گرد گھومتی ہے۔ سیاست' قیادت اور سیادت بھی انہی کے تابع ہیں۔ عطاء اللہ مینگل' غوث بخش بزنجو کے زیر اثر نہ ہوتا تو شاید آج بلوچستان کی تاریخ کسی اور ڈھنگ سے لکھی جاتی۔ ہر چند کہ بزنجو آوران کا ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے لیکن غوث بخش بزنجو کا اپنا سیاسی قد بہت اونچا ہے۔ بلوچستان کے تمام متحرک طبقوں نے انہیں قبلہ سیاست مانا ہے۔ بعض لوگ انہیں بھٹکی ہوئی شخصیت' بھی کہتے ہیں' لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے... غوث بخش بزنجو سے میری ملاقات صرف ایک دفعہ ہوئی اور وہ بھی بہت مختصر مدت کے لیے... یحییٰ خان نے جسٹس فضل اکبر کی صدارت میں ایک Decentrali sation کمیشن قائم کیا تھا۔

کمیشن نے مستونگ میں بھی اپنی ایک نشست رکھی تھی۔ کمیشن کی نشست و برخاست کا انتظام میرے ذمے تھا۔ اس کمیشن کے سامنے میر غوث بخش بزنجو نے ایک جاندار تقریر کی تھی جس کی صدائے بازگشت بڑی دیر تک بلوچستان میں سنی جاتی رہی... سرخ و سپید چہرہ' بھاری بھرکم جسم' پہاڑوں کی تازہ برف کی طرح سفید اور نرم بال' ماتھے پر مسلسل فکر کی علامت' گہری لکیریں' غوث بخش گرج رہا تھا...

''ان آرڈیننسوں' ڈگریوں اور ظالمانہ قوانین کے تحت آپ کب تک عوام کی خواہشات اور امنگوں کو دبائے رکھیں گے؟ کب تک روح عوام ان تازیانوں کو برداشت کرے گی؟ یہ اندھیرے کب تک روشنی کو روکیں گے...؟'' تقریر بڑی جاندار تھی۔ آواز کا زیر و بم بہت متوازن اور لہجے میں تلوار کی سی تیزی اور کاٹ۔ جسٹس فضل اکبر اور کمیشن کے دوسرے ممبران نہایت انہماک سے یہ تقریر سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ نوٹ بھی لیتے جاتے۔ جب اجلاس برخاست ہوا تو ارکان اٹھ کر کمشنر صاحب کے ریسٹ ہاؤس میں چلے گئے۔ اتنے میں چند فوٹو گرافر آئے اور انہوں نے میر غوث بخش بزنجو اور دیگر بلوچ لیڈروں سے گروپ فوٹو کی درخواست کی۔ بادام کے بوٹوں کے پس منظر میں تمام بلوچ لیڈر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ میں کمشنر صاحب کے ساتھ مخالف سمت میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ فوٹو گرافر تصویر اتارا ہی چاہتا تھا کہ غوث بخش بزنجو کو خدا جانے کیا سوجھی! اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر قطار میں سے نکل کر ہماری طرف آیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''کیا آپ ہمارے ساتھ فوٹو اتروانا پسند کریں گے؟'' باوجود شدید

خواہش کے میں تذبذب میں پڑ گیا اور کمشنر صاحب کی طرف دیکھا۔ راجہ صاحب مسکرا پڑے۔ چنانچہ اشارہ پا کر میں قطار میں جا کھڑا ہوا۔

ان بلوچ سرداروں نے اپنے حقوق منوانے کے لیے جو تحریک شروع کی تھی' اس نے انہیں ایک ایسے نقطے پر لا کھڑا کیا جہاں سے آگے بڑھنا ان کے بس کا روگ نہ تھا اور پیچھے ہٹنا ان کے مسلک کے خلاف! ایوب خان کے زمانے میں عطاء اللہ اور اس کے ساتھیوں کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ ہر چند کہ یحییٰ خان کے زمانے میں ان کو رہا کر دیا گیا' لیکن یہ رہائی بھی کسی بڑی تبدیلی قلب کا پیش خیمہ نہ بن سکی۔ بعض اوقات بظاہر چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے دوررس نتائج نکلتے ہیں' جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بلوچ عزت نفس کو ہر مصلحت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا... نور خان جب مغربی پاکستان کے گورنر تھے تو وہ خضدار دورے پر آئے۔ عطاء اللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کو صبح کے وقت گورنر موصوف سے ملاقات کرنا تھی۔ جب ہر دو بلوچ لیڈر وقت کی پابندی کرتے ہوئے صبح خضدار پہنچے تو پتہ چلا کہ نور خاں ایک ''ڈیم'' کی انسپکشن کے لیے چلے گئے ہیں۔ شام کو جب کمشنر صاحب کا ہرکارہ ملاقات کا پیغام لے کر ان کے پاس پہنچا تو اسے جانا پہچانا جواب ملا۔ ''گورنر صاحب سے جا کر کہہ دو کہ اب ہمارا وقت ملاقات ختم ہو چکا ہے۔

اس طرح جنرل موسیٰ جب گورنر تھے تو انہوں نے بھی کالا باغ کے زمانے میں گرفتار چند بلوچ سردار رہا کر دیئے۔ جب کچھ عرصے بعد جنرل موصوف کوئٹہ دورے پر تشریف لائے تو چند حکام نے نئے رہا شدہ سرداروں کو مشورہ دیا کہ چل کر رسمی طور پر جنرل صاحب کا شکریہ ادا کر دیں۔ اس پر سردار بڑے سیخ پا ہوئے اور کہا ''شکریہ کا مطلب ہماری لغت میں معافی مانگنا ہے۔ اگر ہم نے معافی ہی مانگنی ہوتی تو نواب کالا باغ سے مانگ لیتے کیونکہ وہ بھی ہماری طرح سردار ہی ہے'' اس قسم کے خیالات سے اصولی طور پر تو اختلاف ہو سکتا ہے' لیکن سیاست میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے جسے ممکنات کا کھیل کہا جاتا ہے۔

جو سردار انتظامی مصلحتوں کی خانہ ساز فیکٹری میں ڈھلتے ہیں' ان میں سردار فقیر عمر کا نام سرفہرست ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ محمد شاہی قبیلے کا ایک مجاور تھا جو رفتہ رفتہ اپنی عیاری سے سرداری تک جا پہنچا۔ شاید مولانا آزاد کو محی الدین سے ابوالکلام بننے میں اتنی کاوش نہ کرنا پڑی ہوگی جتنی سردار بننے کی دھن میں اسے کرنا پڑی۔ مستونگ سے بیس میل پر ایران جانے والی سڑک پر ایک گاؤں ہے' شیخ واصل.... اس گاؤں کے ساتھ ایک مزار ہے۔ اس مزار کے اس زیرک مجاور نے سالہا سال تک سردار بننے کے منصوبے بنائے۔ بخت نصر نے جو فقیری سے امیری تک لمبی جست لگائی تھی' اس میں شاید اس کی اپنی کاوشوں کا اتنا عمل دخل نہ تھا۔ اس وقت محمد

شاہی قبیلے کا سردار محمد زمان تھا جو نہایت شریف ہونے کے ساتھ ساتھ سخت نااہل بھی تھا فقیر عمر نے اپنے اردگرد درویشوں کا ایک ٹولہ جمع کر لیا جو دراصل جرائم پیشہ افراد پر مشتمل تھا۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ قریبی پاک افغان بارڈر پر نت نئی واردات کروا دیتا اور اس کا الزام محمد زمان کے سر تھوپ دیتا۔ کبھی ٹیلی گراف کے تار کٹ جاتے' کبھی اکا دکا فائرنگ ہو جاتی۔ اکثر اوقات پاکستان کے مویشی ہنکوا کر سرحد پار بھیج دیے جاتے۔ بلوچستان میں چوری نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی ایک وجہ کچھ تو بلوچ قوم کا مخصوص کردار ہے اور دوسری قبائلی نظام' جس میں کسی چور کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ لیکن فقیر عمر کے اردگرد چوروں کا ایک منظم گروہ منڈلاتا رہتا۔ آخر وہ دن آ پہنچا جس کا اس نے سالہا سال تک انتظار کیا تھا۔ ایوب خان کے ابتدائی دور میں ایک فوجی قافلے پر لک پاس کے پہاڑ میں چند نامعلوم افراد نے فائرنگ کی۔ فقیر عمر نے فوراً انتظامیہ تک یہ بات پہنچائی کہ اس فائرنگ میں محمد زمان کا ہاتھ تھا۔ جب محمد زمان' سردار بہادر خان بنگل زئی کے ساتھ گرفتار ہوا تو میدان صاف ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرکاری طور پر فقیر عمر کو محمد شاہی قبیلہ کا سردار بنا دیا گیا۔ سرخ سپید رنگت' ساٹھ کے پیٹے میں' درمیانہ قد' ہٹلر نما مونچھیں' دستار پہنے اور ہاتھ میں عصا تھامے اگر کوئی شخص مستونگ میں سرکاری دفتروں کا چکر کاٹتا نظر آئے تو آپ بخوبی قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ سردار فقیر عمر ہے۔ کورا ان پڑھ ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں فطری ذہانت چمکتی ہے۔ آپ چاہے کسی زبان میں گفتگو کریں' کوئی موضوع زیر بحث ہو' یہ آپ کے چہرے کے تاثرات سے موضوع سخن سمجھ جائے گا۔

کہتے ہیں کہ ایک دعوت میں شیر شاہ سوری کی حرکات و سکنات کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے جب بابر نے ترکی زبان میں اس کی گرفتاری کا حکم دیا تو زبان نہ سمجھنے کے باوجود بھی اس نے جان لیا تھا کہ اس کی آزادی سلب کرنے کا حکم دیا جا چکا ہے' چنانچہ اس نے فوری طور پر محفل سے کھسک جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھی تھی۔ سردار محمد زمان کے قبیلے میں وہ دم خم نہ تھا جس کا مظاہرہ مینگل کر چکے تھے نہ اسے وہ ثابت قدمی ودیعت ہوئی تھی جو عطاء اللہ مینگل اور خیر بخش مری کو ورثے میں ملی ہے۔ محمد زمان کی شرافت کمزوری کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس کی کمزوری کا فائدہ یقیناً فقیر عمر کو اٹھانا تھا۔ فقیر عمر کا ایک ہاتھ اگر قبیلے کی نبض پر تھا تو دوسرا اس نے حکومت کی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ کب اور کہاں کوئی شخص سر اٹھا رہا ہے' اس کے اقتدار کو کہاں کہاں سے خطرہ لاحق ہے' اس کی سوچ کے قافلے ہمیشہ ان راہوں پر گامزن رہتے۔ فقیر عمر جتنا قبیلے اور سرداروں میں غیر مقبول تھا اتنا ہی انتظامیہ کا منظور نظر... میں جب مستونگ میں تعینات ہوا تو پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے اس طرح کھل کر ملا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ چارج لینے سے پہلے میں نے تمام سرداروں کی فہرست دیکھی تھی اور ان کی عادات و اطوار کا جائزہ لیا تھا' اس لیے مجھے کوئی تعجب نہ ہوا۔

چکور کا شکار

جس دن فقیر عمر مجھے ملا اتفاقاً میں دورے پر جوہان جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جوہان ندی میں چکور کا شکار کھیلوں گا۔ فقیر عمر کو جب میرے اس ارادے کا علم ہوا تو اس کے ماتھے پر پریشانی کی لکیریں ابھریں اور مجھ سے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔

''سائیں! جوہان ندی میں شکار کھیلنے مت جاؤ''

''آخر کیوں نہ جاؤں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''سائیں! جو افسر بھی جوہان ندی پر شکار کھیلتا ہے یا تو اس کا تبادلہ ہو جاتا ہے یا پھر پکی چھٹی ہو جاتی ہے'' فقیر عمر نے کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سردار صاحب! میں ان توہمات پر یقین نہیں رکھتا۔''

''یہ وہم نہیں حقیقت ہے'' فقیر عمر نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میجر اللہ داد خان جب شکار پر گیا تو میں نے اسے منع کیا تھا' لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی پہاڑی پر تھا کہ ریڈیو پر اپنی چھٹی کا اعلان سنا۔ غلام سرور خان کمشنر قلات کو بھی میں نے روکا تھا' لیکن تبادلہ شاید اس کے مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔ ظفر علی خان کو بھی میں نے ٹوکا تھا۔'' ''سردار صاحب! بات یہ ہے کہ وہ بہت بڑے افسر تھے۔ شاید ان پر آپ کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی ہو لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان توہمات پر یقین نہیں رکھتا۔'' میں نے ہنس کر سردار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اچھا سائیں! تمہاری مرضی'' فقیر عمر اپنا عصا تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ اسے یقیناً میری حماقت پر افسوس ہوا ہوگا' لیکن کف افسوس تو بہر حال مجھے ہی ملنا تھا۔

صبح تیار ہو کر جب باہر نکلا تو شکاری پارٹی کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھی۔ نیمرغ سے تحصیلدار بہار شاہ نے لیویز کے سپاہی گل محمد کو منگوایا تھا جو گھوڑے کی رفتار سے پہاڑ پر دوڑتا تھا اور فضا میں اڑتے ہوئے مچھر پر بھی ٹھیک نشانہ باندھ سکتا تھا۔ نیز ایک میل کے فاصلے سے سونگھ کر بتا سکتا تھا کہ چکور کس سمت میں لقمہ اجل بننے کے منتظر ہیں۔ دوسرا شکاری ولی محمد شاہوانی تھا جو شکاری کم اور درباری زیادہ تھا۔ ولی محمد نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں شاید اتنا شکار نہ کیا تھا جتنے شکار کے متعلق لطائف اسے یاد تھے۔ تیسرا بہار شاہ تھا جس نے بندوق کا بار گراں صرف اس لیے اٹھایا ہوا تھا کہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ شاید شکار کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کھلانا کٹھن ہوتا ہے' کیونکہ ناکامی کی صورت میں شکاری سارا الزام منتظمین کے سر تھوپ دیتا ہے۔ خاص طور پر شکار اگر کوئی ''صاحب بہادر'' کر رہا ہو تو ماتحت عملے کی جان ہر وقت سولی پر لٹکی رہتی ہے۔

قلات اور مستونگ کے وسط میں ایک مقام ہے... منگچر ... منگچر سے جو سڑک بائیں ہاتھ مڑتی ہے وہ سیدھی جوہان وادی کے سینے میں جا اترتی ہے۔ ابھی سورج نے مشرقی کنارے سے جھانکا ہی تھا کہ ہم جوہان پہنچ گئے۔ جیپ جونہی آخری ڈھلوان سے نیچے اتری تازہ ہوا کا ایک مست جھونکا شپ سے ہمارے جسم سے ٹکرایا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے فرانس کے تمام "کلونوں" کو ایک دم فضا میں چھڑک دیا گیا ہو۔ دائیں ہاتھ جوہان ندی بہہ رہی تھی۔ اپنے خیالات میں مگن، اپنے حسن سے بے پرواہ، اپنے ماحول سے بے نیاز اپنے تصورات کا آئینہ سینے پر سجائے خراماں خراماں بہے چلی جا رہی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ فرازکوہ سے سیال شیشہ پتھروں سے ٹکراتا، موتی برساتا، سنگریزوں کا منہ چومتا، کنارے پر کھڑے ہوئے گلہائے رنگارنگ کا عکس سینے میں جذب کئے قوس قزح میں ڈھل رہا ہے۔ حسن صرف دیکھا ہی نہیں جاتا، محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔ زندگی اگر رنگوں سے عبارت ہے تو یقیناً اس کی ابتدا اسی وادی سے ہوئی ہوگی۔ حسن اگر سچائی ہے تو اس وادی کا ہر موڑ اپنے دامن میں صداقت کی ایک داستان لیے کھڑا تھا۔ حسن محبوب کا خمیر یقیناً اسی مٹی سے اٹھا ہوگا۔ آنکھوں کے ساغر اسی سیال بلور سے چھلکے ہوں گے۔ زلفوں کی گھٹائیں انہی پہاڑوں سے امڈی ہوں گی۔ اور موج خرام یار نے اسی ندی کے انداز اپنائے ہوں گے۔ اگر نصر بن احمد رے کی بجائے اس وادی میں خیمہ زن ہوتا تو چاہے ہزار رود کی اپنی لاکھ غزلیں سناتے، وہ ٹس سے مس نہ ہوتا کیونکہ دنیا کا کوئی ساز اس ساز سے دلفریب نہیں ہے جو بہتے جھرنوں کے پتھروں سے ٹکرانے سے پیدا ہوتا ہے۔ کوئی گیت، اس گیت سے زیادہ سرور انگیز نہیں جو سپیدہ سحر کے پھوٹتے ہی معصوم پرندے سناتے ہیں۔

ماحول پر مکمل سکوت طاری تھا۔ صرف جیپ کا انجن پھڑ پھڑا رہا تھا۔ انجن کے شور میں ندی سے اٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی موسیقی دب سی گئی تھی، بالکل اس طرح جیسے لتا منگیشکر کا گایا ہوا کوئی ہلکا پھلکا نغمہ استاد فتح علی علی خان کی ٹھمری کے آگے دم توڑ دے۔ سڑک کسی "مہ وش" کی کمر کی طرح سمٹتی جا رہی تھی، اس لیے میر ہزار گاڑی کو نہایت احتیاط سے چلا رہا تھا۔ جب چوتھا موڑ کاٹ کے میر ہزار ندی کے دائیں جانب گھوما تو ولی محمد چلایا... "روکو، روکو" گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی اور بے اختیار ہمارے ہاتھ بھری ہوئی بندوقوں کے کندوں پر جا پڑے۔ جب میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی انگلی کے اشارے کی سمت اپنی گردن موڑی تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چکوروں کی پوری ڈار اپنے انجام سے بے خبر، شکم سیر ہو کر پہاڑی کے دامن میں رقصاں تھی... یکدم تین فائر ہوئے۔ پانچ چکور کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا میں ڈولے، ڈوبتی نظروں سے ساتھیوں کو الوداع کہا اور پھڑ پھڑاتے ہوئے زمین پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میر ہزار نے اپنے دانتوں کی طرح تیز چاقو تک سے کھولا اور نیم بسمل چکوروں کو مشرف بہ اسلام کرنے لگا۔ چکور کی نفسیات ہے کہ فائر ہونے کے بعد زیادہ دیر تک اڑتا نہیں بلکہ دوڑنا شروع کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بولتا بھی جاتا ہے تا کہ شکاری

کو تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ ہم تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔ جن دو چکوروں کا تعاقب میرے حصے میں آیا وہ اتنے سادہ لوح تو نہ تھے کہ بندوق کی زد میں آ جاتے لیکن اتنے پرکار بھی نہ تھے کہ فضا میں چند غوطے لگا کر اڑنچھو ہو جاتے' چونکہ چکور کا رنگ پتھروں سے ملتا جلتا ہے' اس لیے تلاش خاصا مشکل کام ہے۔ جب بھی میں بعد از خرابی بسیار ان کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا اور نشانہ باندھتا تو یہ کسی پتھر کی اوٹ میں چھپ جاتے اور مجبوراً مجھے بندوق کا رخ آسمان کی طرف کرنا پڑتا۔ اگر بندوق کی مار آسمان تک جاتی تو اب تک میں یقیناً چرغ نیلی فام میں ہزار چھید ڈال چکا ہوتا کیونکہ اس کے ہتھکنڈوں سے میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ شوق شکار میں پہاڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ سینے میں جوار بھاٹا سا اٹھ رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی تیز نشتر کلیجے کو فگار کر رہا ہے۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ مزید تعاقب ترک کر کے پہاڑ سے نیچے اتر جاؤں' لیکن ہر دفعہ انانیت مانع ہوئی۔ "لوگ کیا کہیں گے؟" ولی محمد شہوانی مجھے ان افسروں کے قصے سنا چکا تھا جو نہایت کروفر سے شکار کے لیے نکلتے تھے اور پہلے ہی مرحلے میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر تک چکوروں سے آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والی بات تھی۔ ہر پانچ دس منٹ کے بعد کسی پتھر کی اوٹ سے سر نکال کر کلیلیں کرتے اور پیشتر اس کے کہ میرا ہاتھ کھٹکے تک پہنچتا' یہ چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور مایوسی کے سائے میری روح کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔ میں تھک ہار کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ نیچے جا کر اپنی ناکامی کا کیا جواز پیش کروں گا۔ ناگاہ میری نگاہ سامنے کی چٹان پر پڑی تو عجب منظر دیکھا۔ چکوروں کا جوڑا بزعم خود مجھے غچہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا اپنی کامیابی پر جشن منا رہا تھا۔ نر چکور مادہ کی چونچ کو بار بار اپنی چونچ میں لے لیتا اور پھر اس کے ارد گرد رقص شروع کر دیتا۔ بے اختیار میں نے دائیں آنکھ میچ کر بندوق کی نالی ان کی سمت کر دی۔ محبت کے نشے میں سرمست جوڑا یقیناً مجھ سے بے خبر تھا۔ نر مادہ کے گرد بدستور رقص کناں تھا... موت کا رقص... رقص آخری... جس کے بعد اسے کسی نہ کسی پیٹ کے جہنم میں اترنا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں بجلی سی کوندی... محبت کا قتل... ولن... بے شمار مشرقی کردار اوراق تاریخ سے میرے پردہ ذہن پر نمودار ہوئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں ان فضول خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ یہ شکاری کا شیوہ نہیں۔ میں نے اپنے ماضی پر نظر ڈالی۔ مجھے اپنی ویران زندگی میں دور دور تک کوئی ایک بھی ایسا سایہ دار درخت نظر نہ آیا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر میں نے پل بھر ستایا ہو... مجھے اپنے لاشعور میں نفرت کی آگ کا الاؤ دہکتا ہوا محسوس ہوا جسے ولی محمد مزید ہوا دے رہا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ پیشتر اس کے کہ میرے دماغ پر دھواں چھا جاتا' میں نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔ "ٹھاہ" ایک فائر ہوا جو پہاڑوں سے ٹکرا کر گونجتا رہا۔ مادہ تو اڑ گئی لیکن نر چکور یوں سر نیوڑا کر بیٹھ گیا جیسے رکوع کی حالت میں ہو۔ میں نے پہاڑ کے

نیچے نگاہ ڈالی تو مجھے چند سائے متحرک نظر آئے۔ غالباً ولی محمد ہاتھ ہلا کر مجھے اس کامیابی کی مبارکباد دے رہا تھا۔ میں جب قریب پہنچا تو چکور اسی حالت استغراق میں تھا' البتہ قریبی پہاڑوں سے چکوری کی درد بھری آواز ابھر رہی تھی... "اپنے محبوب سے بچھڑنے کا غم"..... میں نے چکور پکڑ کر اسے ٹٹولا۔ اس کا جسم اب تک گرم تھا۔ جب میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو مجھے اس کے جسم یا پروں پر کہیں خون کا نشان تک نظر نہ آیا۔ میں نے مزید تسلی کے لیے اس کے پروں کو پھر ٹٹولا۔ زخم کہیں نہ تھا۔ دراصل ہوا یوں کہ بندوق کے چھرے اتنے قریب سے گزرے تھے کہ ان کی دہشت سے بیچارہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ جب میں نے اسے دو تین مرتبہ جھٹکا تو اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول دیں۔ میرے کانوں میں ابھی تک چکوری کے بین گونج رہے تھے۔ میں نے ایک نظر چکور کو دیکھا' ایک نظر پہاڑ پر سے جھک کر ولی محمد کو دیکھا اور پیشتر اس کے کہ میری عقل میری راہبری کرتی' میرے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہوا اور وہ خود بخود کھل گئے۔ چکور نے پر پھڑپھڑائے' فضا میں دو تین غوطے لگائے اور پہاڑ کی بیکراں وسعتوں میں غائب ہوگیا۔

میں نیچے اترا تو میرے ہاتھ خالی تھے۔ شکاری تھیلا بھی کسی مفلس کی جوانی کی طرح پچکا ہوا تھا۔ جب میں نے اپنی ناکامی کی داستان انہیں سنائی تو باقی لوگوں کے تاثرات کا تو مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا' البتہ ولی محمد کی آنکھوں میں ایک شرارت انگیز چمک تھی جیسے کہہ رہا ہو۔

من خوب می شناسم پیران پارسا را

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا میں اب شمشیر کی سی کاٹ آ رہی تھی۔ دن کے تھکے ماندے شاہ خاور نے جب دور غربی سمت جوہان ندی میں ڈبکی لگائی تو ہم اپنے شکاری تھیلوں کو سمیٹ کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ بہار شاہ ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ جب ہم جوہان پہنچے تو آگ کا الاؤ دہک رہا تھا۔ ہم آگ کے ارد گرد بیٹھ گئے' کیونکہ کھانا تیار ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے ولی محمد شہوانی جو کہ بزم کا شہنشاہ تھا دن بھر کی "نرم دم جستجو" کی خفت مٹانے کے لیے "گرم دم گفتگو" ہوا اور خوانین قلات کے قصے اور لطائف سے ہمیں لطف اندوز کرنے لگا۔ میر محمود خان کے متعلق اس نے ایک واقعہ سنایا کہ جب ایک دفعہ بمبئی گیا تو اس کا تعارف باقی عمائد کے علاوہ ایک نامور فلمی ایکٹر سے کرایا گیا۔ میر محمود خاں کو ایکٹر مذکور کے کام کی نوعیت چونکہ سمجھ میں نہ آئی تھی اس لیے استفسار پر اسے بتایا گیا کہ ایکٹر ایک بہت بڑا فنکار ہوتا ہے جو فلموں اور ڈراموں میں کام کرتا ہے۔ ناچتا ہے' گاتا ہے اور اس طرح ناظرین کا دل لبھاتا ہے۔ اس پر میر محمود خان بے اختیار ہنس پڑا اور کہا۔ "اچھا! اب میں سمجھا ان کو بلوچستان میں ہم لوگ "لوڑی" (میراثی) بولتے ہیں۔"

تمام دن گھومنے پھرنے سے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس پر بھوک الگ غضب ڈھا رہی تھی۔ چنانچہ جب بہار شاہ نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے تو ایسے محسوس ہوا جیسے کانوں میں صور اسرافیل پھونکا جا رہا ہو۔ فرش ہی پر کھانا چن دیا گیا۔ جب آزمائش کا مرحلہ شروع ہوئی تو "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز" کے مصداق سب نے ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر حسب اشتہا کھانا کھایا۔ بلوچستان کی یہ رسم مجھے بہت پسند آئی کہ کھانا کھانے کے وقت کمشنر سے لے کر چپڑاسی تک سب ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھاتے ہیں اور محمود و ایاز کا فرق مٹ جاتا ہے۔

کھانا کھا کر ہم پھر الاؤ کے گرد جا بیٹھے۔ یخ بستہ سردی میں آگ کا الاؤ اتنی بڑی نعمت ہے جس کا نعم البدل دنیا کے تمام برقی ہیٹر بھی نہیں ہو سکتے۔ جب سرکش آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں' شعلوں کی روشنی اور تمازت سے چہرے کندن بن جاتے ہیں' ایک دلاویز موسیقیت کے ساتھ روپہلی لکڑیاں چٹختی ہیں اور چیخ کر سنہری راکھ بکھیر دیتی ہیں تو جذبات اور خیالات میں ایک تلاطم بپا ہو جاتا ہے۔ تصورات انسان کو کہاں سے کہاں لے اڑتے ہیں! میں نے قلات کے شاہی باغ کے ریسٹ ہاؤس میں اکثر راتیں آگ کے گرد بیٹھ کر گزاری ہیں۔

ولی محمد کا زور خطابت اپنے جوبن پر تھا کہ اکثر حاضرین اونگھنے لگے۔ "ولی محمد! بس کرو۔" میں نے نیم خوابیدہ انسانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ولی محمد نے خطابت کی گاڑی کو جو یقیناً سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی' ایک دم بریک لگائی۔ اپنی عظمت کے واحد نشان کلاہ زریں کو کھونٹی پر لٹکا دیا' پاؤں سے جوتے اتار کر انہیں لوٹن کبوتر کی طرح فضا میں اچھالا اور اپنے مشکیزہ نما پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بستر پر لیٹ گیا اور چند منٹوں میں خراٹے بھرنے لگا۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑ چکی تھی۔ قریباً سب لوگ سو گئے تھے لیکن میں جاگ رہا تھا۔ نیند کی دیوی جانے کون سی وادیوں میں کھوگئی تھی' ایسا کیوں تھا؟ میں نے اپنے اندر جھانکا' دل و دماغ کے ہر دروازے کو کھٹکھٹایا' ہزار منطقی دلیلیں اکٹھی کیں... لاکھ تاویلیں نکالیں... کیا مجھے ڈاکوؤں کا خطرہ تھا؟ کیا میں اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ چند گھنٹوں کی نیند کا بوجھ بھی نہ اٹھا سکتا تھا؟ کیا میں بے خوابی کا مریض تھا؟ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے؟... ان باتوں کا کوئی واضح جواب میرے پاس نہ تھا۔ دل کی وادیوں کے اندر... روح کی گھاٹیوں کے پیچھے' ادراک کے ہمالہ کے اوپر' ہر طرف دھواں سا اٹھتا نظر آتا تھا۔

صبح جب میں اٹھا تو جس پہلے شخص سے ملاقات ہوئی وہ سردار بہرام خاں لہڑی تھا' بہرام خاں غالباً قلات کا معمر ترین سردار تھا۔ کھنڈرات دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوانی میں یقیناً خوبصورت رہا ہوگا۔ پختہ کار' زودفہم' زیرک اور عیار۔ یہ سب باتیں میں نے

پہلے سے سن رکھی تھیں' لیکن سردار بہرام خان سے مل کر مجھے اندازہ ہوا کہ راوی نے سردار کی کردار نگاری میں یقیناً بخل سے کام لیا تھا۔ بہرام خاں ماضی کی راکھ کریدنے لگا جب اصل سرداریاں تھیں اور سردار اپنے قبیلے میں ایک موثر اور فعال کردار ادا کرتا تھا۔ "اب سرداریاں کہاں رہ گئی ہیں؟" بہرام خان نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اب تو صرف سرداری کی تہمت باقی رہ گئی ہے۔ انشاء اللہ کسی دن یہ بھی اتر جائے گی۔" "انسان کو وقت اور حالات کے ساتھ چلنا چاہیے" میں نے جواباً کہا "ایک ایسا وقت آ رہا ہے کہ آپ کے قبیلے کے پڑھے لکھے لوگ بھی آپ کو سردار ماننے سے انکار کر دیں گے۔" "شاید میں وہ وقت نہ دیکھ سکوں۔" بہرام خان نے اپنے چہرے کی جھریوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

سردار بہرام خاں سے ملاقات ختم ہوئی تو علاقے کے لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر جوق در جوق آنے لگے۔ کوئی نیا مسئلہ نہ تھا' کوئی انوکھا تقاضا نہ تھا۔ کسی الہ دین کے چراغ کی فرمائش نہ کی گئی تھی۔ مسائل وہی تھے جو سارے ملک کی آبادی کو پیش ہیں۔ مصائب وہی تھے جن سے سارا ایشیا بلک رہا ہے۔ تکالیف کا وہی سمندر یہاں بھی ٹھاٹھیں مار رہا تھا جس نے ساری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ روٹی کا مسئلہ' بھوک کے اژدہے' بیماریوں کے عفریت ہر طرف منہ کھولے جبڑے پھیلائے کھڑے تھے۔ "صاحب رہنے کو جھونپڑی نہیں ہے۔" "صاحب کھانے کو روٹی نہیں ہے۔" "ٹکرے ٹکرے ہو گیا ہے"... یا مظہر العجائب! کتنی حسین وادی' کتنے مدقوق چہرے' اتنی دھنسی ہوئی آنکھیں جیسے اجنتا کے غار... تمام دنیا کی دولت بھی خرچ کر دیں تو بدصورت انسان کو خوبصورت نہیں بنایا جا سکتا' لیکن چند دن کی بھوک سے پھول جیسے چہرے کملا جاتے ہیں۔ حسین عمارتیں کھنڈر بن جاتی ہیں اور کھنڈر وقت کی راکھ کے نیچے دب جاتے ہیں۔ چمپئی رنگ چمپئی نہیں رہتا جو راحت دیدار کا رنگ ہے' بلکہ سرمئی رنگ میں ڈھل جاتا ہے جو ساعت بیزار کا رنگ ہے۔

ابھی ملاقات کا سلسلہ جاری تھا کہ خداوندان مکتب کی طرف سے پیغام آیا کہ بچے منتظر ہیں' لگے ہاتھوں اکلوتے سکول کا معائنہ بھی کرتے جایئے۔ اگر رابندر ناتھ ٹیگور زندہ ہوتا تو یہاں ایک "شانتی نکیتن" ضرور کھولتا۔ باد صرصر چلے یا باد سموم... باد و باراں ہو یا ابر نیساں' بچوں کو انہی پیوند شدہ ٹاٹوں پر بیٹھ کر کھلی فضا میں تعلیم حاصل کرنا تھی۔ میں نے سکول جا کر خداوندان مکتب سے چند رسمی باتیں کیں۔ بچوں کے سر پر دست شفقت پھیرا اور سکول کے رجسٹر میں اپنے تاثرات لکھے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ بچوں کی مشتاق نگاہیں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ استاد صاحب کے حلق میں کوئی بات آتے آتے اٹک جاتی۔ میں نے بہار شاہ تحصیلدار کے کان میں سرگوشی کی۔ "اس کے بعد کیا کرنا ہے؟" "اصل کام تو ابھی رہ گیا ہے" بہار

شاہ نے اسی سرگوشی کو پلٹا دیا" بچوں کی مٹھائی کے لیے کچھ رقم جیب خاص سے عنایت فرمائیں' کیونکہ اس دن کا انتظار انہیں سارا سال رہتا ہے۔" چنانچہ میں نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے سو روپے کا نوٹ نکالا۔ ترستی ہوئی نگاہوں کے سامنے اس کو فضا میں بلند کیا اور ماسٹر صاحب کی جلتی ہوئی ہتھیلی پر ڈال دیا۔ "بولو ناظم صاحب! زندہ باد" ماسٹر صاحب خوشی سے گھگھیائے اور زندہ باد کے نعرے سے سارا میدان گونج اٹھا۔ پتہ نہیں یہ زندہ باد کا خالص پنجابی نعرہ اتنے پسماندہ علاقے میں کیسے پہنچ گیا۔

دوسرے دن جب دفتر جا کر میں نے ڈاک دیکھی تو سب سے پہلے میری نگاہ حکومت مغربی پاکستان کے اس حکم نامے پر پڑی جس کی رو سے میرا تبادلہ سیالکوٹ کر دیا گیا تھا۔ بے اختیار جو میری نظر دروازے کی طرف اٹھی تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک ان پڑھ سردار ایک پڑھے لکھے بیوقوف کو قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

ہاں' تو بات ہو رہی تھی فقیر عمر کی۔ یہ شکار والا قصہ تو برسبیل تذکرہ آ گیا تھا۔ فقیر عمر کی ریشہ دوانیاں درون خانہ بڑھتی جا رہی تھی۔ محمد زمان کو تو اس سے پرخاش تھی ہی' لیکن دیگر سردار بھی اس سے نالاں تھے۔ سردار دودا خان کو اس بات کا رنج تھا کہ جس جرگے نے اسے عمر قید کی سزا دی تھی' اس کا یہ بانی رکن تھا۔ سردار رئیسانی اس لیے بیچ پا تھا کہ اس نے رئیسانی قبیلہ کی ایک عورت سے شادی کر لی تھی۔ بہرام خاں اس کو اس لیے خاطر میں نہ لاتا تھا کہ اس کی جہاندیدہ نگاہیں اس کے منطقی انجام پر تھیں۔ عطاء اللہ مینگل نے اسے اتنی اہمیت ہی نہ دی کہ کچھ سمجھنے کی نوبت آتی۔ محمد زمان خان میں اتنا دم خم نہ تھا کہ کھل کر اس کا مقابلہ کرتا۔ قبیلے کے لوگ اس سے خائف رہتے۔ جب محمد زمان خان کی جدوجہد قانونی چارہ جوئی سے آگے نہ بڑھی تو دیگر سرداروں نے قدیم بلوچی نسخہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔

وہ موسم گرما کی ایک سہانی صبح تھی۔ میں دفتر میں بیٹھا ہوا جرگے کے ساتھ ایک مقدمے کی سماعت کر رہا تھا کہ تحصیلدار میر افضل گھبرایا ہوا عدالت میں آیا اور اطلاع دی کی سردار فقیر عمر پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ مقامی سول ہسپتال میں موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مجھے یہ خبر سن کر کوئی خاص حیرانی نہ ہوئی' لیکن پریشانی کا لاحق ہونا قدرتی امر تھا۔ میرے علاقے میں اس قسم کی وارداتوں کا ہونا میرے لیے کوئی نیک شگون نہ تھا' چنانچہ میں نے مقدمے کی سماعت ملتوی کر دی اور تحصیلدار کو لے کر ہسپتال پہنچا ... باہر خاصے لوگ جمع تھے اور پولیس انہیں روکے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ فقیر عمر کی حالت بڑی نازک ہے' اس لیے اسے فوراً کوئٹہ پہنچانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں نے تحصیلدار کو ہدایت کی کہ فوراً کوئٹہ سے ایمبولینس منگوائے اور خود ڈاکٹر کے ہمراہ اندر چلا گیا۔

فقیر عمر کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ خاک اور خون میں غلطاں وہ چارپائی پر نیم بیہوشی کی حالت میں سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ جسم کا

کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر گولی یا چھرے نہ لگے ہوں۔ ناک میں آکسیجن کی ٹیوب لگی ہوئی تھی اور تازہ خون کی بوتل سردار کے جسم میں اتاری جارہی تھی' جسم ساکت تھا' تمام اعضا شل ہو چکے تھے' لیکن آنکھیں... نیم خوابیدہ آنکھوں کی پتلیاں مسلسل گھوم رہی تھیں اور میرا ذہن بھی مسلسل گھوم رہا تھا۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا بیکار تھا۔ میں لیویز کی گارڈ لے کر فوراً جائے وقوع پر پہنچا۔

مستونگ ریلوے سٹیشن سے پانچ میل کے فاصلے پر جو سڑک گزرتی ہے' وہ نوشکی سے ہوتی ہوئی زاہدان تک جا پہنچتی ہے۔ سڑک کے دائیں ہاتھ چلتن کی پہاڑیاں اور بائیں ہاتھ وادی مستونگ شروع ہو جاتی ہے۔ اسی سڑک پر پہاڑی کے دامن میں حملہ آوروں نے مورچہ بندی کی تھی۔ انہیں سردار کی گاڑی کا رنگ' ساخت اور نمبر تک یاد تھا۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ سردار ہر صبح نو بجے کے قریب اپنے گاؤں شیخ واصل سے مستونگ جاتا ہے۔ چنانچہ سڑک کے دائیں اور بائیں' تین جگہ انہوں نے مورچے بنائے تھے۔ نیز ایک آبزرویشن پوسٹ پہاڑی کے اوپر بنا رکھی تھی۔ پوسٹ پر جو آدمی بیٹھا تھا اس کے پاس غالباً دوربین تھی اور وہ دو میل سے ہر آنے والی گاڑی کو شناخت کر سکتا تھا۔ نیچے' ہر مورچے میں دو دو حملہ آور بٹھائے گئے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ اگر فقیر عمر گولیوں کی پہلی باڑ سے بچ جائے تو تین گز پر بیٹھے ہوئے حملہ آوروں کی زد میں رہے۔ جب ہم جائے وقوع پر پہنچے تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ گولیوں کے خالی خول اور سگریٹ کے ٹکڑے ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ ادھر ادھر سے پتھر جمع کر کے باقاعدہ مورچہ بندی کی گئی تھی' نیز ہر مورچے کے اندر جلے ہوئے پتھر بھی' پڑے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ حملہ آوروں نے رات انہی مورچوں میں گزاری تھی۔ فقیر عمر کا زندہ بچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ دراصل ہوا یوں کہ جب پہلی گولی گاڑی کی ونڈ سکرین چیرتی ہوئی اندر آئی تو سردار نے بجائے گاڑی بھگانے کے' کھڑی کر لی اور گولیوں کی بوچھاڑ میں کار کا دروازہ کھول کر باہر ایک کھائی میں کود گیا اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ کچھ دیر تک دونوں اطراف سے فائرنگ ہوتی رہی لیکن چونکہ سڑک پر اب اکا دکا ٹریفک چلنی شروع ہو گئی تھی' اس لیے حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے۔ سراغی ہمارے ساتھ تھے' ہمیں حملہ آوروں کے پاؤں کا سراغ لگانے میں کچھ خاص دشواری نہ ہوئی۔ انہوں نے چلتن پہاڑ عموداً عبور کیا تھا اور پھر دائیں جانب گھوم کر کول پور سے ہوتے ہوئے' کچھی کی جانب بھاگ گئے تھے۔ غالباً وہ اس شخص کی پناہ حاصل کرنا چاہتے تھے جس سے انہیں اس کام کے لیے مامور کیا تھا۔ پندرہ دن کی انتھک کوشش کے بعد آخر ہم نے ان کو اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ بس میں بیٹھ کر جھلوان جا رہے تھے۔

نواب عبدالقادر شہوانی

ساراوان کے ایک اور سردار نواب شاہوانی کا ذکر نہ کرنا یقیناً تاریخ سے بے انصافی ہوگی۔ ہر چند شاہوانی قبیلہ ساراوان کے

بڑے قبیلوں میں شمار ہوتا ہے اور کسی زمانے میں نہایت طاقتور قبیلہ سمجھا جاتا تھا' لیکن کچھ تو مرور زمانہ کے ہاتھوں اور کچھ باہمی رقابتوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بڑی حد تک کمزور ہو چکا ہے۔ اس کے بے اثر اور کمزور ہونے میں اس کے سردار نواب عبدالقادر شہوانی کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ نواب شہوانی سے میری ملاقات اس وقت ہوئے جب میں نے ساراوان سب ڈویژن کا چارج لیا۔ جب میرے چپڑاسی نے مجھے بتایا کہ نواب عبدالقادر شہوانی ملنے آئے ہیں تو پہلا تاثر جو میرے ذہن نے قبول کیا' یہ تھا کہ یہ بھی کوئی نواب کالاباغ قسم کی شے ہوں گے۔ جب نواب صاحب اندر تشریف لائے تو شکوک وشبہات کے باوجود میں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ اٹھتا ہوا قد' بیٹھتی ہوئی آواز' بھیگی ہوئی مونچھیں' گدلائی ہوئی آنکھیں' کملائی ہوئی رنگت' سکڑتی ہوئی واسکٹ' اکڑی ہوئی گردن۔ یہ نواب شہوانی تھے۔ ''السلام علیکم'' نواب صاحب نے اپنا عصا بائیں ہاتھ میں تھام کر دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔ یہ نواب صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

نواب مذکور طبعاً اچھا انسان ہے' لیکن کچھ تعلیم کی کمی کی وجہ سے' کچھ روایتی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اس کی ساری زندگی ناکامیوں سے عبارت ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ نواب مذکور کسی نہایت اہم کام کے سلسلے میں کسی افسر کو ملنے گیا اور وہاں جا کر پتہ چلا کہ اس کے قبیلے کا کوئی دوسرا آدمی بھی اندر بیٹھا ہوا ہے تو باہر ہی سے واپس آ گیا مبادا اس کے قبیلے کے شخص کو اس کی ہمسری حاصل ہو جائے۔ اگر کسی دوسرے قبیلے کے شخص نے شہوانی قبیلے کی عورت سے شادی کر لی تو نواب صاحب نے تمام عمر کے لیے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اگر کسی افسر نے بھول کر بھی ملاقات پر ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے تمام مروجہ بلوچی الفاظ استعمال نہ کیے تو نواب صاحب نے پلٹ کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔

ایک دفعہ مجھ سے بھی ایسے سخت ناراض ہوئے کہ چھ ماہ تک اپنا وظیفہ لینے بھی نہ آئے۔ میں نے کئی پیغامات بھجوائے لیکن انہوں نے کہا کہ ناظم صاحب کو بولو کہ بھوکا مرجاؤں گا' لیکن وظیفہ لینے نہیں آؤں گا۔ دراصل بات کچھ ایسی بڑی نہ تھی کہ نواب صاحب اس کو سینے سے لگائے چل بستے۔ ایک دفعہ جرگہ ایک قتل کے مقدمے کی سماعت کر رہا تھا کہ نواب صاحب تشریف لائے اور مصر ہوئے کہ ملزم کو ہر صورت سزا ملنی چاہیے۔ مقتول' شاہوانی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور پنشن یافتہ فوجی تھا۔ استغاثے کی کہانی کے مطابق مقتول نے ملزم کے باپ کو بیس سال قبل دن دہاڑے گاؤں میں قتل کر دیا تھا' لیکن بااثر ہونے کی وجہ سے بچ نکلا تھا' چونکہ ملزم اس وقت شیر خوار تھا' اس لیے بیس سال تک اس کی بیوہ ماں اپنے خاوند کے سوگ میں سلگتی رہی اور جب ملزم جوان ہوا تو ماں نے اسے تمام واقعہ بتایا تو ملزم نے اشتعال میں آ کر مقتول کو شام کے وقت قتل کر دیا۔ ہم نے نواب صاحب کو سمجھایا کہ اول تو اس واقعہ کا کوئی عینی گواہ

موجود نہ تھا' نیز ان کا اس طرح فوجداری مقدمات میں دخل دینا نہ صرف نامناسب تھا بلکہ ایک حد تک جرم بھی تھا۔ بس اتنی سی بات پر نواب صاحب ناراض ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اگر میں دخل نہ دوں تو میری سرداری کون مانے گا۔ میں اس واقعہ کو بھول بھلا بیٹھا تھا کہ چھ ماہ بعد ایک دن خلاف توقع نواب صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے انہیں عزت سے بٹھایا اور چپڑاسی کو چائے لانے کے لیے کہا۔ نواب صاحب اس کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بولے۔ ''ناظم صاحب! اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خفا نہیں ہونا چاہیے'' میں نے مسکراتے ہوئے چپڑاسی کو پھر اشارہ کیا۔ ''صاحب! آپ اسے چھوٹی بات کہتے ہیں' میری بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔'' نواب صاحب کسمسائے۔ ''اس دن جب میں کچہری سے اٹھ کر گورنر نور خان کو ملنے کوئٹہ گیا تو نواب رئیسانی نے مجھے دیکھ کر بائیں مونچھ پر ہاتھ پھیرا تھا۔''

''اس کا کیا مطلب تھا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔ نواب صاحب بولے ''اس کا مطلب بالکل واضح تھا۔ نواب رئیسانی مجھ پر طنز کر رہا تھا کہ میری کچہری میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ صاحب! مجھے بڑا غصہ آیا۔ ہو سکتا تھا بات بڑھ جاتی' لیکن میں نے بڑی مشکل سے غصہ پی لیا۔'' لیکن نواب رئیسانی کو اسی دن کیسے پتہ چل گیا کہ آپ کی سبکی ہوئی ہے؟ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اتفاقاً اس کا ہاتھ مونچھ پر پڑ گیا ہو'' میں بدستور حیران تھا۔ نواب صاحب مونچھوں کو تاؤ دے کر بولے۔ ''ناظم صاحب! آپ ابھی بچے ہیں' ان باتوں کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ بلوچ سردار کی بات صرف ایک بلوچ سردار ہی سمجھ سکتا ہے۔'' میں نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو گیا۔



میر احمد یار خان، خان قلات

خوانین قلات کا ذکر تفصیلی طور پر کیا جا چکا ہے۔ میر احمد یار خان کے کردار و اطوار سے بحث یہاں اس لیے مقصود ہے کہ قلات پر حکمرانی کی جو داغ بیل میر احمد خان اول نے ۱۶۶۶ء میں ڈالی تھی' اس کا خاتمہ میر احمد یار کے ہاتھوں ہوا۔ قیام پاکستان کے وقت میر احمد یار خان قلات تھا۔ خان موصوف کی شخصیت متنازع فیہ ہے' اس لیے ضروری ہے کہ ذاتی وابستگی اور تعصب سے ہٹ کر تاریخی واقعات کو صحیح رخ سے دیکھا جائے۔ خان کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ خان نے قیام پاکستان کے وقت نہایت سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور آخری وقت تک خان کی یہ کوشش رہی کہ قلات کو مملکت خداداد سے الگ رکھا جائے۔ خان قلات نے اس کے برعکس اپنی سوانح حیات میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کے قیام میں اس نے بڑی قربانیاں دی ہیں اور اگر وہ قائد اعظم کا دست راست نہ تھا "راست روی" بہر حال اس کا مسلک رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ بلوچستان میں برطانوی اثر و رسوخ نے خوانین کے اقتدار کو بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ ۱۸۷۶ء میں سر رابرٹ سنڈیمن نے پوری کر دی۔ بلوچ سرداروں کو داخلی طور پر خود مختاری مل گئی اور جھگڑے کی صورت میں سرکار برطانیہ کو منصف تسلیم کر لیا گیا' لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود یہ سمجھنا کہ خوانین بالکل بے اثر ہو کر رہ گئے تھے' بہت بڑی غلطی ہو گی۔ ہر چند سردار داخلی طور پر خود مختار ہو گئے تھے' لیکن ان کی تمام وفاداریاں اور ہمدردیاں خان قلات کے ساتھ تھیں۔ سالہا سال کی حکمرانی اور قرب نے ایک جذباتی وابستگی پیدا کر دی تھی اور چونکہ خطرہ ہمیشہ باہر سے لاحق ہوتا تھا' اس لیے داخلی اتحاد ایک ایسی مجبوری تھی جسے ہر بلوچ سردار اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا اور اس سے زیادہ خان کے ذاتی اثر کی مثال نہیں دی جا سکتی۔

کہتے ہیں ایک بروہی قلات گیا اور شومئی قسمت سے خان نے اسے شرف باریابی بخشا۔ واپسی پر گاؤں میں وہ تین دن تک منمناتا رہا اور اہل دیہہ سے بات نہ کی۔ چوتھے دن جب احباب نے بہت مجبور کیا تو اس نے زبان کھولی۔ استفسار پر اس نے بتایا کہ جس زبان سے اس نے خان قلات سے بات کی ہے' اس زبان سے وہ ایک عام آدمی سے کیسے بات کر سکتا تھا۔ تقسیم کے بعد جو واقعات رونما ہوئے انہیں خان قلات کی زبانی سنیئے۔

"تقسیم کے بعد پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو حکومت قلات نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ میں نے وزیر اعظم قلات کی سرکردگی میں ایک وفد کراچی بھیجا تاکہ ایک باعزت سمجھوتہ ہو سکے اور پاکستان کی بحیثیت ایک دوست مدد کی جا سکے۔ اس وفد کی ملاقات کے

بعد قائداعظم نے مجھے کراچی آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ میں اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائداعظم کو ملنے کراچی گیا۔ رسمی آؤ بھگت کے بعد قائداعظم نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی ریاست قلات کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر دوں۔ میں نے اصولی طور پر اس تجویز سے اتفاق کیا' لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی مجبوری ظاہر کی کہ بغیر بلوچ قوم سے مشورہ کئے میں از خود کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ میں واپس قلات پہنچا اور فوراً بلوچ جرگے' دار العلوم اور دار الامراء کو طلب کیا اور ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی' لیکن دونوں جرگے مصر ہوئے کہ قلات کا پاکستان کے ساتھ الحاق' ایکٹ آزادی ۱۹۴۷ء کے منافی ہے' اس لیے اس کو کسی صورت میں بھی قابل عمل نہیں ہونا چاہیے۔ قلات کی پارلیمنٹ کا یہ فیصلہ حکومت پاکستان کے دفتر خارجہ کو پہنچا دیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد قائداعظم سبی تشریف لائے اور مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں قلات کو پاکستان میں ضم کرنے کا اعلان کر دوں۔ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں نے قائداعظم کو بتایا کہ میرے ذاتی اصرار بلوچ جرگہ مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ قلات کو پاکستان کے ساتھ ضم کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔

۱۔ کوئی قانون بلوچ رسم ورواج کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔

۲۔ الحاق کے وقت تمام بلوچ سردار ہوں گے۔

۳۔ قائداعظم اور حکومت پاکستان ایک بیان جاری کریں گے جس میں بلوچ قوم اور خان اعظم کی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔

۴۔ آخر میں قائداعظم بلوچ سرداروں سے خطاب کریں گے اور ان کی قربانیوں کا اعتراف کریں گے۔

مندرجہ بالا شرائط پیش کرتے ہوئے میں نے قائداعظم کو بتایا کہ بلوچ قوم عزت نفس کو ہر چیز پر فائق سمجھتی ہے' اس لیے ضروری ہے' کہ ان نفسیاتی اقدار کو سراہا جائے۔ اس کے ساتھ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ اے جی جی (جو ایک انگریز تھا) بلوچ سرداروں کو آمادہ کرے کہ وہ بغیر کسی حیل وحجت کے الحاق قبول کریں چنانچہ میں شام کو اپنے کیمپ ڈھاڈر واپس آ گیا۔ آتی دفعہ یہ طے پایا کہ اگلے دن پھر ملاقات کی جائے۔ بدقسمتی سے میں اگلے دن بیمار پڑ گیا اور حسب وعدہ قائداعظم سے ملاقات نہ کر سکا۔ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے' انہیں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند بنیادی حقائق کو پیش نظر رکھا جائے۔

''میرا قائداعظم کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں رابطہ قائم ہوا تھا جو ۱۹۴۸ء میں ان کی وفات تک جاری رہا۔ اس گہرے رابطے نے ہمیں ایک دوسرے کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد دی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ بدقسمتی سے تقسیم کے بعد قائداعظم ایسے لوگوں میں گھر گئے جو نوزائیدہ مملکت کے متعلق نیک خواہشات نہ رکھتے تھے۔ ان کالی بھیڑوں میں اے جی جی' کرنل ایس بی شاہ اور میرے وزیراعظم کے نام سرفہرست ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے مخالف تھے' کیونکہ ان کے دلوں

میں انڈین نیشنل کانگریس بسی تھی۔ اب جبکہ پاکستان ایک حقیقت کی صورت میں معرض وجود میں آ گیا تھا' ان بے ضمیر لوگوں نے دوہرا کردار کرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف انہوں نے سرداروں کو ورغلایا کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق نہ کریں اور دوسری طرف قائد اعظم کے کان بھرے کہ میں الحاق کا مخالف ہوں۔ اس ضمن میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا:

''جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ میں بیماری کی وجہ سے قائد اعظم کو دوسرے دن نہ مل سکا۔ کرنل ایس بی شاہ مجھے ملنے ڈھاڈر آیا' کیونکہ میں اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ اس کی سوچ کے قافلے کن راہوں پر گامزن ہیں' اس لیے میں نے شدید علالت کے باوجود اسے ملنے کی ذلت گوارا کر لی۔ دوران بحث میں نے کوشش کی کہ اس کی سوچ کو قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکوں۔ دوسرے دن کرنل شاہ نے مجھے ایک خط لکھا کہ قائد اعظم کے حکم کے مطابق وہ مجھے ملنے آیا تھا۔ اور اس نے قائد اعظم کو بتا دیا ہے کہ میں آخر کار قلات کو پاکستان میں ضم کرنے پر راضی ہو گیا ہوں۔ اس کے بعد قائد اعظم نے الحاق کے مسئلے کو کیبنٹ کے سپرد کر دیا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کیبنٹ کے افراد نا تجربہ کار تھے اور بلوچ قوم کی نسل اور تاریخی حقائق سے ناآشنا تھے۔

قائد اعظم تیس سال کی محنت اور کاوش سے نڈھال ہو چکے تھے۔ بیماری اور بڑھاپے کے سائے ان کی شخصیت پر پڑنے شروع ہو گئے تھے اور انہیں مکمل آرام کی ضرورت تھی۔ ان کے نائبین نا اہل تھے' اس لیے بلوچستان کی گتھی کو سلجھانے کی بجائے مزید الجھا دیا گیا۔ ہر چند میں نے اپنے ذاتی اثر اور رسوخ سے بلوچ قوم کو الحاق کے مسئلہ پر راضی کر لیا تھا اور اس کی اطلاع میں نے حکومت پاکستان کو بھی دے دی' لیکن نا اہل مشیروں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ وہ پنج صد سالہ ریاست کا شیرازہ بکھیرنے پر مصر تھے اور بلوچ قوم کو سیاسی طور پر مفلوج کر دینا چاہتے تھے۔ خاران' بیلہ اور مکران کو الگ ریاستوں کا درجہ دینے کا فیصلہ اس منصوبے کی پہلی کڑی تھی۔ جلد بازی میں کئے گئے یہ اقدامات نہ صرف احمقانہ تھے بلکہ غیر قانونی بھی۔ ان اقدامات سے بلوچ قوم میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی اور چند سرداروں نے بغاوت کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں آل انڈیا ریڈیو نے ۲۷ مارچ کو ایک ایسی خبر دی جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ریڈیو نے اعلان کیا کہ دو ماہ قبل میں نے ہندوستان سے الحاق کرنے کی درخواست کی تھی' لیکن ہندوستان نے مخصوص جغرافیائی وجوہات کی بنا پر اسے قبول نہ کیا۔ یہ خبر نہ صرف جھوٹ کا پلندہ تھی' بلکہ اس سے نوزائیدہ مملکت کے لیے خطرات پیدا ہو گئے۔ افغانستان نے پاکستان کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کر لیا۔ ہندوستان نے حیدر آباد (دکن) پر حملہ کر دیا۔ مہاراجہ کشمیر نے ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کر دیا۔ حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ ریاست میں پاکستان کے متعلق نفرت اور کدورت کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس صورت حال سے خاصا پریشان تھا' کیونکہ پاکستان مجھے بے حد عزیز تھا اور اس کو میں برصغیر میں اسلام کا قلعہ سمجھتا تھا۔ تصادم ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ حکومت پاکستان نے کوئٹہ میں فوج کو ''الرٹ'' کر دیا۔ اے جی جی پولیس ایکشن کی

تیاری کرنے لگا۔ ادھر پاکستان بیرونی خطرات میں گھر گیا۔ کشمیر میں جھڑپیں شروع ہو گئیں اور افغانستان نے پختونستان کا شوشہ چھوڑ دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور روس نے اپنی حریصانہ نگاہیں گوادر پر گاڑ دیں۔ چونکہ ان حالات میں پاکستان کی سالمیت خطرے میں تھی' اس لیے مزید سوچ بچار کا موقع نہ تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ فیصلہ کن قدم اٹھایا جائے۔ چنانچہ میں نے بلوچ جرگے کی پیشگی منظوری کے بغیر ۳۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ اس طرح میں نے نہ صرف نوزائیدہ مملکت کو خطرے سے نکال باہر کیا بلکہ اسے روس' ہندوستان اور افغانستان کی تثلیث سے بھی بچا لیا۔''

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

ان حکایات خونچکاں میں بشری کمزوریاں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ ایک غلطی کو چھپانے کے لیے اکثر بے شمار غلطیوں کا مرتکب ہونا پڑتا ہے۔ ایک جھوٹ کی کوکھ سے ہزار غلط بیانیاں جنم لیتی ہیں۔ ہوس اقتدار اخلاقی قدروں کو پامال کر دیتی ہے۔ شوق جہانبانی میں جام صداقت چکنا چور ہو جاتا ہے۔ حسرتوں کے گھپ اندھیرے مزار میں سچائی کا کوئی چراغ روشن نہیں ہوتا۔ اندھے جذبات کی رو میں بہتے بہتے بعض دفعہ انسان بدرووں میں جا نکلتا ہے۔ ایک والی ریاست کا اقتدار سے محروم ہونے پر ملول ہونا قدرتی امر ہے۔ جاہ وحشم اور منصب واقتدار جس شخص کو پشت ہا پشت سے ورثہ میں ملے ہوں۔ وہ ان کے چلے جانے کے بعد یقیناً کف افسوس ملے گا' لیکن خان قلات ہی وہ واحد حکمران نہیں تھا جسے اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ خان سے بھی بڑے راجے مہاراجے اقتدار سے ہٹائے گئے لیکن انہوں نے کوئی ایسی اضطراری حرکت نہ کی جس سے ٹھوس تاریخی حقائق مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ قائداعظم کے متعلق خان نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے' ان میں یقیناً صداقت نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ قائداعظم کے مشیر پاکستان کے دشمن تھے اور بے ضمیر تھے' درحقیقت معمار پاکستان کی شخصیت پر بالواسطہ حملہ ہے۔ جس شخص کی تمام زندگی عزم' سچ' ہمت' خلوص اور لگن سے عبارت ہو' جس شخص نے تن تنہا ایک بکھری ہوئی قوم کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا ہو' جس عظیم انسان کی زندگی کا مشن اسلام اور پاکستان کا قیام ہو' جس کی سیاسی بصیرت کے معترف اس کے دشمن تک ہوں' وہ بھلا اپنے مشیروں کے انتخاب میں اس قدر غلطی کیسے کر سکتا تھا؟ جو شخص قیام پاکستان کے بعد بھی انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت کرنے اور اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے وہ یقیناً غدار ہے۔ قائداعظم ایک غدار کو کیسے اپنا مشیر خاص بنا سکتے تھے۔ جس شخص کی تمام زندگی شاطر انگریزوں اور متعصب ہندوؤں کے ذہن پڑھنے میں گزری ہو' کیا وہ اپنے مشیروں کی واردات قلب نہیں جان سکتا؟ قائداعظم کی کابینہ میں ایسے وزراء شامل تھے جنہوں نے تحریک آزادی میں اپنی عمر عزیز کا ایک نادر حصہ صرف کیا تھا اور اپنے قائد کی قیادت میں بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ کیا ان سب کی بصیرت اجتماعی خان کی بصیرت سے ٹکر نہ کھاتی تھی؟

خان قلات کی خودنوشت سوانح عمری کا سرسری مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ کان تضاد بیانی کا شکار ہے۔ حقائق کو جس طرح مسخ کیا گیا ہے اور ان کی بنیاد پر خان موصوف نے جو منطقی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے' وہ اپنی ویرانی پر خود مرثیہ خواں ہے۔ قیام پاکستان کے نوماہ تک خان ذہنی خلفشار کا شکار رہا اور کسی نہ کسی طرح کوشش کرتا رہا کہ ریاست الحاق سے بچ جائے۔ اگر بلوچ جرگہ نے خان کو الحاق کا اختیار دے دیا تھا اور اس کا برملا اظہار خان نے بی بی میں قائداعظم سے ملاقات پر کر دیا تھا تو پھر کیا بیماری کا بہانہ ضروری تھا؟ اس قسم کی بیماریاں سیاست کے میدان میں عام ہیں۔ جو شرائط بلوچ جرگے نے پیش کی تھیں' وہ کوئی ایسی کڑی نہ تھیں جو نا قابل عمل ہوتیں۔ درحقیقت کوئی بھی ٹھوس شرط پیش نہ کی گئی تھی۔ بلوچ قوم کے کردار کی تعریف بہر صورت ہوئی تھی اور اس میں بانی پاکستان کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟ آخر میں خان موصوف کا یہ کہنا کہ میں نے بلوچ جرگے کی پیشگی منظوری کے بغیر اعلان الحاق کر دیا' سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں شاید خان موصوف کی سمجھ میں آ جائیں' ایک عام قاری نہیں سمجھ سکتا۔ خان قلات نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بزعم خود پاکستان کو بچانے کا سہرا بھی اپنے سر پر سجا لیا ہے۔ اگر پاکستان کا اتنا ہی خیال تھا تو خان اپنی پہلی ملاقات ہی میں اپنی ذاتی حیثیت سے الحاق کا اعلان کر دیتا جس طرح بعد میں بلوچ جرگے نے خان موصوف کو معاف کر دیا' پہلے بھی معاف کر دیتا۔ دراصل خان نے ریاست کا الحاق بہ امر مجبوری کیا' کیونکہ بقول خان موصوف ''پولیس ایکشن'' ہونے والا تھا اور قلات کی تین ریاستیں خاران' مکران اور لسبیلہ اس سے کٹ کر آزادانہ حیثیت میں پہلے ہی پاکستان سے الحاق کر چکی تھیں۔

قلات ڈویژن کی انتظامی تقسیم

قلات ڈویژن کو انتظامی نقطہ نظر سے دو علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ''اے ایریا'' اور ''بی ایریا''۔ اے ایریا' میں پولیس کی عملداری ہے اور ''بی'' میں انتظامیہ کا براہ راست عمل دخل ہے۔ منظم پولیس کے اختیارات سکڑ کر میونسپل حدود تک محدود ہو گئے ہیں اور انتظامیہ کا دائرہ کار سنگلاخ چٹانوں اور سربفلک پہاڑوں تک پھیلا دیا گیا ہے۔ اگر کوئی ایسا جرم میونسپل حدود میں ہو جائے جس کی سزا تعزیرات پاکستان میں درج ہو تو تفتیش پولیس کرتی ہے اور جرم میونسپل حدود سے باہر سرزد ہو تو لیویز تفتیش کرتی ہے۔ اس میں قباحت یہ ہے کہ وہ تفتیش کے فنی پہلوؤں سے اکثر نا آشنا ہوتے ہیں اور بااثر اشخاص پر ہاتھ ڈالنے سے پیشتر کئی مرتبہ سوچے گا۔ ایک مینگل' ایک مینگل کو گرفتار کرنے سے حتی الوسع گریز کرے گا... اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سردار فقیر عمر پر جب قاتلانہ حملہ ہوا تو خاصی بھاگ دوڑ کے بعد حملہ آور گرفتار کر لیے گئے۔ دوران تفتیش انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ سردار رئیسانی کے ایما پر فقیر عمر کو قتل کرنے آئے تھے... اب عام حالات میں سردار رئیسانی کو گرفتار کر لیا جاتا' لیکن عملے نے اسے پکڑنے کے بجائے ہر بات سے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد کے واقعات تفصیل طلب ہیں' لیکن اس موقع پر انہیں بیان کرنا

مناسب نہ ہوگا۔ بایں ہمہ جرم کا سراغ لگانے میں یہ عملہ ید طولیٰ رکھتا ہے' صرف پاؤں کے نشانات دیکھ کر سراغی بتا سکتا ہے کہ مجرم کس قماش کا آدمی ہے' اس کی معاشرتی حیثیت کیا ہے اور کون سے قبیلے کا فرد ہے۔ پھر پاؤں کے نشانات کو چلا کر مجرم کو پکڑنا یا اس کی نشاندہی کرنا بھی ان کے لیے بہت سہل ہے۔ پولیس عام حالات میں یہ کام نہیں کر سکتی۔

مستونگ سب ڈویژن رقبے کے لحاظ سے ہالینڈ کے برابر ہوگا' لیکن آبادی بہت کم ہے۔ پھر سارا علاقہ سرسبز و شاداب بھی نہیں۔ مستونگ شہر' قلات اور چند دیگر علاقوں کو چھوڑ کر باقی تمام زمین بنجر اور غیر آباد ہے۔ سب ڈویژن' کوئٹہ کے عقب میں واقع کوئلے کی کانوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر کوئٹہ کے رخساروں کو چھوتی ہوئی باؤنڈری لائن قلات جا پہنچتی ہے' پھر قلات سے بلند و بالا پہاڑیوں' وادیوں' گھاٹیوں سے پھسلتی' چھلکتی اور مچلتی ہوئی جھالاوان جا پہنچتی ہے۔

بلوچستان کی بیشتر کوئلے کی کانیں مستونگ سب ڈویژن میں ہیں یا اس کے آس پاس۔ کوئٹہ اور کول پور کو اگر دو نقطے قرار دے کر نصف دائرہ کھینچا جائے تو تمام کانیں سمٹ کر اندر آ جاتی ہیں۔ کان کنی بڑا مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ مقامی لوگ ان میں کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ اکثر مزدور صوبہ سرحد سے آتے ہیں۔ ایک اچھے خاصے دل گردے کا آدمی بھی پانچ ہزار فٹ گہری کان میں داخل ہوتے وقت جھجکتا ہے۔ اکثر مزدور دمے اور تپ دق کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے سکونت کے لیے پہاڑوں پر جھونپڑے نما مکان بنا رکھے ہیں جہاں حفظان صحت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا... ایک ہی کمرے میں انسان' بھیڑ بکریاں اور گدھے پر امن بقائے باہمی کے اصول کو زندہ رکھتے ہوئے مرتے ہیں... مائننگ لاز میں مزدوروں کے لیے جن مراعات کا ذکر ہے' اس کی ہوا بھی ان تک نہیں پہنچ پاتی.... ہاٹ واٹر باتھ (گرم پانی سے غسل) ہر کان کن کے لیے ضروری ہے تاکہ اس کی رگوں' نتھنوں' کانوں اور آنکھوں میں گھسے ہوئے کوئلے کے ذرات باہر نکل سکیں' لیکن یہ بے چارہ جب کان سے باہر نکلتا ہے تو غسل تو درکنار' پانی پینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ پٹھان کان کن عجب متلون مزاج ہے' جنسی بے راہروی کا یہ عالم ہے کہ کوئٹہ میں چکلہ ان کے دم قدم سے آباد تھا اور مذہبی جنون کا یہ عالم کہ ایک دفعہ ملحقہ مسجد کے امام سے چند دلالوں کا جھگڑا ہو گیا تو انہوں نے مذہب کی عظمت کی خاطر تمام طوائفوں اور دلالوں کے چہرے مسخ کر دیئے۔

مزدوروں اور مالکوں میں اکثر دنگا فساد ہوتا رہتا ہے۔ محنت اور سرمائے میں یہ کشمکش ایک تاریخی عمل ہے۔ تاریخ یقیناً اپنے آپ کو ان لوگوں کے لیے دہراتی رہتی ہے جو اس سے سبق نہیں سیکھتے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ آج کے بیشتر مالک گزری ہوئی کل کے محنت کش تھے' لیکن سیم وزر کی چمک نے ان کی ہوس کو اور تیز کر دیا ہے۔ ماضی کی ذلتوں کو انہوں نے اپنے ضمیر کے تابوت میں گاڑ دیا ہے۔ یہ

اپنے لب و لہجے، رنگ ڈھنگ اور طمطراق سے یہ تاثر دیتے ہیں جیسے یہ کانیں ان کو مغل شہنشاہوں سے براہ راست ورثے میں ملی ہوں۔ یاد ش بخیر، ملک کے ایک مایہ ناز مائین اونر نے جو آزادی کے وقت خدا جانے کیا تھے، ایک دفعہ بڑی تاریخ ساز تقریر کی تھی۔ یہ غالباً جولائی ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے۔ موصوف قومی اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے اور موضوع سخن چاہے کچھ بھی ہو، ہر تان صدر ایوب خاں سے ملاقات پر توڑتے تھے۔ ان دونوں یحییٰ خاں کا مارشل لا تازہ تازہ لگا تھا اور مزدوروں کی ہڑتال نے کچھ ایسی نازک صورت حال اختیار کر لی تھی کہ فوجی حکام کی مداخلت ناگزیر ہوگئی۔ جنرل نوازش مرحوم نے مجھے اور کرنل ملک لال خاں کو یہ ہدایت کی کہ فریقین کو بلا کر افہام و تفہیم کے ذریعے مسئلہ حل کیا جائے۔ کرنل لال خاں کی صدارت میں ڈی سی کے کورٹ روم میں مزدوروں اور مالکوں کی مشترکہ کانفرنس بلائی گئی اور یہی وہ موقع تھا جہاں موصوف نے ان پڑھ ہونے کے باوجود تقریر کے جوہر دکھائے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے منطق کی بیساکھیاں استعمال کیں اور فرمانے لگے۔ ''مزدوروں کا اجرت بڑھانے کا مطالبہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اگر انہیں ہماری عملی مشکلات کا رائی بھر بھی اندازہ ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اجرتوں کا مطالبہ چھوڑ کر ہمارے لیے ایک ویلفیئر فنڈ قائم کر دیں۔ ان کا کیا ہے، یہ صبح کام پر آتے ہیں اور شام کو پیسے جیب میں ڈالے اور پھر چھٹی۔ آندھی آئے، طوفان آئیں، زلزلے ہر چیز کو تہس نہس کر دیں، انہیں اس سے کچھ سروکار نہیں.... اور ایک ہم ہیں کہ۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مزدوروں کی تنخواہیں وقت پر نہ ملیں تو ہڑتال کی دھمکیاں، اگر بجلی فیل ہونے سے ڈی واٹرنگ پمپ کام کرنا چھوڑ دیں تو کانوں کے بیٹھ جانے کا خطرہ، اگر بنک قرض دینے میں پس و پیش کریں تو سارا کاروبار چوپٹ... کبھی کوئلہ ہے تو ویگنیں نہیں ملتیں، ویگنیں مل جائیں تو کوئلہ نکلنا بند ہو جاتا ہے۔ سڑکیں ہم بنوائیں، ہسپتال اور ڈسپنسریاں ہم کھولیں، ان کی زندگی موت کے ہم ذمے دار ہیں، سو روگ ہم نے پال رکھے ہیں، ان کو کیا غم ہے؟'' اس کے بعد اپنی تقریر کا ردعمل جاننے کے لیے انہوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سامعین پر ڈالی، پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے'' کرنل صاحب! آپ خود روشن ضمیر ہیں۔ اگر یہ مزدور ہیں تو ہم بھی مزدور ہیں۔ اگر یہ جسمانی مزدوری کرتے ہیں تو ہم ذہنی مزدوری کرتے ہیں۔ اگر ان کے شام تک اعضا شل ہو جاتے ہیں تو ہمارا دماغ بھی چکرانے لگتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر یہ ایک کمرے کے مکان میں رہتے ہیں تو ہو سکتا ہے ہم دو تین کمروں کے مکان میں سکونت رکھتے ہوں۔ اگر یہ روکھی سوکھی کھاتے ہیں تو ہم شاید چپڑی ہوئی کھا لیتے ہوں گے۔ محنت کے اس نئے رشتے سے جو ابھی ہمارے درمیان قائم ہوا ہے، کیا میں حق بجانب نہیں ہوں کہ اپنے مزدور بھائیوں سے چند مطالبات کروں؟'' موصوف غالباً اپنے مطالبات کی

فہرست نکالنے والے تھے کہ کرنل صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ وہ اسمبلی میں نہیں' بلکہ ٹریبونل کے سامنے کھڑے ہیں۔

جواب آں غزل کے طور پر ایک مزدور لیڈر گجا خاں کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میر صاحب! آپ نے آج آجر اور اجیر کے جس نئے رشتے سے ہمیں روشناس کرایا ہے' اس کے بعد ہم مزدور اپنے تمام مطالبات سے فی الفور دستبردار ہوتے ہیں... وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔" صرف ایک شرط ہے کہ آپ اپنے کچھ غم ہمیں دے دیں اور ہماری ساری خوشیوں کو اپنا لیں۔ ہماری اب آپ سے ایک ہی درخواست ہے کہ آپ مہینے میں ایک دن... صرف ایک دن ہماری پاس بطور مہمان ٹھہرا کریں تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ ہم کس قدر خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔" شدت جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی۔ "اگر ہمارا مزدور بیماری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دے یا کان کے حادثے میں ہلاک ہو جائے تو اس کی میت کو اپنے وطن کی خاک میں دفن ہونے کے لیے ٹرک نہیں ملتا۔ اگر آپ کا کتا بھی بیمار ہو جائے تو اس کے علاج کے لیے سارا اسپتال پہنچ جاتا ہے۔" بات چونکہ ناخوشگوار ماحول کی طرف بڑھ رہی تھی' اس لیے کرنل صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ مالکوں اور مزدوروں کے اختلافات اور جھگڑے روز کے معمولات تھے' لیکن مارشل لاء سے قبل ان میں کچھ زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ ہر دو فریق اپنے اپنے موقف پر سختی سے ڈٹ گئے ...شاید افہام و تفہیم سے کوئی مصالحت کا راستہ نکل آتا' لیکن مارشل لاء کے نفاذ کو مالکان نے تائید ایزدی جانا۔ چونکہ ہڑتالیں ممنوع قرار دے دی گئی تھیں' اس لیے انہوں نے مزدوروں کے ساتھ بات چیت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ نتیجتاً مزدوروں نے نہ صرف کام بند کر دیا بلکہ تمام گاڑیوں کو پہاڑ پر ہی روک لیا اور مالکوں کے جو کارندے ڈی واٹرنگ پمپ چلانے گئے تھے' ان کو بھی مار بھگایا۔ گہری کانوں سے پانی نکالنے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے اور اگر چند دن کے لیے پانی نکلنا بند ہو جائے تو پوری کان کے بیٹھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کان کا بیٹھ جانا انفرادی نقصان کے علاوہ قومی دولت کے ضیاع کا بھی موجب بن سکتا ہے' لہٰذا ان حالات میں انتظامیہ کی مداخلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔

مزدور عملاً سنجدی اور ڈگاری کے علاوہ دیگر ملحقہ کانوں پر بھی قابض تھے اور نوبت چونکہ فاقہ کشی تک پہنچ چکی تھی' اس لیے اکا دکا توڑ پھوڑ کے واقعات بھی رونما ہونے لگے۔ کرنل ملک لال خاں اور میں جب فوج کا ایک دستہ لے کر ڈگاری پہنچے تو صورت حال خاصی مخدوش تھی۔ مزدوروں نے نہ صرف پہاڑ سے نیچے اترنے سے انکار کر دیا بلکہ نعرے بازی شروع کر دی۔ وہ مارشل لاء سے قطعاً خائف نہ تھے۔ دراصل کسی نے ان کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ مارشل لاء کا نفاذ شہروں تک محدود ہوتا ہے اور اس کا عمل دخل پہاڑوں پر نہیں ہوتا... ان دنوں فوج کے پاس چینی ساخت کی نسبتاً چھوٹی رائفلیں ہوا کرتی تھیں۔ کسی منچلے نے یہ افواہ بھی اڑا دی کہ یہ پٹاخوں والی بندوقیں ہیں جو صرف ڈرانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں... اب ہمارے لیے دو راستے تھے' ایک تو یہ کہ

راست اقدام کیا جائے۔ اس صورت میں انہیں سرنگوں تو کیا جا سکتا تھا' لیکن انسانی جانوں کا ضائع ہونا لازمی امر تھا' پھر اس قسم کے جھٹکے' مسائل کا مستقل حل بھی نہیں ہوتے۔ دوسرا غیر روایتی راستہ گفت وشنید کا تھا' جو کٹھن اور لمبا ضرور تھا لیکن سلامتی کا نشان تھا۔ ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اشتعال انگیز نعرے بازی ہمیں پریشان نہیں کر رہی تھی۔ مالکوں کی مسلسل انگیخت کو بھی ہم نے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ نہتے اور ناسمجھ لوگوں پر ایک دم طاقت کا استعمال کسی طرح بھی جائز نہ ہوگا' چنانچہ بات چیت ہی کو ہم نے سب سے بڑا ہتھیار سمجھا اور یہ ہتھیار خاصا موثر ثابت ہوا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مورچہ سر ہو جاتا۔ اگر آج سیف اللہ پراچہ کی کان پر دعائے خیر پڑھی جا رہی ہے تو کل ابراہیم بلوچ کی دکان پر مزدور اور انتظامیہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا' تھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کرنل صاحب تو خیر اس قسم کی زندگی کے عادی تھے۔ صبح پانچ بجے میں کوئٹہ پہنچتا' کرنل صاحب کو لے کر ہم پہاڑ پر پہنچتے اور پھر رات بارہ بجے تک بغیر کھانا کھائے کام کرتے۔ کرنل صاحب تھرماس میں چائے اور کچھ بسکٹ ساتھ لے آتے اور یہی ہمارا لنچ اور ڈنر ہوتا۔

دسویں محرم کو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ جمعے کو ایک دن ریسٹ کی جائے۔ ویسے بھی سوائے ''یونائیٹڈ منرل'' کے باقی تمام کانوں پر کام شروع ہو چکا تھا۔ میں اس صبح ذرا دیر سے اٹھا اور باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ کمشنر صاحب کا ڈرائیور آن پہنچا' کمشنر صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ میں جب ڈرائیور کے ساتھ شاہی باغ پہنچا تو راجہ صاحب بیتابی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''مزدوروں اور فوجی دستے میں جھڑپ ہوگئی ہے' کچھ مزدور مارے گئے ہیں۔ تم فوراً موقع پر پہنچو... تاسف کی ایک لہر میرے اندر اٹھی۔ کاش! میں اور کرنل لال آج چھٹی نہ کرتے۔ پہاڑ پر پہنچنے سے قبل میں نے مناسب سمجھا کہ مالکوں سے بات کی جائے۔ جب میں کوئٹہ پہنچا تو تمام ''مائنیز اونرز'' سیف اللہ پراچہ کے گھر جمع تھے۔ کاکا محمد جان جو یونائیٹڈ منرلز کا مالک تھا' بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی تھی جو اس کی آنکھوں سے مسلسل رواں تھی۔ میں نے سوچا ابھی تک ضمیر آدمیت زندہ ہے۔ مالک اور مزدور کے اختلافات اپنی جگہ' لیکن انسانی جانوں کے ضیاع نے کاکا جان! صبر کرو۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ تمہاری طرح ہمیں بھی مزدوروں کے اس نقصان پر بہت افسوس ہوا ہے۔'' ''صاحب! ہر آدمی کو مزدوروں کے اس نقصان کا تو افسوس ہوا ہے' لیکن میری کوئی نہیں سنتا'' کاکا جان محمد پھٹ پڑا... ''مزدور تو اپنے انجام کو پہنچ گئے لیکن مجھے جیتے جی تباہ کر گئے' باقی مزدور یہ سمجھیں گے کہ گولی میں نے چلوائی ہے اور انتقاماً میری کانوں کو آگ لگا دیں گے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ میں تباہ ہو گیا ہوں!'' کاکا جان نے پھر ڈکرانا شروع کر دیا۔ میں نہ ہی سمجھتا تو بہتر ہوتا۔ کاکا کے الفاظ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر اتر رہے تھے۔ میں نے کاکا کے آنسوؤں سے تر سرخ وسپید چہرے پر نگاہ ڈالی اور پھر بے نور چہرے دیکھنے کے لیے اٹھ کر پہاڑ پر چلا گیا۔

اسی طرح امن عامہ کا مسئلہ بھی مسلسل درد سر بنا ہوا تھا۔ ہر واردات کے پیچھے کوئی نہ کوئی سیاسی محرک ہوتا۔ چونکہ یہ وارداتیں ''بی

ایریا" میں ہوتیں' اس لیے اے سی پر براہ راست ذمے داری عائد ہوتی۔

جب کوئی سنگین واردات ہو جاتی تو اے سی کو ذاتی طور پر مجرموں کی سرکوبی کے لیے جانا پڑتا تھا۔ طریقہ کار یہ تھا کہ یا تو ڈاکوؤں کو پکڑا جائے یا پھر سراغیوں کی مدد سے ان کے رندات (یعنی پاؤں کے نشانات) اپنے علاقے سے باہر نکالے جائیں۔ اس صورت میں دوسرے سب ڈویژن کا ناظم وہاں موجود ہوتا تھا جہاں پر باقاعدہ رندات کی ٹیکنگ اوور اور ہینڈنگ اوور ہوتی۔ ایک روز رات کے گیارہ بجے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو کمشنر صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہنچپہ کے قریب راہزنی کی سنگین واردات ہو گئی ہے اور ہدایت کی کہ میں فوراً موقع پر پہنچوں... رات کو ملیشیا کے دستے دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ لیویز کے پاس موثر ٹرانسپورٹ اور اسلحہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ایس پی کو فون کیا کہ صبح تک ہمیں پولیس کی ایک کمپنی مستعار دی جائے۔ ایس پی نے حامی تو بھر لی' لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ میں احتیاطاً ڈی آئی جی سے کوئٹہ بات کر لوں۔ چنانچہ ڈی آئی جی سے رابطہ قائم کیا اور جب میں دو بجے کے قریب قلات پہنچا تو پولیس کا ایک ٹرک تیار کھڑا تھا۔ رات کا سفر خطرناک تھا کیونکہ ہم کسی وقت بھی مفرور قبائلیوں کے نرغے میں آ سکتے تھے' اس لیے پھونک پھونک کر آگے قدم رکھ رہے تھے۔ تین بجے کے قریب ہم جائے واردات پر پہنچے۔ گھپ اندھیرا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم نے جائے وقوعہ دیکھی۔ جگہ جگہ کرنسی بکھری پڑی تھی۔ ایک جگہ چند گھڑیاں ملیں۔ دراصل ہوا یوں کہ ڈاکوؤں نے جب ٹرک روکے تو کچھ مسافروں نے سراسیمگی کے عالم میں اپنے مبلغات اور دیگر اشیاء زمین پر پھینک دیں تاکہ ڈاکوؤں کی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ موقع پر جا کر ہمیں جو پہلی بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ راہزنی سفر خاں زرکزئی نے کی تھی اور جاتے ہوئے نائب تحصیلدار اورنگ شاہ کو بطور یرغمال ساتھ لے گیا تھا۔ رات کے وقت پہاڑوں کی طرف بڑھنا خودکشی کے مترادف تھا' اس لیے رات موقع پر بیٹھ کر کاٹی اور صبح کو سراغرسانوں کی مدد سے ڈاکوؤں کے پاؤں کے نشانات تلاش کرنے شروع کیے۔ ہمارے ساتھ چار سراغرساں تھے جو استاد مانے جاتے تھے۔ وہ تین چار گھنٹے تک چھڑیاں لے کر ادھر ادھر پھرتے رہے۔ کبھی ہمیں شمال کی طرف لے جاتے کبھی جنوب کو گھوم جاتے۔ پہاڑوں کا طواف کراتے۔ اس طرح انہوں نے ہمیں چلا چلا کر ہلکان کر دیا اور آخر میں اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا۔ تحصیلدار بہار شاہ جو جہاندیدہ افسر تھا اور جس نے اپنی عمر عزیز کا ایک بیشتر حصہ انہی آپریشنز میں گزارا تھا' مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا کہ سراغرساں عمداً رندات کی شناخت سے گریز کر رہے ہیں کیونکہ ڈاکوؤں سے خائف ہیں۔ ان کا کردار مجھے پہلے ہی مشکوک نظر آ رہا تھا۔ تحصیلدار کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی' چنانچہ میں نے تمام سراغرساں کو بلا کر ایک لائن میں کھڑا کیا اور لیویز کے جمعدار کو کہا کہ چار سپاہی رائفلیں لوڈ کر لیں اور اور جب میں "تین"

کہوں تو فائر کردیں۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور گنتی کی نوبت نہ آئی۔ سراغرساں رندات پر چلتے ہوئے ہمیں فاتوگر پہاڑ کی سمت لے گئے۔ اب ہمارے لیے اپنی منزل کا تعین کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری اگلی منزل محمد تاوا ہوگی جو ڈاکوؤں کا مسکن خیال کیا جاتا تھا۔ شام ہوچکی تھی اور بغیر خوراک اور راہبروں کے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ تمام رات جاگ جاگ کر اور دن کو چل چل کر اعضا شل ہوگئے تھے' چنانچہ یہ طے پایا کہ واپس چل کر راشن اکٹھا کیا جائے اور مقامی سرداروں کی مدد سے منظم طریقے پر آگے بڑھا جائے۔

شام کو جب ہم واپس قلات پہنچے تو کمشنر صاحب کا تار منتظر تھا۔ کمشنر صاحب نے ہماری اس طرح واپسی پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ ہم فوراً ڈاکوؤں کی تلاش میں روانہ ہوجائیں اور جب تک ان کو زندہ یا مردہ نہ پکڑ لیں' واپس نہ آئیں۔ یہ صورت حال مایوس کن بھی تھی اور حوصلہ شکن بھی۔ لیکن ان حالات میں موصوف کو تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا قرین مصلحت نہ تھا چنانچہ ہم نے رات کو سولجر داس بنیے سے ایک ماہ کا راشن ادھار لیا' پولیس لائن سے چھاگلیں نکلوائیں' تین چار اونٹ مستعار لیے اور ریٹائرڈ لیفٹیننٹ عبدالکریم ساسولی کی معیت میں رات کو پھر ڈاکوؤں کی تلاش میں پیچھے روانہ ہوگئے۔ میرا سر چکرا رہا تھا لیکن پھر بھی ہم جا رہے تھے' کیونکہ حکم حاکم تھا اور مرگ مفاجات جانے کون سے کونے میں چھپ کر بیٹھی تھی۔ لیفٹیننٹ عبدالکریم رائفل کو ہاتھ میں تھامے زیر لب گنگنا رہا تھا۔

منزل مادو رنیست

جب ہم فاتوگر پہاڑ کے قریب پہنچے تو لیویز کے سپاہی ہمارے منتظر تھے۔ رات کی سیاہی چھٹ گئی تھی۔ سپاہیوں نے لکڑیاں اکٹھی کیں اور آگ جلائی۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ مسعود سکاؤٹس کی کمپنی ایک کپتان کی معیت میں آن پہنچی۔ ہرچند میں نے کمشنر صاحب سے استدعا کی تھی کہ ہمیں سکاؤٹس کی ضرورت نہیں' انہوں نے پھر بھی یہ نوازش ہم پر کردی تھی۔

کپتان صاحب نے پہلے تو کمپنی کو ''فالن'' کیا' پھر شاید حاضری لگائی۔ اس کے بعد ایک ''طویل مختصر'' لیکچر دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ راستہ خطرناک ہے' دشمن چالاک ہے اور سوائے میرے کسی کا حکم نہیں ماننا۔ پہلے تو وہ شاید اس انتظار میں رہے کہ ہم میں سے کوئی ان کے استقبال کے لیے جائے گا پھر سوچ کر خود ہی چلے آئے۔ آتے ہی انہوں نے سوال کر ڈالا ''آپ میں سے ناظم کون ہے؟'' میں نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ پھر بولے ''تحصیلدار کون ہے؟'' میں نے بہار شاہ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہنے لگے۔ ''ناظم اور تحصیلدار میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' میں نے کہا وہی جو ایک میجر اور کپتان میں ہوتا ہے۔ اس رسمی تعارف کے بعد کپتان صاحب نے

نقشہ نکالا اور مجھے فاتوگر پہاڑ کے کنٹورز سمجھانے لگے۔ میں نے گزارش کی کہ نقشہ اپنی جگہ درست ہے لیکن ہمارے ساتھ مقامی آدمی ہیں جن کا خمیر ان پہاڑوں کی مٹی سے اٹھا ہے اور جو یہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں اور جو ایک میل سے سونگھ کر بتا سکتے ہیں کہ دشمن کس سمت میں گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اس لیے آپ نقشہ کو تہہ کر دیں اور ان سے براہ راست گفتگو کریں۔

جب راستے کا تعین ہو گیا تو ایک نئی افتاد آ پڑی۔ کپتان صاحب کے خیال میں اونٹ کم تھے اور اسلحہ زیادہ تھا' اس لیے انہوں نے کہا اور اونٹ مہیا کیے جائیں' ورنہ ہمارے لیے آگے جانا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ اب اس جنگل میں مزید اونٹ پیدا کرنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ ویسے بھی اتنا بھاری اسلحہ لے کر جانا قرین مصلحت نہیں۔ آپ کچھ جوان اور اسلحہ واپس کر دیں اور جو کچھ لاد سکتے ہیں لاد لیں اور جلدی کریں کیونکہ دشمن خاصا آگے نکل چکا ہے۔ کافی ردوکد کے بعد وہ راضی ہوئے۔ مارٹرز اور دیگر سامان خوردونوش اونٹوں پر لادا گیا اور ہمارا قافلہ محمد تاوہ کی طرف روانہ ہوا۔

ہمارا اگلا پڑاؤ مل خرمائی تھا جو فاتوگر سے ۱۵ میل کے فاصلے پر تھا۔ ناہموار اور عمودی پہاڑوں پر چڑھتے چڑھتے پاؤں میں آبلے پڑ گئے' پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ شام تک پانی ختم ہو گیا اور منزل ابھی کوسوں دور۔ خیال تھا کہ راستے میں پانی مل جائے گا' لیکن گزشتہ خشک سالی کی وجہ سے تالاب کا پانی سوکھ گیا تھا۔ پیاس سے سب کا برا حال ہو رہا تھا' بچا کھچا پانی بھی گھونٹ گھونٹ کر کے ختم ہو گیا۔ ایک اونٹ تھک کر گر پڑا۔ شام کے سائے پہاڑ پر پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ کپتان صاحب نے اپنی کمپنی کو پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ لیفٹیننٹ عبدالکریم نے مشورہ دیا کہ رات کے وقت پہاڑ میں رکنا کسی طور مناسب نہیں' کیونکہ اس طرح چاروں طرف سے دشمن کے نرغے میں پھنس جانے کا احتمال ہے۔ ویسے بھی پانی کے بغیر رات کاٹنا کسی صورت ممکن نہ تھا۔ کپتان صاحب مصر تھے کہ چونکہ شام ہو چکی تھی اور رات کے وقت فوج کو نقل و حرکت کا آرڈر نہیں' اس لیے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ چونکہ معاملہ ڈسپلن کا تھا اور ایک سفید ریش لیفٹیننٹ اور جواں سال کپتان میں بحث ہو رہی تھی' اس لیے میں نے مداخلت مناسب نہ سمجھی۔ پتہ نہیں کپتان صاحب کو عبدالکریم کے سفید بالوں پر ترس آ گیا یا ویسے ہی کوئی خیال ذہن میں سما گیا' انہوں نے کمپنی کو کوچ کا حکم دیا۔ سکاوٹس بڑے منظم طریقے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سراغرسانوں نے ڈاکوؤں کے پاؤں کے نشانات کا کھوج لگانا بند کر دیا اور ہم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ رات آٹھ بجے ہم مل خرمائی پہنچ گئے' مل خرمائی کا گاؤں صرف چند مکانوں پر مشتمل ہے' یہاں ایک جوہڑ تھا جس میں بارش کا پانی موجود تھا۔ ہر چند کہ پانی سے تعفن اٹھ رہا تھا اور ہر گھونٹ کے ساتھ مٹی کی ایک اچھی خاصی مقدار حلق سے نیچے اتر جاتی' لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس وقت آب حیات معلوم ہو رہا تھا۔

ہم نے سیر ہو کر پانی پیا اور مشکیزے بھر کر سکاؤٹس کے لیے روانہ کیے جو ہم سے ایک میل پیچھے تھے۔ کپتان صاحب نے پانی ناقابل استعمال قرار دے دیا اور تمام نوجوانوں کو ہدایت دی کہ پانی نہ پیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے پیغام بھیجا کہ صاف پانی کا انتظام کیا جائے.... ورنہ وہ جوانوں کو لے کر واپس چلے جائیں گے۔ میں نے اس بات کو ان کی ظرافت طبع پر محمول کیا اور مزید کمیونی کیشن مناسب نہ سمجھی۔

کپتان صاحب بھی ہم سے ایک میل ادھر ہی لنگر انداز ہو گئے۔ بظاہر ہمیں سزا دینے کا اس سے مناسب طریقہ اور نہ ہو سکتا تھا۔ اس لق و دق صحرا میں جہاں ہر جھاڑی کے پیچھے ایک رہزن چھپا بیٹھا تھا اور اردگرد حشرات الارض کی ایک فوج منڈلا رہی تھی' بغیر فوجی پہرے کے زمین پر سونا گویا موت کو دعوت دینے والی بات تھی اور یہ صورت حال خاصی تشویشناک بھی تھی لیکن جو چیز ساری زندگی ایک مقدس امانت کی طرح ہمارے خون میں سرایت کر گئی تھی' اس سے کیسے کنارہ کش ہوتے؟ چنانچہ ہر مصلحت کو عزت نفس پر قربان کیا اور ہم نے بھی ٹل خرمائی کے وسیع میدان میں زمین پر کھیس بچھائے اور سرہانے' ہاتھ دھر کر سوئے تو سورج نکلنے سے پہلے آنکھ نہ کھلی' آنکھ کھلی تو عجیب منظر تھا۔ تمام سکاؤٹس ہمارے اردگرد پھر رہے تھے۔ کچھ تو پانی بھر رہے تھے اور کچھ ایک بکرے کو ذبح کر کے کھال اتار رہے تھے۔ اتنے میں کپتان صاحب مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھے اور کہا۔ ''کیا ساری عمر سوتے رہو گے؟'' آؤ ناشتہ کریں۔ ''بسم اللہ'' اور ہاتھ دھو کر ہم دونوں ناشتہ کرنے لگے۔

میں اس انقلاب پر حیران تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہر چند کپتان صاحب نے جوانوں کو گدلا پانی پینے سے منع کر دیا تھا اور ڈسپلن کی وجہ سے جوانوں نے مشکیزوں پر سے ہاتھ اٹھا لیا تھا لیکن رات کو جب پیاس کے عفریت نے اپنے مہیب جبڑے کھولے اور جوانوں کے نرخروں سے پھٹے ہوئے ڈھول کی سی آوازیں آنے لگیں تو ایک نوجوان چپکے سے اٹھا' دبے پاؤں لکڑی کے ساتھ لٹکے ہوئے مشکیزے تک پہنچا اور مشک کا منہ کھول کر غٹاغٹ پانی پی گیا۔ دوسرے جوانوں نے جن کی پتھرائی ہوئی آنکھیں شاید کسی ایسی ہی آہٹ کی منتظر تھیں' یہ منظر دیکھا تو انہوں نے یکے بعد دیگرے پہلے جوان کی تقلید کی اور جب تمام پانی سپاہی پی چکے اور مشکیزے میں صرف گاد باقی رہ گئی تو اس فلک ناہنجار نے یہ منظر بھی اپنی مکروہ آنکھوں سے دیکھا کہ کپتان صاحب گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے مشکیزے تک پہنچے' ایک نظر جوانوں کو دیکھا جو بظاہر سو رہے تھے اور پھر مشکیزے میں منہ ڈال کر ''ڈیک'' لگا دی۔

بہر حال' اب غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کا دور گزر چکا تھا۔ کپتان صاحب اور میں اچھے دوست بن چکے تھے اور اس کا اثر جوانوں اور لیویز کے گنتی کے سپاہیوں پر بھی پڑ رہا تھا' اور اب ہمارے سامنے صرف ایک ہی دشمن تھا... سفر خان زرکزئی اور اس کے ساتھی

...جو نہ معلوم کس کمین گاہ میں چھپے ہوئے تھے۔ سراغیوں نے پھر رندات نکالنے کا کام شروع کیا جو محمد تاوہ کی طرف جاتے تھے۔ محمد تاوہ' خرمائی سے چند کوس کے فاصلے پر تھا اور ہمارا قافلہ تازہ دم ہو چکا تھا' چنانچہ ہم نے بوریا بستر سمیٹا اور محمد تاوہ کی طرف چل پڑے۔

ہم نہایت محتاط ہو کر چوری چھپے' نپے تلے قدم اٹھاتے محمد تاوہ کی طرف بڑھ رہے تھے... شہر سے باہر پہنچ کر ہم نے اپنی حکمت عملی کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ محمد تاوہ کی شہرت ہم سن چکے تھے۔ شہر میں سیدھا داخل ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ تمام شہر چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا' چنانچہ ہم نے تمام جوانوں کو تین ٹولیوں میں تقسیم کیا' پھر نہایت سرعت سے تمام اہم پہاڑوں پر قبضہ کر کے ''مارٹرز'' فٹ کر دیں۔ پیشتر اس کے کہ محمد تاوہ کے سرکش لوگ سنبھلتے وہ مکمل طور پر گھر چکے تھے اور ڈاکوؤں کے شہر سے نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے۔

شاید نادر شاہ کو دہلی میں داخل ہوتے وقت اتنی مسرت نہ ہوئی ہو گی جتنی ہمیں محمد تاوہ میں داخل ہوتے وقت ہوئی۔ تمام قصبہ حیران اور ڈری ڈری نظروں سے اس قہر خداوندی کو دیکھ رہا تھا جو ایک دم بلائے ناگہانی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ تمام علاقے میں پانی کا ایک ہی تالاب تھا جس میں قدرتی چشمے پھوٹتے تھے۔ ہم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ قصبے کے تمام مرد گھبرا کر باہر نکل آئے۔ میں نے سب کو چشمے کے پاس جمع کیا اور کپتان صاحب کو دعوت دی کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کریں۔ کپتان صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ میں ایک فوجی ہوں اور تقریر نہیں کرتا۔ تقریر کرنا سیاستدانوں یا پھر سول والوں کا کام ہے۔ ہمارا کام صرف ایکشن ہے۔ چنانچہ میں نے چبوترے پر چڑھ کر ایک مختصر سی تقریر جھاڑ دی اور ساتھ ہی انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنا اسلحہ ایک گھنٹے کے اندر اندر جمع کرا دیں۔

شام تک اسلحے کا انبار لگ گیا۔ اب بہار شاہ تحصیلدار نے تفتیش شروع کی۔ پتہ چلا کہ ڈاکوؤں کو ہماری آمد کا علم ہو گیا تھا اور ہمارے آنے سے چند گھنٹے قبل وہ گرد و نواح کے پہاڑوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ بہر حال' وہ لوگ جنہوں نے ان کی اعانت کی تھی یا انہیں پناہ دی تھی' دھر لیے گئے۔

ہمیں محمد تاوہ میں آئے ہوئے بیس یوم ہو گئے تھے۔ بہار شاہ کی تفتیش جاری تھی اور کمشنر صاحب کی طرف سے کوئی حکم نہ آیا تھا۔ اس دوران میں بڑے عجیب انکشافات ہوئے۔ حسن خان محمد زئی جو علاقے کا مانا ہوا سرکش تھا' ہماری آمد سے قبل پہاڑوں میں جا چھپا تھا۔ اس نے یہاں اپنا قانون رائج کر رکھا تھا۔ لوگوں سے ٹیکس وصول کرتا تھا جرمانے کرتا' سزائیں دیتا اور اپنی ہی ایک جیل بنا رکھی تھی جہاں ملزموں کو بوجہ عدم ادائیگی جرمانہ بند کر دیتا۔ مخبر نے اطلاع دی کہ اس نے اپنی خاندانی جیل میں دو عورتوں کو چار سال سے بطور یرغمال رکھا ہوا ہے' کیونکہ ان کا بھائی جرمانہ ادا نہ کر سکا تھا۔ میں نے حسن خاں کے داماد میر گہرام کو بلایا اور کہا کہ چند گھنٹوں کے

اندر اندر ہر دو عورتیں پیش کر دو' نہیں تو حسن خاں کے گھر کو مارٹرز سے اڑا دیا جائے گا... میر گہرام تو سر جھکا کر چلا گیا' لیکن تحصیلدار بہار شاہ پھٹ پڑا... "صاحب! آپ نے یہ کیا غضب کیا ہے؟ مینگلوں میں کسی یرغمالی کو واپس کرنا بہت بڑی بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ حسن خان ہرگز ان عورت کو واپس نہیں کرے گا اور اگر آپ نے کوئی راست اقدام کیا تو علاقے کے تمام مینگل بھڑوں کی طرح پہاڑوں سے نکل آئیں گے اور ہم پر حملہ کر دیں گے اور اس صورت میں ان گنتی کے چند سپاہیوں کے ساتھ مدافعت مشکل ہو جائے گی۔" میں نے کہا "بہار شاہ! بات یہ ہے کہ ہم یہاں پکنک پر نہیں آئے' اس سے بڑی بے غیرتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اتنی دور سے چل کر یہاں آئیں اور دو مظلوم اور بے گناہ عورتوں کو نجات نہ دلا سکیں۔ میں مینگلوں کے جذبہ حریت اور عزت نفس کی قدر کرتا ہوں' لیکن کوئی باضمیر مینگل حسن خاں کے اس اقدام کی تعریف نہیں کر سکتا اور اگر ہم خالی ہاتھ واپس چلے گئے تو پھر اس علاقے کے عوام کا اعتماد جو پہلے ہی مجروح ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حکومت سے اٹھ جائے گا۔ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کا کام صرف ہمت کرنا ہے۔" میں یہ کہہ کر کپتان صاحب کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہم نے شمالی پہاڑی کا معائنہ کیا جس کے بالکل نیچے حسن خان مینگل کا مکان تھا۔ ہم نے جوانوں کی مدد سے مارٹرز اور مشین گنیں پہاڑی پر رکھوائیں اور ان کا رخ اس کے گھر کی طرف کر دیا ... بہرحال مقابلے کی نوبت نہ آئی۔ میر گہرام خاں جو نہایت شریف النفس انسان تھا چند گھنٹوں کے اندر اندر ان دونوں عورتوں کو لے کر آ گیا۔

اسی طرح کے ایک اور واقعہ کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ایک عالی زئی نے ہمیں اطلاع دی کہ ہماری آمد سے قبل سفر خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ محمد تاوہ میں براجمان تھا اور عین ممکن تھا کہ بے خبری میں پکڑا جاتا اگر ایک رضا نامی گڈریا اسے بروقت خبردار نہ کرتا۔ ہم نے رضا کو گرفتار کر لیا۔ چونکہ وہ اقبال جرم سے مسلسل انکار کر رہا تھا' اس لیے میں نے بہار شاہ سے کہا کہ اس پر مزید دباؤ ڈالا جائے۔ بہار شاہ نے کہا اسے ایک رات جگائے رکھتے ہیں' شاید صبح کو نیند سے مغلوب ہو کر کچھ اگل دے۔" میں جلد سو گیا' صبح اٹھ کر میں نے بہار شاہ کو بلایا۔ "صاحب! بڑا سخت جان ہے۔ بھوک اور بے خوابی نے اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں کیا اور اقبال جرم کرنے یا کچھ بتانے سے ابھی تک گریز کر رہا ہے۔" میں اٹھ کر تفتیشی کمرے میں گیا تو اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ تمام رات سپاہیوں نے اسے ہاتھ کھڑے کرا کے جگایا تھا اور بندوق کے بٹ مار مار کر اس کا چہرہ سیاہ کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ اس قدر اکڑ گئے تھے کہ انہیں نیچے گرانا مشکل ہو گیا' میں نے سپاہیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر باہر بھیج دیا اور اسے چارپائی پر بٹھا کر بہار شاہ کی مدد سے کریدنا شروع کیا' لیکن وہ ہنوز ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ ترغیب و تحریص کے ہر دو حربے بھی ہم نے برت ڈالے' لیکن نتیجہ وہی ڈھاک

کے تین پات۔ جب سورج نصف النہار پر آن پہنچا تو ہم قطعی طور پر مایوس ہو چکے تھے۔ گرم گرم پراٹھے' نرم نرم مکھن' سنہری شہد' بھنی ہوئی کلیجیاں' کوئی چیز بھی تو اسے رام نہ کر سکی۔ میں بہار شاہ کو کہنے ہی والا تھا کہ اس دکان کو بڑھا دیا جائے کہ رضا نے جنون میں آ کر اپنے سر کو زور زور سے جھٹکنا شروع کر دیا۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ زبان میں لکنت آ گئی اور پاگلوں کی طرح ناس ... ناس پکارنے لگا۔ "یہ کیا کہتا ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "صاحب کام بن گیا ہے!" بہار شاہ خوش ہو کر بولا "اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ یہ نسوار مانگتا ہے..." اور اس طرح جو راز تمام رات کا رت جگا' مار دھاڑ اور لذیذ کھانے نہ اگلوا سکے تھے' چٹکی بھر نسوار نے منکشف کرا دیئے۔

چونکہ ہمیں لوگوں سے مل کر معلومات کرنا تھیں' اس لیے ہم نے گاؤں کے اندر ایک عالی زئی کے مکان میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر لیا۔ سکاؤٹس نے پہاڑوں پر اپنی چوکیاں بنالی تھیں۔ کپتان صاحب نے تالاب کے مشرقی جانب میدان میں خیمے گاڑ دیئے۔ اس کے علاوہ اچانک حملے کے امکان کے پیش نظر تین پٹرول پارٹیاں رات کو گشت کرتیں... ایک رات ہم گہری نیند سو رہے تھے کہ اچانک ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔ بھونچال سا آ گیا تھا۔ سکاؤٹس نے توپوں کے دہانے کھول دیئے تھے۔ چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ "ڈاکوؤں نے شبخون مارا ہے۔" عبدالکریم ساسولی کہنے لگا.. "صاحب میں نہ کہتا تھا کہ ان عورتوں کو واپس نہ منگوائیں' مینگل حملہ کر دیں گے۔" بہار شاہ کے لہجے میں سرزنش تھی۔ "کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ حملہ کس نے کیا ہے' کس طرف سے کیا ہے۔ گولیوں کے ساتھ روشنی کے گولے بھی مسلسل فضا میں اٹھ رہے تھے جن سے ملگجی اندھیرا دودھیا گیا تھا۔ ہم نے بندوقیں بھریں اور رینگتے ہوئے مکان کی بیرونی چار دیواری تک آ گئے۔ مکان کی چھتوں پر لیویز کے سپاہی پہلے ہی مورچہ بند تھے' اس لیے ہمیں پیچھے سے کسی اچانک حملے کا خطرہ نہ تھا۔ سب کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہم سانس روکے' بندوقوں کے ٹریگروں پر انگلیاں رکھے ان دیکھے دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ دشمن' سکاؤٹس سے براہ راست ٹکر لینے کی بجائے ترنوالے پر توجہ دے گا ... ایک گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی۔ کپتان صاحب سے ہمارا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ جب فائرنگ رکی تو پھر بھی ہم بطور حفظ ماتقدم اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔ جب صبح صادق کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے تو ہم رینگتے رینگتے تالاب تک پہنچے وہاں سے میدان صاف دیکھ کر جب ہم کپتان صاحب کے خیمے میں پہنچے تو وہ آرام سے کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ "کون تھے حملہ آور؟" میں نے پوچھا۔ "کون سا حملہ؟" کپتان صاحب مسکرائے۔ "ہم تو صرف ریہرسل کر رہے تھے... لوگ محاصرے سے تنگ آ چکے تھے۔ ایک دن میر مراد خان میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "صاحب! خدا کے لیے ان سپاہیوں کو لے جائیں۔ ہم لوگ بہت تنگ آ گئے

ہیں۔ ہماری عورتیں باہر نہیں نکل سکتیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب یہ قصبہ کسی مفرور کو پناہ نہیں دے گا۔ میر میراد خان' سردار نوروز خان کے گروہ سے تھا اور ایک لمبی قید کاٹ کر آیا تھا اور اب پر امن زندگی گزارنے کا خواہاں تھا۔

آخر ایک دن کمشنر صاحب کا وائرلس پر پیغام آیا کہ فوراً قلات پہنچو۔ میں چند سپاہیوں کو لے کر جب قلات پہنچا تو رات گیارہ بج رہے تھے۔ راجہ صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ جب میں اندر گیا تو راجہ صاحب نے آنکھ اٹھا کر میری بڑھی ہوئی داڑھی اور گرد آلود چہرے کا جائزہ لیا۔ کہنے لگے ''کہو کچھ مزاج درست ہوا ہے؟'' ''سر! ہمارا یا ڈاکوؤں کا؟'' راجہ صاحب نے پھر میری طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ میں نے انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ تیسرے دن میرے ساتھ جب تمام مقامی معتبرین نے آکر معذرت کر لی تو محاصرہ اٹھانے کا حکم صادر ہوا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' مستونگ کے معمولات تربت کے تجربات سے مختلف تھے۔ صبح کو اردلی کا آ کر جگانا تو محض بہانا ہوتا... اس کی آمد سے قبل ہی باد نسیم ہلکورے لیتی ہوئی آتی اور دل و دماغ معطر ہو جاتے۔ میں اٹھ کر ننگے پاؤں نصف گھنٹے تک مخملیں گھاس پر ٹہلتا... اس اثنا میں خوابیدہ کلیاں چٹک کر مخمور آنکھیں کھول لیتیں... شبنم ان کا منہ دھلاتی اور جب یہ بن سنور کر ترل ترل بہتے ہوئے پانی میں اپنا عکس دیکھتیں تو اپنے ہی حسن سے مسحور ہو کر ان پر وجد طاری ہو جاتا اور یہی وہ لمحہ ہوتا جب ان کے حسن کی امین بلبل باغ میں آ کر ان سے ہمکلام ہوتی... مسرت کے یہ لمحات کتنے مختصر ہوتے ہیں...؟ میں سوچتا... ابھی سورج کی پہلی کرن جب ان کے رخسار چومے گی تو یہ اپنی شاخوں سے ٹوٹ کر کسی کوٹ کے کالر کی زینت بن جائیں گی یا کسی شوخ و چنچل جوڑے میں گوندھ دی جائیں گی یا پھر کسی شب کو سیج پر مچلتے ہوئے جسموں تلے مسل دی جائیں گی۔

صبح نو بجے تک میں تیار ہو کر عدالت میں پہنچ جاتا۔ بارہ بجے تک مختلف مقدمات کی سماعت کرتا۔ دیوانی مقدمات کا طریقہ کار یہ تھا کہ دعویٰ اے سی کے کورٹ میں دائر کیا جاتا۔ اے سی فریقین کو طلب کر کے جواب دعویٰ کے بعد تنقیحات نکالتا اور پھر مثل بغرض سماعت قاضی صاحبان کے پاس بھیج دیتا جو شرعی فیصلہ صادر کرتے... انصاف کا یہ طریقہ کار نہ صرف سستا' سادہ اور سہل ہے' بلکہ رسم و رواج سے ہم آہنگ بھی ہے... فوجداری مقدمات کی نوعیت دیوانی مقدمات سے کچھ خاص مختلف نہ ہوتی ہر چند کہ طریقہ کار مختلف تھا۔ اکثر فوجداری مقدمے دیوانی دعوؤں کی پیداوار ہوتے ہیں' کیونکہ یہ ہمارے معاشرے کا خاصہ ہے کہ جو مسئلہ باتوں سے حل نہ ہو سکے' اسے لاتوں کے ذریعے نبٹایا جاتا ہے اور جب لات چلتی ہے تو اس کے لیے آنکھ' ناک' کان یا گردن کی تمیز بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے... وطن عزیز کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی ہر جھگڑا زر' زن اور زمین کی تکون کے کسی نہ کسی زاویے سے اٹھتا اور پھر

لاوے کی طرح پھیلتا ہی جاتا۔ لاوا تو گردش روزگار سے کبھی نہ کبھی اپنی حدت کھو بیٹھتا ہے' لیکن انتقام کی یہ آگ نار جہنم کی طرح کبھی سرد نہیں ہوتی۔ اس کی تپش سے بعض اوقات پورے قبیلے اور ان کی نسلیں تک جھلس جاتی ہیں... پتہ نہیں روئے زمین کا وہ کون سا خطہ ہے جہاں وجود زن سے کائنات کی رنگین تصویریں اتاری جاتی ہیں' کیونکہ ارض پاک میں اس کی برکت سے جو تصویر ابھرتی ہے' وہ خاصی سنگین ہوتی ہے۔ ایک اچھی تصویر کئی رنگوں کے حسین امتزاج سے تخلیق پاتی ہے۔ یہاں ہر تصویر میں صرف ایک ہی رنگ نمایاں ہوتا ہے جو خاصا گہرا سرخ ہوتا ہے۔ بلوچستان میں کوئی ایسی ہستی تو پیدا نہیں ہوئی جس کے لیے ہزار جہازوں کے بادبان بیک وقت کھول دیئے گئے ہوں' لیکن یہاں کی رزمیہ شاعری اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ مساۃ سمی اور گوہر کے لیے متحارب قبیلے سالہا سال تک ایک دوسرے کی گردنیں ناپتے رہے۔ میرے پاس اکثر ایسے مقدمات آئے جن میں وجہ عناد رقابت تھی' خاوند کو اپنی بیوی کے باکرہ ہونے میں شک تھا یا اس پر سیاہ کاری کا الزام تھا۔

حضرت آدم نے اگر زمین کی چاہت میں فردوس بریں سے فرار چاہا تھا تو ابن آدم نے بھی اس کار خیر میں خوب کل پرزے نکالے ہیں... ہر انسان اپنی استطاعت' استعداد اور فکر کے مطابق صید زبون شہریاری ہوتا ہے۔ اگر بعض لوگوں نے معبد فکر و فن' یونان سے ہندوستان تک پہنچتے پہنچتے راستے میں انسانی کھوپڑیوں کے محل تعمیر کر دیئے تھے تو یہاں ایک پگڈنڈی سے دوسری پگڈنڈی تک پہنچنے کے لیے کسی ایک آدھ سر کو دھڑ سے جدا کر دینا یقیناً کوئی اچنبھے والی بات نہیں۔

بات کچھ طوالت اختیار کر گئی ہے' مقصد مقدمات کی نوعیت اور ان کے محرکات سے قاری کو روشناس کرانا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم اس فعل کو ٹال نہیں سکتے جو اکثر ہم سے وقتی اشتعال میں سرزد ہو جاتا ہے۔ غصے میں سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور انسان بعض دفعہ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو بعد میں تمام عمر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔ بے شمار ایسے مجرم ہیں جنہیں اگر آپ ازسرنو زندگی گزارنے کا موقع دیں تو وہ یقیناً اپنی غلطی کا اعادہ نہیں کریں گے۔ بلوچ ذہنیت اس نفسیات سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں پچھتاوے کا عنصر یکسر مفقود ہے۔ اگر ایسی دس زندگیاں بھی عطا ہو جائیں تو یہ اپنے مسلک سے سرمو انحراف نہیں کریں گے... اور دسویں دفعہ بھی وہی کام کریں گے جو انہوں نے پہلی دفعہ کیا تھا۔

بارہ بجے کے بعد ہر شخص کو بلا روک ٹوک ملنے کی اجازت ہوتی۔ لوگ اپنی شکایات اور باہمی جھگڑوں کے تصفیے کے لیے آن پہنچتے۔ اکثر تنازعے پانی کی تقسیم' زمین' لین دین اور رشتوں ناتوں کے متعلق ہوتے... میری خواہش اور کوشش ہوتی کہ قانونی کارروائی کرنے کے بجائے افہام و تفہیم کے ذریعے تصفیہ کرا دیا جائے۔ اس سلسلے میں مقامی بلوچ سردار صاحبان بھی خاصے مدد

معاون ثابت ہوتے۔ دو بجے سے لے کر چار بجے تک کا وقت میں نے ملاحظہ موقع کے لیے رکھا ہوا تھا۔ چند معتبرین کو لے کر موقع کو دیکھتا۔ وہیں فریقین کے دلائل سنتا اور فیصلہ سنا دیتا۔ چونکہ یہ فیصلے ذاتی وابستگی اور تعصب سے ہٹ کر ہوتے' اس لیے عام طور پر قبول کر لیے جاتے۔ اگر اس پر بھی کسی فریق کی تشفی نہ ہوتی تو اسے مزید قانونی چارہ جوئی کا اختیار ہوتا۔ چار بجے میں واپس دفتر آ کر جب ڈاک دیکھتا تو اکا دکا مقامی سردار تشریف لے آتے اور ڈاک دیکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے گپ شپ بھی ہو جاتی۔ ایک سردار جو باقاعدگی کے ساتھ ہر روز چار بجے آن دھمکتا' وہ اللہ یار رستم زئی تھا۔ رستم زئی ضلع قلات کا ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے جس کے افراد کو ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اس اختصار کا اثر سردار کے نقش و نگار اور قد کاٹھ پر نمایاں طور پر پڑا ہے۔ سردار موصوف کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اپنے گاؤں کا وہ لڑاکا بیٹر یاد آیا جسے ایک مقامی ملک نے بھینس دے کر خریدا تھا اور رات کو وہ بدقسمتی سے پالتو بلی کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ جس طرح سنجیدہ سے سنجیدہ ڈرامے میں بھی مصنف کوئی ایک آدھ مزاحیہ خاکہ ضرور رکھتا ہے' اسی طرح شاید قدرت نے بلوچستان کے اعصاب شکن ماحول میں یہ سردار تفنن طبع کے لیے پیدا کر دیا ہے۔ اپنے قد کے برابر اونچی پگڑی باندھے' اپنے وزن جتنا عصا تھامے' لرزتے ہوئے سر اور لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ جب رستم زئی میرے کمرے میں داخل ہوتا تو میں گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو چائے لانے کے لیے کہتا' کیونکہ وہ وقت سردار صاحب کے ''دوائی'' کھانے کا ہوتا۔ افیون کے مسلسل استعمال نے اس کی گرتی ہوئی صحت اور ڈوبتی ہوئی حمیت پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ سر اور ہاتھوں پر ہر وقت رعشہ طاری رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ دو وقت کا بھوکا انسان دست طمع دراز کرنے سے گریز کرے' لیکن ایک وقت کے نشے سے ٹوٹا ہوا شخص ہر حرکت کر گزرتا ہے... بہرحال' رستم زئی خاصا دلچسپ آدمی تھا۔ اس سے خوب گپ شپ ہوتی۔ جس طرح افیونیوں کی عادت ہوتی ہے' ایک سے بڑھ کر ایک بڑ ہانکتا۔ ویسے بھی اگر نام کو اللہ یار سے نسبت ہو اور قبیلے کا رستم کا دم چھلا بھی لگا ہو تو اس قسم کی لن ترانیاں تعجب خیز نہیں ہوتیں۔ اللہ یار کو فکر فردا تھی اور نہ غم روزگار۔ حکومت کی طرف سے جو چند سو روپے وظیفہ ملتا اسی سے ''گلشن کا کاروبار'' چلاتا۔ خاندان کی کشتی موصوف نے ایک عرصے سے خدا کے آسرے پر چھوڑ رکھی تھی' لیکن ایک دن ترنگ میں آ کر اپنی کشتی کے لنگر بھی توڑ ڈالے۔ ایوب خان کے آخری دنوں میں جب ملک گیر ہڑتال شروع ہوئی تو بلوچستان میں طلبہ نے بھی اس تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا اور جب مستونگ میں چند طلبہ نے بھوک ہڑتال کر دی تو سردار صاحب نے جھٹ سے کمشنر صاحب کو ایک تار دے دیا کہ طلبہ کے مطالبات مانے جائیں' نہیں تو میرا قبیلہ بغاوت کر دے گا۔ قبیلے کو تو خیر کیا بغاوت کرنی تھی' البتہ اللہ یار کا مقدر اس سے باغی ہو گیا۔ جب کمشنر صاحب نے بیک جنبش قلم وظیفہ بند کر دیا تو اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دن کو بھی بعض اوقات تارے دکھائی دینے لگتے ہیں' اور اندھیرے کے لیے لازم نہیں ہے

کہ وہ سورج ڈوبنے کا انتظار کرے۔ جب بھوک نے اپنے کرشمے دکھانے شروع کئے تو اللہ یار کے لیے اپنی چھڑی اور پگڑی کا بوجھ اٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔ ہم سب نے مقدور بھر کوشش کی' لیکن راجہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اللہ یار نے معافی نامے کو آنسوؤں کے ہار میں پرو کر از خود پیش کیا' لیکن کمشنر صاحب نے اس کو بھی قبول نہ کیا... آخر ایک دن جب اس کی سانس اس کے نرخرے میں پھٹے ہوئے ڈھول کی طرح بجنے لگی تو ایک سردار نے کمشنر صاحب سے کہا "خدارا اس کا وظیفہ بحال کر دیں' نہیں تو قیامت کے دن آپ قتل عمد کے مرتکب پائے جائیں گے۔" راجہ صاحب مسکرا پڑے اور اس طرح ایک جاں بلب سردار کا وظیفہ بحال ہو گیا۔

پانچ بجے میں دفتر کا کام ختم کر کے لیویز پوسٹ کی پڑتال پر جاتا۔ ہر چند کہ کاغذات میں "لیویز" کو ایک منظم فورس دکھایا گیا ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ لیویز کے اکثر و بیشتر جوانوں نے زندگی میں شاید ہی کوئی گولی چلائی ہو۔ میں نے ایک جوان سے پوچھا۔ "تم نے آخری گولی کب چلائی تھی؟" کہنے لگا "جس دن میری منگنی ہوئی تھی' اس دن ایک گولی ہوا میں سر کی تھی"۔ "تمہاری شادی ہوئے کتنے برس ہو گئے ہیں؟" "پندرہ سال!" وہ معصومیت سے بولا... چونکہ مفروروں کے ساتھ جھڑپیں آئے روز کا معمول بن گئی تھیں' اس لیے ضروری تھا کہ فورس کی تنظیم نو کی جائے اور نئی چوکیاں قائم کی جائیں... اس سلسلے میں میں نے مقدور بھر کوشش کی۔ ہر سپاہی کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ وہ چاند ماری گراؤنڈ میں جا کر مہینے میں کم از کم پچاس راؤنڈ ضرور چلائے۔ ایک ریٹائرڈ فوجی کو صرف اس کام کے لیے بھرتی کیا گیا کہ وہ انہیں مکمل تربیت دے۔ سپاہیوں کی وردیاں بہار اور خزاں کا عجیب امتزاج تھیں۔ کسی نے گلرنگ قمیص کے نیچے سرمئی رنگ کا پاجامہ پہن رکھا ہے تو کسی کی خاکی پرتا کی نمایاں نظر آ رہی ہے۔ کسی نے سرکاری بیج کو ٹوپی پر لگا رکھا ہے تو کسی نے اسے صافے پر سجا رکھا ہے۔ کسی نے فلیٹ بوٹ پہن لیے ہیں تو کوئی اپنی ہوائی چپلوں پر اترا رہا ہے... ضروری تھا کہ اس رنگا رنگ پروگرام کو ختم کر کے ان کی وردی میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ میں نے کمشنر صاحب کی توجہ ان کی حالت زار کی طرف دلائی تو انہیں قدرے باوقار وردیاں نصیب ہوئیں۔ لیویز پوسٹ کی حیثیت کم و بیش تھانے جیسی ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں روایتی تھانیدار فضل کریم اور حکایتی حوالدار "نور دین" نہیں ہوتے جن کی تجربہ کار نگاہیں ہر شخص کے اندر چھپا ہوا مجرم فوراً تاڑ لیتی ہیں اور جن کی باوقار مونچھوں کی پرورش کے لیے سرکار نے باقاعدہ ماہانہ الاؤنس رکھا ہوا ہے... اور نہ ان کے پاس خالص سرسوں کے تیل میں پلے ہوئے تو چار کے "لتر" ہوتے ہیں جو مشتبہ کی چمڑی کے ساتھ ساتھ اس کی سانس بھی کھینچ لیتے ہیں۔

مستونگ کلب

سات بجے تک پڑتال ختم ہو جاتی تو باوجود شدید تھکن کے میرے قدم خود بخود کلب کی طرف اٹھ پڑتے... غالب نے اپنی

ایک دعوت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا گر برتن دیکھے جائیں تو یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے' لیکن کھانے پر نگاہ ڈالی جائے تو بایزید کا طعام نظر آتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی تفسیر مستونگ کلب کی بھی کی جا سکتی ہے۔ اگر غالب و میر کلب کی حوصلہ شکن عمارت دیکھ لیتے تو یقیناً انہیں اپنے بے جا گلوں شکووں کا احساس ہوتا۔ غالب نے ابر دو گھنٹے برسنے کی صورت میں چھت چار گھنٹے ٹپکنے کا رونا رویا تھا اور میر نے اپنے بوسیدہ مکان کی منڈیر پر بیٹھنے والے ہر کوے کو ہوا سمجھ لیا تھا۔ یہاں صورت حال یہ تھی کہ بارش کی چھوٹی سی یلغار کے ساتھ برسرپیکار ہونا چھت کے بس کا روگ نہ تھا۔ گردش روزگار نے بوسیدہ چھت کو اس قدر چھلنی کر دیا تھا کہ بارش کے قطرے بغیر کسی روک ٹوک کے ٹپک پڑتے اور بالفرض اگر کہیں چھت ان سے ٹکر لینے کی جرات کر ہی بیٹھتی تو اگلے موسم برسات تک ٹپکتی ہی رہتی۔ باقی رہا سوال کوؤں کا' تو وہ لکھنو کے کوؤں کی طرح اتنے کم عقل نہیں تھے کہ پھلدار درختوں کو چھوڑ کر بوسیدہ اور لرزیدہ دیواروں کو اپنا مسکن بناتے۔ ایک ویران ٹیلے پر واقع اس سنسان عمارت کی تاریخ پر وقت کی گرد پڑی ہوئی ہے' لیکن ایک نیم مورخ کی نیم تحقیق کے مطابق انگریزوں نے اسے اپنے گھوڑوں کے لیے تعمیر کیا تھا۔ بیرونی دیوار پر خالص مٹی کا لیپ کیا گیا تھا اور بیرونی دروازے کی ضرورت غالباً اس لیے محسوس نہیں کی گئی تھی کہ سردی سے ٹھٹھرے ہوئے کسی آوارہ کتے کو اگر پناہ کا مسئلہ درپیش ہو تو کلب کے کسی کونے کھدرے میں آرام کر سکے... دیمک خوردہ دیواروں کا رنگ غالباً اس وقت اڑا تھا جب انسان نے پہلی مرتبہ فضا میں پرواز کی تھی.... لیکن کلب کے داخلی ماحول پر اس کی ہیئت کذائی کا سایہ تک نہ پڑا تھا۔ یہاں ایک ایسی چھوٹی سی' پیاری سی دنیا آباد تھی جس کی یاد آج بھی لوح ذہن پر نقش ہے۔

میرے استاد کامل رشید صاحب جنہوں نے مجھے نہ صرف قانون کی ابجد سکھائی' بلکہ ایک متوازن زندگی گزارنے کے فن سے بھی روشناس کرایا... ہر وقت دھیمی سی مسکراہٹ لیے ہوئے منور چہرہ' ہر لحظہ سوچتی ہوئی آنکھیں' ہر وقت دست شفقت کھلا ہوا' اخلاق اور مروت کی زندہ تصویر' عزم و ہمت کے بدر منیر' صاف دل و روشن ضمیر' رشید صاحب نہ صرف اپنی ذات میں ایک انجمن تھے بلکہ ان کے دم سے بھی ایک انجمن آباد تھی۔ اینٹ گارے' پتھر اور چونے سے دنیائیں آباد نہیں ہوتیں۔

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یہ کام اہل بصیرت کا ہے جن کے فیضان نظر سے زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ رشید صاحب قلات ڈویژن کے سیشن جج تھے اور تھوڑی دیر کے لیے کلب ضرور آتے... ان کی آمد سے محفل کشت زعفران بن جاتی۔ فلسفے سے لے کر فلم تک کوئی ایسا موضوع نہ ہوتا جس پر خیال آرائی نہ کی جاتی۔ چائے کے دور چلتے۔ رشید صاحب عشاء کی نماز کلب ہی میں پڑھتے اور پھر واپس گھر چلے جاتے

...ان کے جاتے ہی خوب دھما چوکڑی مچتی اور اب یہ دور کلب کے ایک اور ممبر میاں حمید کا ہوتا۔ میاں صاحب کلب کی روح رواں تھے۔ میاں حمید محکمہ آبپاشی میں ایگزیکٹو انجینئر تھے۔ بلوچستان کے خشک پہاڑوں سے پانی لے آنا تو غالباً میاں صاحب کے بس کا روگ نہ تھا' لیکن خشک اور روکھے چہروں پر ہنسی بکھیر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ خیر سے شادی شدہ تھے' لیکن انہوں نے اس سانحے کو کبھی پاؤں کی بیڑی نہ بننے دیا۔ کہنے لگے۔

میں نے پہلے دن ہی بیوی کو بتا دیا تھا کہ شراب میں نہیں پیتا' سگریٹوں سے مجھے نفرت ہے' راگ رنگ اور اس سے متعلق دوسری لغویات سے میں پرہیز کرتا ہوں۔ صرف ایک چھوٹی سی' بے ضرر سی' عادت پال رکھی ہے اور وہ یہ کہ رات کو ذرا دیر سے کلب سے لوٹتا ہوں'' میاں صاحب اچھا انجینئر ہونے کے باوجود قدرتی رکاوٹوں کی وجہ سے بنجر زمینوں کو آباد تو نہ کر سکے تھے لیکن ازدواجی میدان میں آٹھ سال کے قلیل عرصے میں انہوں نے جو معرکے مارے' ان سے محمود غزنوی کا ریکارڈ ٹوٹتا ہوا نظر آتا۔ ان کے بچوں کی ایک فوج ظفر موج تھی جو ہر ملاقاتی کو ناکوں چنے چبوا دیتی۔ اگر ایک بچہ بیرونی دروازے کی منڈیر پر اذان دے رہا ہے تو دوسرا طفل خوش نہاد جیپ کے بونٹ پر بیٹھا ہوا کچے پکے راگوں پر مشق آزمائی کر رہا ہے۔ کوئی گاڑی کے ہارن سے چمٹا ہوا ہے تو کوئی ملاقاتی کی گردن سے لپٹا ہوا ہے... میاں صاحب برج کے رسیا تھے۔ انہوں نے بڑے انہماک سے باقی ممبروں کو بھی اس کھیل سے روشناس کرایا' یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ممبر حضرات ہمیشہ اس دن کو کوستے رہے جب انہوں نے یہ نامراد کھیل سیکھا تھا۔ ایک دن ملتان کے ایک بیرسٹر زمان صاحب اپنی بیگم کو ملنے مستونگ آئے۔ ان کی بیگم محکمہ تعلیم میں انسپکٹرس آف سکولز تھیں۔ کلب آ کر انہوں نے پہلے تو تحقیر سے اس بوسیدہ عمارت کو دیکھا' پھر فخر سے لندن کے نائٹ کلبوں اور لنکنز ان کی شاموں کا ذکر کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں برج کا ذکر آ گیا تو پوچھنے لگے۔ ''کیا آپ میں سے کوئی برج کھیل سکتا ہے؟'' ان کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے کوئی شیر کا شکاری کسی اناڑی سے پوچھے میاں تم بندوق چلانا جانتے ہو؟ ہم سب نے حمید کی طرف دیکھا۔ حمید کہنے لگا۔ ''تھوڑی بہت شد بد تو ہے!'' ''تو پھر ہو جائے ایک سیشن'' بیرسٹر صاحب خوش ہو کر بولے۔ تھوڑی دیر تو وہ ہم سب کو کھیل کے بنیادی اصول سمجھاتے رہے' پھر جو کھیل شروع ہوا تو انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ جس استخوانی ہاتھ میں انہوں نے پنجہ ڈالا ہے' اس کی گرفت مکینکی انداز میں سخت ہو رہی ہے۔ پہلے دن کے کھیل کو انہوں نے قسمت پر محمول کیا لیکن جب اگلے ایک ہفتے تک یکطرفہ ٹریفک چلتی رہی تو ہتھیار پھینک دیئے۔ ایک دن سر شام جب وہ آئے تو میاں صاحب خوش ہو کر بولے۔ ''زمان صاحب! کوئی ایسی جگہ بچ گئی ہے جہاں پر آپ کا کٹ نہ لگا ہو؟'' میاں صاحب کو جنون کی حد تک برج سے لگاؤ تھا۔ اکثر رات کے دو تین بج جاتے لیکن ان کی آتش شوق سرد نہ ہوتی۔ ایک دن ایک دوست

نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''یار! تم جو اتنی دیر سے گھر جاتے ہو تو کیا تمہاری بیگم سے لڑائی نہیں ہوتی؟'' ''بالکل نہیں!'' حمید پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''لڑائی تو اس وقت ہوتی ہے جب آدمی تیر کا جواب تفنگ سے دے۔ جس طرح تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی' اسی طرح لڑائی بھی یکطرفہ نہیں ہو سکتی۔ میں بیوی کی باتوں کا جواب ہی نہیں دیتا۔ چپ کر کے سو جاتا ہوں۔'' ... حمید کی اس عادت کے باوجود بیگم صاحبہ اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ایک دن کوئٹہ سے چند مہمان آ گئے۔ اتفاقاً دوسرے دن چھٹی تھی' اس لیے حمید نے سب احباب کو کھانے اور برج کی دعوت دے ڈالی۔ کھانے کے بعد جب برج شروع ہوئی' کھیل میں وقت کا احساس نہ رہا۔ رات کے دو بجے کے قریب ہم نے دیکھا کہ ایک شخص بستر اٹھائے کلب چلا آ رہا ہے' حمید اپنے نوکر کو پہچانتے ہوئے بولا' ''کیا بات ہے بستر کیوں لائے ہو؟'' صاحب جی! بیگم صاحبہ نے بھجوایا ہے۔ کہتی تھیں کہ گھر آنے میں شاید آپ کو تکلیف ہو' اس لیے بستر بھجوا رہی ہوں۔'' اس پر احباب کا ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن حمید بظاہر اس تمام کارروائی سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ''تھری نو ٹرمپ''۔ حمید اچھا پلیئر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا ماہر نفسیات بھی تھا۔ مخالف فریق کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے میں اسے پورا ملکہ حاصل تھا۔ رشید صاحب سے پہلے خان شفیق خاں سیشن جج تھے جو اچھے کھلاڑی ہونے کے باوجود مات کھا جاتے۔ کھیل کے دوران یہ کوئی ایک آدھ لقمہ دے جاتا۔ خان صاحب! گرینڈ سلیم بنانا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے' مزہ تو جب ہے کہ انسان پوائنٹس پر گیم بنا کر اپنی مہارت کا سکہ جمائے۔ اس قسم کی باتیں سن کر خان صاحب جذباتی اشتعال کے ساتھ کھیلتے اور ہارتے۔ اسی طرح شکیل صاحب ہمارے کلب کے بڑے سرگرم ممبر تھے۔ بنک منیجر تھے اور اہل زبان تھے۔ میاں باتوں باتوں میں انہیں بھی طیش دلا دیتا۔ کھیل سے پہلے ہی ان کی زبان چلنا شروع ہو جاتی۔ ''بھیا! یہ کھیل مرچیں پھانکنے والوں کا نہیں ہے۔ یہ بہادر پنجابیوں کی گیم ہے۔'' بس یہ ایک مصرع شکیل صاحب کی جولانی طبع کے لیے کافی ہوتا۔ ''پنجابی تو ڈھگے ہوتے ہیں۔'' شکیل صاحب بھڑک اٹھتے اور پھر خار کھا کر جو ''اوور بڈنگ'' کرتے تو اٹھتے اٹھتے پڑا ہو جاتا۔

حمید کی شخصیت کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ رات کا رنگیلا حمید سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ایک سنجیدہ اور باوقار انسان نظر آتا۔ دفتر میں وقت کی پابندی نہ صرف خود کرتا بلکہ ماتحت عملے سے بھی کرواتا۔ تمام وقت نہایت تندہی اور تجسس کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہتا۔ اپنے کام میں جتا دیکھ کر اکثر میرے ذہن میں زیدی کا یہ شعر ابھرتا۔

یہ انہماک قیادت میں بھی نہیں ملتا
یہ سوئے نفس عبادت میں بھی نہیں ملتا

کتاب یاد کے ورق الٹتا ہوں تو ایک اور چہرہ افق ذہن پر ابھرتا ہے... بندہ صد صفات' رونق شش جہات' یاروں کا یار' مخلص و خوددار' نیم رند نیم ولی اختیار اللہ ملہی... ملہی سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں مستونگ میں پہلی دفعہ بندوبست کی ٹریننگ لینے آیا۔ ملک غلام مصطفیٰ بھی میرے ساتھ تھے۔ مستونگ میں ان دنوں سکونت کا بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں مستقل سکونت نہ رکھی جا سکتی تھی' کیونکہ گرمی میں آئے دن سرکاری افسروں کے قافلے اترتے رہتے۔ جب میدانوں میں جسموں کو جھلس دینے والی لو چلنا شروع ہوتی تو حکام پر دوروں کے دورے پڑنا شروع ہو جاتے۔ ''ہم خرما و ہم ثواب'' خرمے تو سرکاری خرچ پر پہاڑی سیر و سیاحت کے مزے لے کر کھائے جاتے اور ثواب دارین اخباروں میں خوش نما تصویروں اور دلربا خبروں کی صورت میں حاصل ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ مستونگ سے آگے سنگلاخ راہوں پر چلنا تضیع اوقات سمجھا جاتا۔ ہاں' تو بات ملہی کی ہو رہی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں پر محکمہ شاہرات کا ایک نہایت اچھا افسر تعینات ہے اسے ملنے سے سکونت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ''کوشش کر دیکھتے ہیں'' ملک صاحب کہنے لگے اور جب ہم شاہرات کے دفتر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ کئی مست ہاتھی ایک ساتھ چنگھاڑ رہے ہوں... ایک بھاری بھرکم' گہرے سانولے رنگ کا آدمی جوتی ہاتھ میں پکڑے ایک لحیم شحیم شخص کی مرمت کر رہا ہے' پوچھنے پر پتہ چلا کہ جوتی ملہی صاحب کی ہے اور جھٹکے ٹھیکیدار کو لگ رہے ہیں... جوتی کے ہر وار کے ساتھ موصوف کے منہ سے خالص پنجابی گالیوں کی ایک زوردار بوچھاڑ سی نکلتی۔ ''ہم کہاں آ گئے ہیں؟'' میں نے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ ''اگر یہاں اچھائی کا یہ معیار ہے تو برے آدمی کیسے ہوں گے؟'' تھوڑی دیر بعد لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ ٹھیکیدار دم دبا کر بھاگ گیا۔ لیکن ماحول پر کشیدگی طاری تھی۔ ہر شخص چپ تھا۔ ہم اٹھ کر واپس جانے والے تھے کہ ملہی کی نگاہ ہم پر پڑی.. ''فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ملہی کے لہجے میں معذرت تھی.. ''پہلے آپ اپنا موڈ تو ٹھیک کر لیں۔'' ملک صاحب نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ ناخوشگوار منظر دیکھنا پڑا' لیکن اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کسی شریف آدمی کو تو یہ ٹھیکیدار دو دن بھی ٹکنے نہیں دیتے۔ لاتوں کے بھوت بھلا باتوں سے کہاں مانتے ہیں!'' ملہی کے چہرے پر بشاشت لوٹ آئی تھی' چونکہ ماحول میں تلخی قریباً ختم ہو چکی تھی اس لیے ملک صاحب نے میرا اور اپنا تعارف کرایا اور پھر اپنی آمد کی وجہ بتائی۔ ملہی ہاتھ ملانے کی بجائے اٹھ کر ہم سے گلے ملا اور کہنے لگا۔ ''میرا گھر ریسٹ ہاؤس یا کوئی بھی ہاؤس جہاں آپ ٹھہرنا چاہیں' حاضر ہے اور جب تک آپ کا مستونگ میں قیام ہے' آپ میرے مہمان ہیں۔'' یہ تھی ملہی سے میری ملاقات... جوں جوں دن گزرتے گئے ملہی کی شخصیت نکھرتی گئی۔ ہر وقت خوش رہنا' ہر غم کو ہنس کر سہنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ کسی دوست سے تلخ چھوڑ اونچی بات کرنا بھی گناہ کبیرہ سمجھتا۔ احباب کو ذرا سی بھی تکلیف میں

دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے۔ دشمنوں کے لیے بھی اس کا غصہ چڑھتی ہوئی برساتی ندی کی طرح تھا' ایک ریلا آیا اور گزر گیا۔

ملی مجموعہ اضداد تھا۔ اگر مذہب کی دھن سر میں سما گئی تو مسجد ہی کو گھر سمجھ لیا۔ تسبیح ہاتھ میں پکڑے' کھدر کی ٹوپی سر پہ رکھے' بغیر کچھ کھائے پیے دن رات عبادت میں مشغول ہے۔ ہر ملاقاتی کو تزکیہ نفس کی تلقین ہو رہی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا پر درد الفاظ میں نقشہ کھینچ رہا ہے۔ مذہبی کتابوں اور تفسیر کی دن رات ورق گردانی ہو رہی ہے۔ نالہ نیم شب اور آہ سحر گاہی کی زندہ تفسیر بن گیا ہے ...اور اگر بیٹھے بیٹھے عبادت سے جی اکتا گیا تو سیدھا کلب کا رخ کیا۔ تاش سے جو چمٹا تو دن رات کی تمیز ختم کر ڈالی۔ نماز سے جو بھٹکا تو ہر وقت ایک ہی مصرع کا ورد کیا۔

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

صنم کی تلاش میں نکلے تو کوئے یار میں جا کر ہی دم لیا۔ ملی یہ تمام باتیں کسی دکھاوے کے لیے نہیں کرتا تھا۔ یہ احساس و ادراک کی کشمکش تھی جو کبھی اسے مسجد کی طرف لے جاتی' کبھی مندر کی طرف کھینچتی۔ چونکہ منافقت سے یہ کوسوں دور تھا' اس لیے اہل ظاہر سے ہمیشہ اس کی ان بن رہی۔ بحیثیت ایک دوست ملی کی یاد اس دل میں ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔

کلب میں گو ممبروں کی تعداد بہت محدود تھی' لیکن ہر فرد ایک روشن چراغ تھا جس کی چمک سے اس دل کا گوشہ تاریک منور رہتا۔ ان محدود صفحات میں فرداً فرداً ہر دوست کا تذکرہ ممکن نہیں' لیکن یادوں کے چراغ جب جلتے ہیں تو ایک اور چہرہ آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے۔ پیکر مہر و وفا' ہیکل صدق و صفا' وہ میرا یار جانی' ساجد گیلانی' ساجد مستونگ میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر تھے۔ گو ان کا مستونگ میں قیام بہت مختصر تھا' لیکن نقش بہت گہرے چھوڑے۔ ان کے خلوص کی حدت مستونگ کی جمی ہوئی برف تک کو پگھلا سکتی تھی۔ ان کے خیال کی وسعت چلتن پہاڑ کی چوٹیوں تک جا پہنچتی اور ان کے ذہن کی ندرت' ندی کے اس شفاف پانی کی طرح تھی جس میں انسان اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ ساجد علم دوست ہی نہ تھے' سخن شناس بھی تھے۔ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ہر چند کہ ان کے مکھڑے پر کوئی کالا کالا تل نہیں تھا لیکن جہاں کہیں بھی جاتے' خلق خدا کا دل موہ لیتے۔

اس کے علاوہ دیکھنے میں مجسم جمال' طبعاً سراسر جلال' خوش خصال' غلام محمد تاج تھے جن کی خوابیدہ آنکھیں نرگس کی اور شگفتہ مسکراہٹ ہمیشہ گلاب کے پھولوں کی یاد دلاتی۔

اور شبیر کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کو بھلا کون بھول سکتا ہے جن کا چٹخارہ آج بھی زبان پر موجود ہے؟ حقوق اللہ کے

متعلق تو کچھ وثوق سے کہا نہیں جا سکتا' لیکن حقوق العباد کے معاملے میں شبیر خاصے محتاط تھے اور حقوق العباد کا ہر راستہ بھی صرف ایک ہی سمت کو جاتا۔ پتہ نہیں یہ "پردوں کے لیکچر" کا اثر تھا یا شبیر کا احساس فرض کہ کلب میں ان کی آمد ان کے جانے کی تمہید بنتی۔ مضطرب نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اٹھتیں۔ گھر جلد لوٹنے کے نئے نئے بہانے تراشے جاتے۔ کبھی ناسازی طبع کی شکایت' کبھی کام کی زیادتی کی حکایت' کبھی مہمانوں کی آمد کا عذر لنگ' لیکن ہم ان کی باتیں ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے نکال باہر کرتے۔ ایک تو کلب میں ممبروں کی کمی کا مستقل مسئلہ' پھر شبیر کی شیریں باتیں۔ ان کے گرد احباب کا گھیرا تنگ ہونا شروع ہو جاتا اور اس طرح انہیں بادل نخواستہ بیٹھنا پڑتا' لیکن جب گھڑی کی سوئی دس کے ہندسے کو چھوتی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا... طبیعت میں ایک ابال سا اٹھتا۔ سیمابیت سے انگ انگ تھرکتا اور ایک لمبی جست لگا کر یہ ہر رکاوٹ کو پھلانگ جاتے۔

کلب کے دیگر دو ممبران کا ذکر نہ کرنا یقیناً مروت سے بے وفائی ہوگی' کیونکہ ہر دو کا تعلق اس دور سے تھا جب اس کلب کی بنیادیں رکھی گئیں۔ جعفری صاحب اور میر صاحب۔ جعفری صاحب غالباً لکھنوء کی پیداوار تھے اور میر صاحب کا خمیر مستونگ کی مٹی سے اٹھا تھا' لیکن دونوں میں واثق دوستی تھی۔ میر صاحب ریٹائرڈ مجسٹریٹ تھے اور جعفری صاحب بظاہر ویسے ہی عملی زندگی سے ریٹائر نظر آتے تھے۔ میر صاحب کا درمیانہ قد اور رنگت سرخ و سپید تھی۔ صاف ستھرا لباس پہنتے۔ اس کے برعکس جعفری صاحب پر علمیت کی چھاپ نمایاں نظر آتی۔ ہر انٹلیکچویل کی طرح بجھتی ہوئی رنگت' الجھی ہوئی زلفیں' دھنسی آنکھوں کے گرد سیاہ ہالے اور سر کے بال خودرو جھاڑیوں کی طرح خشک اور بڑھے ہوئے۔ ان کے بال دیکھ کر ہر لمحہ یہ گمان ہوتا کہ ابھی یہ سر کو جھٹکیں گے تو کوئی پرندہ پھر سے بالوں کے گھونسلے سے اڑ جائے گا۔ بایں ہمہ ان کی طبیعت بڑی حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ دونوں کے مزاج میں دھیما پن تھا' اطوار میں شائستگی اور گفتگو میں وقار تھا۔ گرمی ہو یا سردی' آندھی آئے یا برسات' ٹھیک سات بجے شام یہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کلب پہنچ جاتے اور شطرنج کھیلتے۔ اس وقت ان کا انداز گفتگو اور انہماک دیدنی ہوتا۔ یوں لگتا جیسے دو نامی گرامی پہلوان اکھاڑے میں اترے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو چت کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت ذرا سی مداخلت بھی انہیں ناگوار گزرتی۔ تھوڑے سے شور پر بھی یہ سیخ پا ہو جاتے۔ میر صاحب کی رنگت کی سرخی ان کے کانوں تک آ پہنچتی۔ جعفری صاحب اپنی شیروانی کے بٹن بار بار کھولتے اور بند کرتے۔ یہ محسوس ہوتا جیسے دوستی اور رسم اخلاص انہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ "شطرنج کھیلنے کے لیے خاصی عقل چاہیے۔" جعفری صاحب فیلے کو آگے بڑھاتے ہوئے میر صاحب پر وار کرتے۔ "میں نے آپ کی طرح یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں۔" میر صاحب ترکی بہ ترکی جواب دیتے اور آخر جب ایک فریق ہار جاتا تو دوسرا چوتھی جماعت کے بچے

کی طرح خوشی سے تالیاں پیٹتا اور ہارنے والا کچھ اس قسم کا تاثر دیتا جیسے شطرنج نہیں زندگی کی بازی ہار بیٹھا ہو۔ لیکن یہ کیفیت دیرپا نہ ہوتی۔ ادھر شطرنج کی بساط الٹتی اور ادھر پھر سے ہر دو یار گھل مل جاتے۔

کلب کے نگران اعلیٰ راجہ احمد خان کمشنر قلات تھے۔ ہر چند کہ راجہ صاحب کی کلب میں آمد نہ آنے کے برابر تھی' لیکن ان کا ذکر ضروری ہے۔

کہتے ہیں کہ سچائی اگر کوئی مجسم شکل اختیار کرتی تو شیر کی صورت میں آتی۔ اسی طرح فی زمانہ خلوص' محنت' ہمت اور ایثار کو اگر انسانی قالب میں ڈھالنے کے لیے انسانوں کی فہرست بنتی تو راجہ صاحب کا نام سرفہرست ہوتا۔ راجہ صاحب نے عمر عزیز کا وہ حصہ بلوچستان کی نذر کیا ہے جسے اہل نظر "جوانی گو زندگانی گزشت" کہتے ہیں... شاعرانہ تعلّی سے قطع نظر خلوص اور ایثار کے راستے چمنستان سے نہیں گزرتے' ہزار خار مغیلاں قدم قدم پر دامن تھامتے ہیں۔ ایک لمحے کا خلوص بھی عبادت شمار ہوتا ہے۔ تیس سال کا عرصہ بذات خود ایک زندگی ہوتا ہے اور خلوص کے یہ لمحات اگر ان تمام سہ وسال پر محیط ہوں تو حاصل زندگی ہوتے ہیں... جب نئے بلوچستان کے وسائل اور مسائل کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس مختصر تاریخ کے ہر موڑ پر ایک چہرہ ضرور ابھرے گا اور وہ راجہ احمد خان کا ہوگا۔

راجہ صاحب نے قلات سے اپنی سروس کا آغاز اس وقت کیا جب ایک بلوچ کی دنیا پانی کی چھاگل اور ستو کی پوٹلی تک محدود تھی اور تمام ماحول سیاست کی آلودگی اور بیرونی گٹھ جوڑ سے پاک تھا۔ سادہ لوح بلوچ کے ذہن میں ابھی تک یہ بات نہیں بٹھائی گئی تھی کہ بلوچ مسلمان اور غیر بلوچ مسلمان کوئی الگ تھلگ مخلوقات ہیں۔

ایک ایسے شخص کے لیے جس نے پنجاب کے زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی ہو' ناز و نعم اور آرام و آسائش کی فضا میں پروان چڑھا ہو' ملک کی بہترین درگاہ میں تعلیم حاصل کی ہو اور جسے "فارن سروس" تک کی پیشکش کی گئی ہو' ان لق و دق صحراؤں اور سنگلاخ چٹانوں میں مستقل طور پر ڈیرے ڈالنا اور پھر مظلوم عوام کے مسائل اور مصائب کو اپنے دل کے کانوں سے سننا ایک تاریخی کارنامہ ہے... ویسے تو وطن عزیز میں مہم جوؤں کی کمی نہیں ہے لیکن یہاں پر ہر مہم کا آغاز کسی نہ کسی رنگ میں جاندار پبلسٹی سے ہوا کرتا ہے۔ مصائب کو آسائشوں کے پلڑے میں تولا جاتا ہے۔

"ہزار مصلحتوں کا شمار کرتے ہیں... تب ایک زخم جگر اختیار کرتے ہیں۔"

کتنے سر پھرے ہیں جنہیں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلے کی پروا۔

یہ غالباً ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔ ہم مکران میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔ خبر آئی کہ کمشنر قلات ڈویژن کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اس کی

جگہ راجہ احمد خاں کو تعینات کیا گیا ہے۔ یہ ایسی خبر نہ تھی جس پر کوئی تبصرہ کیا جاتا۔ ملک صاحب اور میں نے ایک کان سے سنی اور دوسرے کان سے اڑا دی' لیکن دوسرے دن جب دفتر گئے تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ کوئی ایسی غیر اہم خبر بھی نہ تھی... ''راجہ احمد خان واپس آ گیا ہے۔'' میر کمال خاں سپرنٹنڈنٹ نے نوید مسرت دی۔ ''صاحب کیا آپ کو پتہ ہے راجہ صاحب ہمارے کمشنر ہو گئے ہیں؟'' ایک کلرک نے خوش سے جھومتے ہوئے' ہمیں خوشخبری سنائی... راجہ احمد خان واپس آ گیا ہے... شام تک ہر شخص کی زبان پر ایک ہی ورد تھا۔ امید وبیم سے لوگوں کے چہرے جگمگا رہے تھے... ''کیا یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں؟'' میں نے ملک صاحب سے پوچھا۔ ''آخر راجہ احمد خان ہی واپس آیا ہے' عرش کا کوئی کنگرہ ٹوٹ کر نیچے نہیں آن گرا۔''

چند ماہ بعد میں بلوچی زبان کا امتحان دینے خضدار گیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی اپنی روایتی شدت برقرار رکھے ہوئے تھی ... امتحان سے فارغ ہوا تو سوچا کہ لگے ہاتھوں راجہ صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے۔ آخر میں بھی دیکھوں ان کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں.... جب میں پی اے کے کمرے میں پہنچا اور اپنا تعارف کرایا تو اس نے کچھ ایسی نظروں سے میرا استقبال کیا کہ مجھے باہر پڑتی ہوئی سردی بھی ہیچ نظر آئی.... چونکہ حالات کی گرمی سردی برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا' اس لیے میں نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہ کیا اور ملاقات کے لیے چٹ اندر بھجوا دی... غالباً میں کرسی پر ٹھیک طرح سے بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ چپڑاسی نے آ کر اطلاع دی کہ راجہ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ اب اسے خدا لگتی کہیے کہ طلبی کے اس فوری پروانے پر مجھے بڑی مایوسی ہوئی .... ''کیا افسر ایسے ہوتے ہیں؟'' میں نے سوچا۔ آخر اس دنیا میں افسریت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ انگریز بہادر اتنا پاگل تو نہیں تھا کہ رکھ رکھاؤ کو ہر شے پر فوقیت دیتا تھا۔ افسری نہ ہوئی مذاق ہو گیا۔ جھٹ سے چٹ ملی اور کھٹ سے اندر بلوا لیا... کوئی دو چار گھنٹے باہر سردی میں انتظار کرایا ہوتا' پھر چپڑاسی کے ہاتھ وہی پیغام بھجوایا ہوتا'' صاحب مصروف ہیں' پھر کسی دن حاضر ہو جائیں۔'' تو ہمارے کلیجے میں بھی ٹھنڈک پڑتی۔ صاحب کی عظمت کے معترف ہو کر کاسہ گدائی سمیٹتے اور دعائیں دیتے ہوئے اپنی راہ لیتے.... لیکن اب چونکہ پھنس گئے تھے اس لیے اپنی ناراضی کو پی اے صاحب کے حوالے کرتے ہوئے میں نے چق اٹھائی اور کمرے میں داخل ہو گیا ... لیکن مایوسی ایک بار پھر دامنگیر ہوئی... قرائن' شواہد' کوائف کوئی بھی تو ایسی چیز نہ تھی جس کی رو سے یہ فرض کر لیا جاتا کہ میں کسی افسر سے مل رہا ہوں.... نہ پائپ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی معنبر خوشبو نہ اپنے حالیہ دورہ انگلستان کے دوران بنوایا ہوا لونج سوٹ' نہ اٹلی سے خریدے ہوئے نرم بوٹ' نہ کمرے کا ٹمپریچر کنٹرول کرنے کے لیے کوئی ہیٹنگ سسٹم.... گندمی رنگ کے کھدر کا کرتہ شلوار' ٹائر سول کی چپل اور بند گلے والی واسکٹ سردی سے بچنے کا بہانہ بنی ہوئی تھی۔ سوچتی ہوئی آنکھیں عینک کے پیچھے چمک رہی تھیں۔

ہونٹوں پر جمی ہوئی خشکی' محنت اور سخت کوشی کی نشاندہی کر رہی تھی۔ ''السلام علیکم'' میں ان کے انہماک میں مخل ہوا۔ راجہ صاحب نے اپنی بوجھل پلکیں اوپر اٹھائیں۔ میری طرف غور سے دیکھا اور دوسرے لمحے وہ کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کر رہے تھے۔ یہ راجہ صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ جب میں کمرے سے باہر آیا تو میرے ذہن میں ایک ہی تاثر تھا.... حسرت ملاقات۔

اللہ تعالیٰ نے یہ حسرت بھی جلد پوری کر دی۔ تھوڑے عرصے بعد میری تعیناتی مستونگ ہو گئی۔ سارے قلات میں مستونگ سب ڈویژن اس لحاظ سے اہم ہے کہ علاقائی سیاست کے سوتے اسی جگہ سے پھوٹتے ہیں.... باہر سے دورے پر آنے والے سیاستدانوں اور افسروں کے لیے بھی یہ خوبصورت قصبہ آخری پڑاؤ ہوتا تھا' کیونکہ اس کے آگے بے آب و گیاہ پہاڑوں میں سفر کرنا تضیع اوقات سمجھا جاتا۔ اس سلسلے میں کمشنر صاحب کو بھی اکثر انتظامات کے لیے آنا پڑتا تھا اور اس طرح ملاقات کی صورت نکل آتی ... ہر چند کہ راجہ صاحب کی آمد ایک لحاظ سے تکلیف دہ ہوتی لیکن پھر بھی شوق اور تجسس رہتا۔ خضدار سے مستونگ کا راستہ کوئی چار گھنٹے کا تھا' لیکن بعض اوقات انہیں مستونگ پہنچتے پہنچتے دس بارہ گھنٹے لگ جاتے۔ ڈرائیور کو ہر پانچ دس میل پر گاڑی روکنا پڑتی ... محکمہ شاہرات کی زیر تعمیر سڑکوں کا معائنہ ہو رہا ہے.... محکمہ جنگلات کے کارندوں کو خدا خوفی کی تلقین کی جا رہی ہے۔ زراعت والوں کو ماڈل فارم بنانے کے اصول سمجھائے جا رہے ہیں۔ سکولوں کی پڑتال ہو رہی ہے۔ خداوندان مکتب کو ان کے فرائض منصبی کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ تھانوں کا معائنہ ہو رہا ہے۔ پولیس والوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ احتساب کے عمل کا دائرہ دوسری دنیا تک پھیلا ہوا ہے.... الغرض' حکومت کا کوئی ایسا محکمہ نہ تھا جس کی کارکردگی راجہ صاحب کی دوررس نگاہوں سے چھپی ہوئی ہو۔ ''ڈی او'' بھیجے جا رہے ہیں' افسروں کو بلا کر سرزنش کی جا رہی ہے.... ایک دفعہ ایک دوست نے راجہ صاحب سے ہنس کر پوچھا تھا۔ ''کیا آپ بیسویں صدی کے فرہاد بننا چاہتے ہیں جو ان پتھروں سے ٹکرا رہے ہیں؟'' راجہ صاحب نے اسے ہنسے بغیر جواب دیا تھا ''میری نظر میں فرہاد کسی شخص کا نام نہیں ہے' بلکہ یہ اس عزم کی علامت ہے جو تیشے کی صورت میں سنگ گراں سے آ ٹکراتا ہے۔'' موصوف کو اس مہم جوئی کا بعض اوقات سخت خمیازہ بھگتنا پڑتا' لیکن ہر دفعہ ''رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت'' کے مصداق زیادہ چاق و چوبند نظر آتے۔

ایک دفعہ تو ایسی صورت حال درپیش آئی کی ہم سب سمجھ بیٹھے کہ ''سر آمد روزگارے ایں فقیرے۔'' ہوا یوں کہ راجہ صاحب چند احباب کے ساتھ پنج پائی کے دورے پر گئے۔ دوست تو شکار کھیل کر واپس کوئٹہ چلے گئے لیکن آپ حسب معمول کام میں جتے رہے۔ جب سائے ڈھلنے لگے تو آنجناب نے واپسی کا ارادہ کیا اور چلتے چلتے فون پر مستونگ اطلاع بھی دے دی' چونکہ شام ہو چکی تھی اور کسی پڑتال کا امکان بھی نہیں تھا' اس لیے قیاس تھا کہ ڈیڑھ گھنٹے تک واپس مستونگ پہنچ جائیں گے... لیکن جب رات نے برف پوش

گھاٹیوں سے اتر کر اپنا دامن پھیلایا تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ کچھ دیر بعد یخ بستہ ہواؤں نے چنگھاڑنا شروع کر دیا تو تشویش میں اور بھی اضافہ ہوا... میں آتش دان کے قریب بیٹھا حسب معمول اپنے آپ میں غرق تھا' مجھے اطلاع ملی کہ راجہ صاحب گم ہیں۔ میں نے فوراً جیپ نکلوائی اور تحصیلدار کو لے کر جب شاہی باغ پہنچا تو ہر شخص پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راجہ صاحب کدھر غائب ہو گئے ہیں۔ ان کے کوئٹہ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ اس دن کوئٹہ سے چند مہمان مستونگ آئے ہوئے تھے... ویسے بھی ایسا زاہد خشک جس نے مسجد ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہو' کسی کلب میں جا کر کیا لیتا؟ اب صرف دو امکانات تھے جو یکے بعد دیگرے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ اولاً شیخ واصل کی قریبی پہاڑیوں میں ان کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے یا پھر ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں جوان کو زندہ یا مردہ اٹھا لے گئے ہیں... اب مزید قیاس آرائی بیکار تھی۔ لیویز کے سپاہیوں کو لے کر جب میں شیخ واصل پہنچا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سردار فقیر عمر کو گھر سے اٹھایا۔ گاؤں سے تیس کے قریب پختہ کار آدمی اکٹھے کیے اور ایک بجے کے قریب ہم نے تلاش شروع کی۔ حادثے کی صورت میں اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گاڑی بے قابو ہو کر لڑھکتی ہوئی کسی نشیبی ڈھلان میں جا گری ہو اور اس طرح سڑک پر چلتی ہوئی ٹریفک کو اس کا علم نہ ہو سکا ہو... کوئی ایسا موڑ نہ تھا جو ہم نے اچھی طرح نہ دیکھا ہو... کوئی ایسی کھائی نہ تھی جو ہم نے دیکھ بھال نہ ڈالی ہو۔ کوئی ایسی چوٹی نہ تھی جس پر ہم نے راہوار نگاہ نہ دوڑایا ہو... آخر تھک ہار کر ہم واپس پہنچے۔ سردی تھی کہ نقطہ انجماد کو بھی منجمد کیے دیتی تھی' اس پر نکیلی ہوا دو آتشہ ہو رہی تھی۔ قدم اٹھتے کہیں تھے اور پڑتے کہیں تھے۔ سینے کی دھونکنی سے نکلتی ہوئی ہر سانس دشمن رقیب بنی ہوئی تھی۔ چونکہ درینگڑ میں کوئی باقاعدہ ٹیلیفون سسٹم نہیں ہے' اس لیے مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ مستونگ سے رابطہ کس طرح قائم کیا جائے۔ تین بجے رات بڑی مشکل سے لائن مین کو تلاش کر کے اٹھایا۔ اس نے ٹیلیفون کے کھمبے کے ساتھ تاریں جوڑ دیں تو میں نے ڈی سی صاحب سے بات کی۔ ڈی سی نے جب بتایا کہ راجہ صاحب مستونگ نہیں پہنچے تو تشویش یقین کی شکل اختیار کر گئیں... مزید تلاش کی گنجائش نہ تھی۔ واپسی کا یارا نہ تھا... اس سردی میں باہر کھڑے رہنا اب سخت جان بلوچوں کو بھی گراں گزر رہا تھا کہ دفعتاً فقیر عمر نے مشورہ دیا کہ لگے ہاتھوں مشرقی میدان کو بھی دیکھ لیا جائے' کیونکہ کسی زمانے میں ایک کچا راستہ وہاں سے بھی مستونگ کو جاتا تھا... ڈوبتے کو تنکے کا سہارا' ہم نے ٹارچیں اٹھائیں اور بھاگم بھاگ میدان کی طرف چل دیئے... سڑک کے دائیں ہاتھ خود رو جھاڑیاں تھیں اور کہیں کہیں زمین کے دھبے دکھائی دیتے تھے۔ بعض جھاڑیاں دبی دبی سی نظر آتی تھیں جس سے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ کوئی وزنی چیز ان پر سے گزری ہے... جب اور آگے بڑھے تو سراغیوں نے ایک ٹوٹی ہوئی سڑک تلاش کر لی جس پر جیپ کے ٹائروں کے تازہ نشان لگے ہوئے تھے... اب ہم نے تقریباً

دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ جب تین میل کے فاصلے پر پہنچے تو آگ کا بڑا سا الاؤ نظر آیا۔ نزدیک جا کر دیکھا تو ایک مقامی نالے میں جیپ پھنسی ہوئی تھی اور راجہ صاحب کا ڈرائیور اور گارڈ ایک جھونپڑے کے ساتھ آگ کا الاؤ دہکائے دبکے بیٹھے تھے...... انہوں نے بتایا کہ چونکہ محکمہ "شاہرات" نے کاغذات میں اس پگڈنڈی کو سڑک دکھایا تھا' اس لیے راجہ صاحب نے کہا کہ لگے ہاتھوں اس کا معائنہ کرتے جائیں۔ لیکن موقع پر جا کر دیکھا تو سڑک ندارد.... راجہ صاحب کے متعلق پتہ چلا کہ وہ پیدل ہی مستونگ روانہ ہو گئے ہیں۔ میں نے فقیر عمر سے پوچھا کہ مستونگ یہاں سے کتنی دور ہے؟ تو اس نے ہاتھ کی انگلیوں پر گنتے ہوئے بتایا۔ "سائیں کوئی سولہ میل کے لگ بھگ ہوگا۔"

جب ہم واپس مستونگ پہنچے تو سورج نکل آیا تھا۔ تھکن اور نیند کے گٹھ جوڑ سے تمام اعضاء شل ہو گئے تھے۔ سوچا گھر جانے سے پہلے راجہ صاحب کی خیریت ہی پوچھتے چلیں' شاید کسی ڈاکٹر کو بلانے کی نوبت آ پہنچی ہو.... لیکن شاہی باغ میں سراسیمگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ جب میں نے سنتری سے پوچھا کہ کمشنر صاحب کی کیا کیفیت ہے تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "دفتر میں بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ آپ خود جا کر دریافت کر لیں!" اب میں دفتر جا کر کیا دریافت کرتا؟ میری اپنی حالت پتلی ہو رہی تھی چنانچہ الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

راجہ صاحب کے لیے اس قسم کے حادثات کوئی نئی بات نہ تھے۔ جتنی دیر میں بادنسیم سیر چمن کرتی ہے' راجہ صاحب اپنے طوفانی دوروں میں قلات کے ایک سرے سے دوسرے کونے تک نکل جاتے۔ بلوچستان' خاص کر قلات ڈویژن کی کوئی ایسی سڑک' سکول' عمارت' فیکٹری' ہسپتال' جنگل' کاریز نہیں جس کی تعمیر میں راجہ صاحب کی محنت کی خوشبو نہ آتی ہو... جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بسمیہ اور ناگ کے درمیان دو دشوار گزار پہاڑوں کو ایک نہایت مشکل راستے کے ذریعے منسلک کیا گیا ہے' یہ منصوبہ راجہ صاحب کے ذہن کی پیداوار تھا اور انہوں نے اپنی ذاتی نگرانی میں اسے مکمل کرایا۔ خضدار جیسے دور دراز علاقے میں "آئی کیمپ" لگوایا جہاں ملک کے نامور ڈاکٹروں نے نابینا لوگوں کے کامیاب آپریشن کیے۔ تعمیرات کے سلسلے میں راجہ صاحب کا علم ایک اچھے خاصے انجینئر سے کہیں زیادہ ہے... اس کا جیتا جاگتا ثبوت خضدار سے شہداد کوٹ تک بنائی ہوئی وہ شاہراہ ہے جس کے منصوبے کو محکمہ شاہرات والے ناقابل عمل قرار دے چکے تھے۔ راجہ صاحب نے اس کام کو مکمل کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور نہایت قلیل رقم میں دشوار گزار اور عمودی پہاڑوں کے سینے میں چھید ڈالتے ہوئے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ جنوں کی کرشمہ سازی تھی کیونکہ اہل خرد صرف محو تماشائے لب بام تھے۔

راجہ صاحب کے بات کرنے کا ایک اچھوتا انداز ہے... نہایت جچے تلے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ ہر لفظ سامع کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں اترتا ہوا محسوس ہوگا.... اس لطیف انداز گفتگو میں آپ کو ہر لحظہ خلوص کی چاشنی نظر آئے گی' بات سمجھانے یا اپنی ناپسندیدگی کے اظہار میں بھی ایک خاص ندرت نظر آئے گی اس کا تجربہ ایک دفعہ مجھے بھی ہوا۔ راجہ صاحب سرکاری ٹیوب ویلوں کا معائنہ کرنے گئے' غالباً سردار بہادر خان بنگلزئی اور اس کے قبیلے کے لوگوں کو ٹیوب ویل لگانے میں چند مشکلات پیش آرہی تھیں' واپسی پر چونکہ سائے ڈھل آئے تھے' اس لیے سردار دینار خان کرد مصر ہوا کہ چائے اس کے گاؤں میں پی جائے' راجہ صاحب نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ جب ہم چائے پی کر اٹھے تو کسی آدمی نے غلطی سے میرے بوٹ اٹھا کر راجہ صاحب کے آگے رکھ دیئے۔ راجہ صاحب نے اپنی چپل اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "بھائی میں غریب آدمی ہوں' اتنے قیمتی بوٹ نہیں پہن سکتا۔" عاقل را اشارہ کافی است۔ میں نے اسی دن مستونگ جا کر بوٹوں کو پاؤں بدر کیا اور بازار جا کر ایک جوڑا چپل خرید لایا... اس طرح نواب عبدالقادر شہوانی جب مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا تو سیدھا راجہ صاحب کے پاس پہنچا اور اپنا سرداری کا استعفیٰ جیب سے نکال کر راجہ صاحب کی میز پر رکھ دیا اور اپنے دستبردار ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے میرے متعلق حتی المقدور شعلہ نوائی کی۔ راجہ صاحب نے بڑے تحمل اور سکون کے ساتھ اس کی ایک گھنٹے تک باتیں سنیں اور پھر ایک ہی جواب دیا۔ "آپ پھر سوچ لیں' استعفیٰ کوئی ایسی چیز نہیں جو کل نہ دیا جا سکے"۔... "دیوانہ بکار خویش ہشیار" نواب ممدوح نے صرف اس ایک سطر ہی سے غزل کا مفہوم پڑھ لیا اور وہ کل پھر کبھی نہ آئی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد راجہ صاحب ایک دن خوشگوار موڈ میں تھے۔ شام کو مجھے دفتر بلوا لیا.... پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے' پھر کہنے لگے۔ "شاہ صاحب! ہم پرانے وقتوں کے آدمی ہیں۔ اگر کوئی آدمی اونچی نیچی بات کرلے تو خاموشی سے سن لیتے ہیں لیکن آج کل کے نوجوان افسر ذرا ذرا سی بات کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور لوگوں کو ڈانٹ دیتے ہیں' تحمل اور قوت برداشت ایسی نعمتیں ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے ہر انسان کو کوشش کرنی چاہیے۔"

اس قوت برداشت کا عملی مظاہرہ میں نے اس وقت دیکھا جب ایوب خان مرحوم کے خلاف ملک گیر ایجی ٹیشن شروع ہو چکی تھی اور اس کے اثرات بلوچستان پر بھی مرتب ہو رہے تھے... طلبہ اپنے تعلیمی اداروں کو خیر باد کہہ کر بازاروں میں نکل آئے تھے.... ہر روز کوئی جلسہ ہوتا' جلوس نکلتے اور مظاہرین "حاکمان وقت" کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے گلی کوچوں کا طواف کرتے۔ جگہ جگہ قراردادیں پاس ہوتیں' "پنجابیو! نکل جاؤ... ون یونٹ توڑ دو وغیرہ"

جیسا کہ ہر ڈرامے میں ہوتا ہے' ایکٹر کوئی اور ہوتا ہے' ڈائریکٹر کوئی اور۔ اس تحریک کے پس پردہ بھی کوئی اور ہاتھ تھا' کوئی اور ذہن تھا' کچھ اور مقاصد تھے۔ ہر چند کہ شکاری پرانے تھے' لیکن جال نہ صرف نیا تھا بلکہ باہر سے تازہ تازہ درآمد ہوا تھا۔ بلوچستان میں مخصوص مفادات کے حامل کچھ لوگوں کا ایسا گروہ تھا جو تعمیر کا دشمن تھا۔ اس گروہ کی سوچ کا ہر زاویہ ان کی بقا کا راز مضمر تھا۔ ایک سادہ لوح بلوچ کو صرف یہی سمجھایا جاتا کہ اس کا استحصال ہو رہا ہے... ''سڑکیں تعمیر ہو رہی ہیں... یہ بھی ایک طرح کا استحصال ہے ...لوگوں کو بتایا جاتا... کیونکہ اس طرح سرکاری موٹریں تمہارے گاؤں تک پہنچ کر تمہیں گرفتار کر لیں گی... سکول بن رہے ہیں ...اس پر بھی احتجاج ہو رہا ہے' کیونکہ یہ لادینی تعلیم پھیلانے کا ذریعہ ہیں۔

ہاں' تو تحریک زوروں پر تھی۔ جلوس بازاروں کا چکر کاٹتا ہوا عدالتوں کے باہر آ کر رک جاتا۔ اب ہڑتالیوں کی فرمائش ہوتی کہ میں خود باہر آ کر ان سے خطاب کروں۔ چنانچہ ہر روز مجھے کوئی نہ کوئی تقریر کرنا پڑتی۔ حسب معمول نعرے بازی ہوتی... اور اب راجہ صاحب بھی اس کی زد میں تھے۔ یار لوگوں نے انہیں ''لارنس آف بلوچستان'' کا خطاب دے ڈالا۔ اس سب وشتم کے باوجود' راجہ صاحب نے یہ احکامات جاری کر رکھے تھے کہ کسی صورت میں بھی انتظامیہ طاقت کا استعمال نہیں کرے گی... ہر مسئلہ صرف گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے ذریعہ حل کیا جائے گا۔ انہی دنوں ایک نئی افتاد آن پڑی... دس بلوچ لڑکوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اس ناٹک کے لیے انہوں نے نہایت موزوں جگہ کا انتخاب کیا اور وہ پلیٹ فارم اتفاقاً میری عدالت کا برآمدہ تھا۔ چونکہ میں اصل کھیل سے واقف تھا' اس لیے احتیاطاً میں نے پہلے دن ہی تمام ہڑتالیوں کا وزن کرا کے ایک چارٹ بنوالیا اور اسے کیلنڈر کی طرح اپنے دفتر کی عقبی دیوار پر لٹکا دیا۔ اگر ماسٹر تارا سنگھ ان طفلان خوش نہاد سے مشورہ کر کے مرن برت رکھتا تو اس وہ ذلت نہ اٹھانی پڑتی اور نہ وہ اس صورت حال سے دوچار ہوتا جو مرن برت توڑنے سے پیدا ہوئی' کیونکہ انہوں نے سوائے روٹی کے ہر چیز کھانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جوس پیا جا رہا ہے' گلوکوز کے جام لنڈھائے جا رہے ہیں' سیبوں پر دانت تیز ہو رہے ہیں' میلے کا سا سماں ہوتا۔ یہ آپس میں خوش گپیوں میں مصروف رہتے' لیکن جونہی کسی بلوچ لیڈر کی آمد کا سگنل ملتا تو گردنیں ڈھلکا کر لیٹ جاتے۔ ان کے حواری ''مر گئے! مر گئے!!'' کا ورد شروع کر دیتے۔ تمام فضا سوگوار ہو جاتی۔ بعض رقیق القلب انسان رونا شروع کر دیتے۔ مخیر حضرات روپے پیسے کی بارش شروع کر دیتے۔ مقامی اخباروں کے فوٹو گرافر اپنے شماروں کے لیے ان کے فوٹو اتارتے۔ لیڈر صاحبان ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالتے۔ پرنس کریم' نواب خیر بخش مری' میر گل خان نصیر' محمد حسین عنقا اور ان کے چیلے چانٹے صبح وشام ان کو دیکھنے آتے اور ازراہ ترحم جاتے جاتے مجھے بھی ملاقات سے نوازتے۔ ایک دن پرنس کریم کہنے لگا۔ ''ناظم صاحب! ہمارے بچے بھوک سے مر جائیں گے۔

دس دن ہو گئے ہیں ایک کھیل بھی اڑ کر ان کے منہ میں نہیں گئی... کچھ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حالات کوئی خطرناک صورت اختیار کر لیں۔" پرنس کریم تازہ تازہ جیل سے رہا ہو کر آیا تھا اور ایک دفعہ پھر لیڈری کی دکان چمکانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "جہاں تک بھوک سے مرنے کا تعلق ہے' آپ تسلی رکھیں۔ یہ نوبت سو سال تک بھی نہیں آئے گی۔ میں نے دیوار سے چارٹ اتار کر انہیں دکھایا (ہر ہڑتالی کا پانچ سے لے کر دس پونڈ تک وزن بڑھ گیا تھا)... جہاں تک حالات کے بے قابو ہونے کا تعلق ہے... میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس کی آپ پر بھی اتنی ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جتنی آپ انتظامیہ پر ڈال رہے ہیں۔ باقی رہی بات کچھ کرنے کی' تو آپ ہی بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" کہنے لگے۔ "کمشنر صاحب کو کہیں کہ وہ خود چل کر یہاں آئیں اور بچوں کے مطالبات مانیں اور ان سے برت توڑنے کی استدعا کریں۔" میں شہزادہ صاحب کی حکمت عملی سمجھ رہا تھا... خان قلات کے برادر خورد نے غریبوں کی ہمدردی کا جو لبادہ اوڑھا تھا' اس کی ہر تار پر ظلم و ستم کی ایک داستان رقم تھی۔ آپ نے ریاست کے زمانے میں تشدد کے جو انوکھے طریقے ایجاد کئے تھے' ان کے چرچے آج بھی بڑے بوڑھوں سے سنے جا سکتے ہیں۔ پھر بچوں کے مطالبات کیا تھے؟... "ون یونٹ توڑ دو... ایوب خان! اقتدار چھوڑ دو... وغیرہ۔" ظاہر ہے راجہ صاحب کوئی مطالبہ بھی نہیں مان سکتے تھے... مقصد صرف انہیں بلا کر ان کی توہین کرنا تھا کیونکہ راجہ صاحب ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ کوئی شخص غیر بلوچ ہو کر بلوچوں میں پرستش کی حد تک مقبول ہو' یہ بھلا انہیں کب گوارا تھا... راجہ صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ تنہا لڑکوں کے پاس نہ جائیں کیونکہ اس مطالبے کے پس پردہ شرارتی ذہن کام کر رہا ہے' لیکن راجہ صاحب مصر تھے کہ وہ ہر صورت میں لڑکوں کے پاس جائیں گے۔ کہنے لگے۔ "یہ بچے مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں۔ اگر میری بے عزتی کر کے انہیں تسکین مل سکتی ہے تو مجھے یہ بھی گوارا ہے..." جس وقت راجہ صاحب میرے دفتر میں داخل ہوئے تو یہ بلوچ لیڈروں' طالب علموں اور دیگر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ راجہ صاحب کی آمد سے چند منٹ قبل ہی پرنس کریم نے دودھ سے بھرے ہوئے گلاس اٹھائے اور ہڑتالی طالب علموں کو دے دیئے جنہوں نے ایک ہی ڈیک میں گلاس خالی کر دیئے۔ جب راجہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو کوئی شخص بھی تعظیماً اپنی جگہ سے نہ اٹھا اور نہ کسی نے ان کے سلام کا جواب ہی دیا... اب مطالبات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا... تعصبات کی دھجیاں اڑنا شروع ہوئیں۔ لیکن مجال ہے کہ راجہ صاحب کی جبیں پر بل بھی آیا ہو... نہایت خندہ پیشانی سے ہر بات سنی اور جواب دیتے رہے۔

راجہ صاحب اور ان کے برادر بزرگوار میجر اللہ داد خان (جو قلات کے کمشنر رہ چکے ہیں) کی طبیعتوں میں بعد المشرقین ہے... میجر اللہ داد بڑے گھن گرج والے افسر تھے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی لیکن اس کے برعکس راجہ صاحب

اپنے اندر سمندر کی سی گہرائی رکھتے ہیں۔ حالات کے ہر تیر کو سینے پر جھیلیں گے لیکن مجال ہے جو اف تک کر جائیں۔ پاس ادب کا یہ عالم ہے کہ میجر صاحب کی موجودگی میں سگریٹ تک نہیں پیا.... ایک دفعہ بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ میجر اللہ داد ان دنوں کراچی میں مقیم تھے۔ جانے ان کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ مارچ میں شکار کا پروگرام بنا ڈالا اور راجہ صاحب کو فون پر اطلاع دے دی کہ وہ احباب کے ساتھ فلاں تاریخ کو قلات آ رہے ہیں۔ اب راجہ صاحب سے زیادہ ان کی طبیعت کا کون شناسا ہوگا۔ مجھے بلا کر کہا کہ شکار کا موسم قریب قریب گزر گیا ہے' لیکن میجر صاحب نے اب شکار کا پروگرام بنا ڈالا ہے۔ مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں روکتا۔ اب اگر کچھ کر سکتے ہو تو کرو نہیں تو ان کی عادت ہے کہ بھری مجلس میں بے عزتی کر دیتے ہیں۔

ہر چند کہ انہیں شکار کرانے میں اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لایا' لیکن راجہ اللہ داد خان نے شکار کا جو معیار مقرر کر رکھا تھا' اس پر مارچ کا ڈوبتا ہوا موسم پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ کوئٹہ کے سرکٹ ہاؤس میں جب تمام لوگ جمع تھے تو میجر صاحب اپنے غصے کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ کہنے لگے۔ ''احمد خاں! میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں آ کر چند مہینے قیام کرنا پڑے گا تا کہ کم از کم تم لوگ شکار کے آداب تو سیکھ سکو۔'' راجہ صاحب کو جانے کیا سوجھی۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شکار کا منتظم یہ تھا۔'' بس پھر کیا تھا۔ اب میں میجر صاحب کی قہر آلود نظروں کی زد میں تھا.... ''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' وہ غصے سے دھاڑے۔ غالباً وہ میرے علاقے کی نسبت سے مجھ پر وار کرنا چاہتے تھے.. ''تلہ گنگ میں پیدا ہوا تھا' لیکن اب جہاں جاتا ہوں اسی جگہ کو ہی وطن سمجھ لیتا ہوں۔'' میں نے تحمل سے جواب دیا۔ میجر صاحب نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا' پھر ایک لمحے کے لیے انہوں نے آنکھوں کو موندا۔ غالباً کوئی خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کے ذہن میں لہرایا تھا.. ''کیا تلہ گنگ کے رہنے والے ہو؟'' میجر صاحب جیسے اپنے آپ سے بول رہے تھے۔ ''کیا تم سید حبیب شاہ کو جانتے ہو؟'' میجر صاحب نے متحیر لہجے میں پوچھا ... ''جی ہاں! وہ میرے دادا تھے۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ سننا تھا کہ میجر صاحب کا غصہ کافور ہو گیا۔ چہرے پر پرانی بشاشت عود کر آئی... ہنس کر کہنے لگے'' اوئے احمد خاں ایہ تے ساڈے پیر نیں۔'' (احمد خاں یہ تو ہمارے پیر ہیں)

خوش رہو اہل چمن

وقت بیت گیا۔ تین سال کا عرصہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ حکم حاکم آ پہنچا ہے۔ تلخیاں' ناکامیاں' حسرتیں' امنگیں' امیدیں' خوشیاں گڈمڈ ہو کر ایک نقطے پر سمٹ آئی ہیں اور وہ نقطہ آہستہ آہستہ آنکھوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ناگوار چاند' سوگوار چاندنی' اشکبار آنکھیں' دل فگار خامشی۔ کیا یہ سفر کے آغاز کا انجام ہے یا انجام کا آغاز؟ یہ کیسا اتفاق ہے کہ سوچ کا قافلہ اسی مقام پر آن کھڑا ہوا ہے

جہاں سے یہ چلا تھا۔ گھنٹیوں کی صدا آنی بند ہوگئی ہے' دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوتی ہے' احساس کی آگ کا الاؤ پھر سے دہک اٹھا ہے' شعلوں کی تیز روشنی میں کچھ بجھے بجھے چہرے نظر آ رہے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں جن کی آنکھیں اشکبار ہیں؟ ان کے چہروں سے یہ حزن وملال کیوں ٹپک رہا ہے؟ میں کیا دیکھ رہا ہوں' میں صرف دیکھ سکتا ہوں بول نہیں سکتا۔ میرے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت ہے۔ فرط جذبات سے زبان گنگ ہوگئی ہے۔

''مبارک ہو! اب تو خوش ہونا! گھر واپس جا رہے ہو۔''

''کیسی خوشی' کس چیز کی مبارکباد؟ کیا اینٹ' چونے اور گارے کی آمیزش سے گھر بنتے ہیں؟ جو عمارت دل کے اندر بن گئی ہے' خون میں رچ بس گئی ہے' اسے کیا نام دو گے؟''

''بڑی خوشی کی بات ہے' اپنوں سے جا ملو گے!''

''اپنوں کی کیا پہچان ہے؟ یہ بات تم نہیں سمجھ پاؤ گے... فلسفہ' قانون' منطق' ادب کوئی بھی شہ پارہ اس حقیقت کی وضاحت نہیں کر پائے گا۔ کیا وہ ایک آنسو جو کسی دیدہ تر سے نکل کر پیوند خاک ہوگیا ہے' تمہارا اپنا نہیں؟ کیا حزن وملال کی اس لہر سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں جو تمہارے لیے ایک غریب چہرے پر پھر ابھر آئی ہے۔ کیا تم شبنم کے اس پہلے قطرے کو بھول جاؤ گے جس نے تمہارے جلتے ہوئے زخموں پر پھاہا سا رکھ دیا تھا؟ باد نسیم کے ان ہلکوروں کو فراموش کر سکو گے جو ہر صبح تمہارے دل ودماغ کے ہر دروازے پر دستک دیتے تھے؟

''ذرا بتاؤ تو سہی' اس باپ کا حقیقی بیٹے سے کیا رشتہ تھا جسے صرف تخت کی خاطر تمام عمر قید تنہائی میں رکھا گیا۔ اس بھائی کو بھائی سے کیا نسبت تھی جو حصول مملکت کے لیے تختہ دار پر چڑھایا گیا؟ صدیوں سے بنے ہوئے روایات کے یہ جال کب ٹوٹیں گے؟ کب تک نفرت کے اس جہنم میں انسان جلتے رہیں گے؟ کیا تم اس حقیقت سے آشنا ہو کہ محبت کا ایک لمحہ نفرت کی تمام عمر پر بھاری ہوتا ہے؟''

الوداع! اے سرزمین بلوچستان الوداع!

